جامعہ

جامعہ ملّیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

جامعہ

سالانہ قیمت
بارہ روپے

قیمت فی شمارہ
ڈیڑھ روپے

جلد ۸۳	بابت ماہ جنوری ۱۹۸۶ء	شمارہ ۱

فہرست مضامین

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

مدیر معاون

عبداللطیف اعظمی

خط وکتابت کا پتہ

ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

طابع وناشر: عبداللطیف اعظمی • مطبوعہ: جمال پریس دہلی ۶ • ٹائیٹل: فائن پریس دہلی

شذرات

ایسے شاعر کم ہی ہوتے ہیں جو اپنے سنہ معاصر شاعروں میں سے کسی کی شاعرانہ عظمت کو تسلیم کرتے ہوں، ہم سمجھتے تھے کہ ہماری ہی شاعری کی دنیا ایسی رہی ہے لیکن ابھی چند ہفتے ہوئے جب انگریزی شاعر رابرٹ گریوز (ROBERT GRAVES) کا بحیرۂ روم کے ایک جزیرے مجورکا میں انتقال ہوا اور اس کے بارے میں ہم نے کچھ پڑھا، تو پتہ چلا کہ شاید سبھی زبانوں کی شاعری کی دنیاؤں میں یہ خصوصیت مشترک ہے۔ گریوز اپنے ہمعصروں میں ایلیٹ اور ایزرا پاونڈ کا بحیثیت شاعر کوئی خاص قائل نہیں تھا، حالانکہ ان کی شاعرانہ حیثیت مسلم ہے اور ایلیٹ تو جدید انگریزی شاعری کا گل سرسبد ہے جو زندگی سے متعلق اپنے نہ معلوم کتنے پڑھنے والوں کے رویے اور رجحان پر اثر انداز ہوا ہے۔ وہ ملٹن اور ورڈزورتھ کو بھی نہیں مانتا۔ حالانکہ دنیا کے ہر ادب میں شعراء اپنے قدماء میں بڑے شاعروں کا اعتراف و احترام کرتے رہے ہیں، ہم اس کی اس بات کو ایک طرح کا نک چڑھاپن ہی کہہ سکتے ہیں۔ شاید رابرٹ گریوز اس لحاظ سے بھی اپنے آپ کو منفرد دکھانا چاہتا تھا۔

گریوز جولائی ۱۸۹۵ء میں لندن میں پیدا ہوا، اس کا باپ اسکول انسپکٹر تھا اور ماں جرمن تھی۔ اس نے چارٹر ہاؤس اور آکسفورڈ کے سینٹ جونز کالج میں تعلیم پائی۔ آکسفورڈ جانے سے پہلے وہ پہلی جنگ عظیم میں محاذ پر لڑ چکا اور جنگ کی خونریزیوں کا مشاہدہ کر چکا تھا۔ اس سے اس کے اعصاب پر بُرا اثر پڑا تھا، لیکن شاعری نے اسے فساد اعصاب کا مستقل مریض بن جانے سے محفوظ رکھا، شاعری نے اس کے نفسی انتشار میں استحکام پیدا کیا۔ گریوز نے کچھ دن قاہرہ میں بھی گزارے جہاں وہ ایک تعلیمی ادارے میں معلم تھا لیکن ۱۹۲۹ء

میں اس نے میجورکا میں مستقل سکونت اختیار کرلی اور وہیں دے یا نام کے ایک چھوٹے سے قصبے میں جو ساحل سمندر پر واقع ہے، پچھلے دنوں اس کا انتقال ہوا۔ اس عرصے میں وہ صرف اسپین کی خانہ جنگی اور دوسری جنگ عظیم کے دوران اپنے گھر سے دور رہا۔ اس نے دو شادیاں کیں، پہلی بیوی نینسی مشہور مصور سر ولیم نکلسن کی بیٹی اور آزادی نسواں کی پُرجوش حامی تھی، اس سے گریوز کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ اس کی دوسری شادی بریل پری چرڈ سے ہوئی جو زندہ ہے اس سے تین بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ گریوز ۱۹۶۰ء میں ڈبلو، ایچ، اوڈن کے بعد آکسفورڈ میں پروفیسر آف پوئٹری مقرر ہوا تھا۔ اپنی زندگی کے آخری ایام اس نے بڑے سکون، خاموشی اور سادگی سے گزارے۔ سمندر کے کنارے ماہی گیروں کے جیسے ایک چھوٹے سے لکڑی کے مکان میں وہ لکھتا رہتا تھا۔ دے یا کی سڑکوں پر سیاہ فیلٹ ٹوپی پہنے اور ایک ہاتھ میں چھڑی لئے جب وہ ٹہلتا تھا تو لوگ اسے فوراً پہچان لیتے تھے۔ وہ اپنے سگریٹ خود بنا کر پیتا تھا، اس کے پاس نہ کار تھی اور نہ ٹیلیفون اور نہ ہی ٹائپ رائٹر، اس نے اپنے بارے میں کہا تھا کہ "وہ پرانے طرز کے ادیبوں اور مصنفوں کی صف کا آخری شخص ہے"

انگریزی ادب کے نقاد گریوز کو عام طور پر بیسویں صدی کا ایک ممتاز شاعر مانتے ہیں، لیکن ایسے بھی نقاد ہیں جنھوں نے اس کی شعری و ادبی کمزوریوں کو بیان کیا ہے، مثلاً انتھونی برگس نے لکھا ہے کہ گریوز کی زندگی شعر و ادب کی خدمت کے لیئے وقف تھی، لیکن شوق اور لگن ہی کافی نہیں ہے، کیونکہ اس میں شبہ ہے کہ گریوز بڑا شاعر تھا۔ اس کی شاعری، جیسی کہ ایلیٹ کی شاعری ہے، ہمارے لیئے نتیجہ خیز اور ہماری زندگیوں کے لیئے موثر نہیں ثابت ہوتی ہے۔ اس کے اشعار ہمارے حافظے میں زیادہ دیر محفوظ نہیں رہتے، یا اکثر وہ ہمیں برجستہ یاد نہیں آتے۔ روانی، تناسب اور موزونیت کے لحاظ سے بھی اس کے یہاں ڈھیلاپن محسوس ہوتا ہے۔ بول چال کی انگریزی کی تحریک سے اس کی کبھی نہیں بنی۔ الفاظ کے انتخاب، بندش اور طرز تحریر میں اس کا رجحان تقلیدی تھا اور ایسی زبان و ترکیبوں

کی مدد سے فضا جو کافی پہلے سے ہموار ہو چکی تھی۔ گریوز نے ہارڈی، فراسٹ، جان کرو رینسم اور براؤننگ کی شاعرانہ صلاحیتوں کو خراج اعتراف پیش کرتے ہوئے جدید انگریزی شاعری کے پورے ذخیرے پر خط تنسیخ دوڑا دینے میں انتہائی غیر محتاط رویہ اختیار کیا، اور اس کے اسی رویے نے اسے ایک ایسے موقف میں لا کھڑا کیا جسے ہم خطرناک حد تک "سنکی پن" کا موقف کہہ سکتے ہیں۔ گریوز کا خیال تھا کہ اس کی طرح کم شاعر ایسے ہیں جنھیں یہ شعور ہو کہ شاعری کیا ہے، لیکن اس نے جو کچھ لکھا ہے اس کے بیشتر حصے سے اس کے اس دعوے کی تصدیق نہیں ہوتی۔

گریوز کی ادبی زندگی خاصی دلچسپ تھی، بنیادی طور پر وہ شاعر تھا لیکن ہو سکتا ہے کہ اس کی عظیم شعری تخلیق کے جوہر اس کی نظموں میں پوری طرح نہ کھلے ہوں، بلکہ اس کی بہترین نمائندہ اس کی وہ مختلف النوع تحریریں ہوں جن میں اساطیر نگاری کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ ——— مثلاً اس کے تاریخی ناول، کلاسیکی کہانیوں پر مشتمل نثر کی تحریریں، تنقیدی جائزے، خیالی افسانے اور اساطیری علم کے ایسے مطالعے جن سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ مطالعے علم الانسان کی ڈسپلن کے اصولوں کے مطابق کیے گئے ہیں۔ آکسفورڈ انتھولوجی آف انگلش لٹریچر کے مرتب کو گریوز کی شاعری کو بڑی اہمیت کی شاعری قرار دینے میں تامل ہے، پھر بھی اگر اسے اس کے سیاق و سباق کے ساتھ پڑھا جائے تو پھر یہ شاعری دلنشیں اور پُر اثر ہے۔ اس کے کلام کا پہلا مجموعہ OVER THE BRAZIER ۱۹۱۶ء میں چھپا تھا، لیکن جب اس کی کتاب GOODBYE TO AL THAT جو پہلی جنگ عظیم میں اس کے تجربوں کی داستان ہے، چھپی (۱۹۲۹ء)، تو اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ اس کے بعد ۱۹۳۸ اور ۱۹۷۵ کی درمیانی مدت میں اس کے کلام کے چار مجموعے چھپے۔ 'CLAUDIUS' اور 'CLAUDIUS THE GOD' گریوز کے یہ دو ناول خاصے مشہور ہوئے اور ان پر "تصرف" کی قینچی چلا کر انھیں بی بی سی ٹیلی ویژن سے سلسلہ وار نشر بھی کیا گیا۔ تورات

انجیل کا وہ ایک اچھا اسکالر تھا، اس نے یونانی اور عبرانی اساطیر سے متعلق اچھی کتابیں لکھیں، حضرت مسیح کی بیوگرافی بھی اس نے مرتب کی اور کئی یونانی اور عبرانی کتابوں کے ترجمے بھی شائع کئے۔

گریوز کے معاصر شعراء میں سے کئی نے اس کی موت پر اظہار خیال کیا ہے۔ اسٹیفن اسپنڈر نے کہا کہ "اپنے عہد کے تمام شاعروں میں وہی ایک ایسا تھا جس نے شاعری کے تصور کو پاکیزہ بنائے رکھا۔" گیون ایونز کے خیال میں "جہاں اس نے بہترین شاعری کی ہے وہ آڈن، ایلیٹ اور ییٹس کی طرح صف اول کا شاعر ہے۔" پیٹر لیوی نے کہا کہ "وہ بڑا پیارا شخص تھا لیکن چونکہ اس کا شعری اسلوب بڑا مخلصانہ اور شخصی تھا، اس لئے نئی نسل میں اس کے مقلد نہیں ملتے۔ اس کی ذات دانشورانہ شوریدہ سری و بے ترتیبی اور انتہا پسندی کی حد تک بے ضابطگی کا ایک نادر نمونہ تھی۔" ——— دے یا میں اس کی یاد میں گرجا گھر کا گھنٹہ بجا اور وہاں کے پادری نے کہا کہ "وہ اس قصبے کا ایک اٹوٹ حصہ تھا۔ وہ رومن کیتھولک تو نہ تھا لیکن اس آبادی میں اس سے سب محبت کرتے تھے اور اسی لئے بشپ نے ہمیں اس کی اجازت دی کہ ہم اس کی یاد میں گرجا گھر کا گھنٹہ بجائیں اور اس کا سوگ منائیں۔" ——— گریوز نے ایک بھرپور ادبی زندگی گذاری اور جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوا تو اپنی انوکھی شخصیت کے گہرے نقوش چھوڑ گیا۔ دنیا کے ادبی حلقے اسے آسانی سے بھلا نہ سکیں گے، اور انگریزی ادب میں اس کا نام زندہ رہے گا۔

ریاض الرحمٰن شروانی

علی گڑھ اور جامعہ ملیہ

جب ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم مسلمانان ہند کی بنیاد رکھی گئی اُس وقت ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی پر ۱۸ سال کی مدت گزر چکی تھی۔ یہ جنگ آزادی شکست انجام ہوئی تھی اور اس کا سب سے زیادہ خمیازہ مسلمانوں کو بھگتنا پڑا تھا۔ چوں کہ انگریزوں نے حکومت مُغلوں سے چھینی تھی اور چوں کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اس لیے حکومت برطانیہ کی نظر میں وہ دوسروں سے زیادہ مشکوک قرار پائے تھے۔ سید احمد خاں کی حقیقت بیں نگاہ نے یہ تاڑ لیا تھا کہ مغلوں کے زوال اور انگریزوں کے اقتدار کے ظاہری اسباب کے علاوہ بعض ایسے اسباب بھی تھے جن کی طرف بہت کم لوگوں کا دھیان جاتا تھا۔ ایک طرف یورپ کا صنعتی انقلاب دوسری یورپین اقوام کی مانند انگریزوں کی برتری کا ضامن تھا اور دوسری طرف ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کی تقلید پسندی اور توہم پرستی ان کی پستی کا باعث تھی۔ سید احمد خاں نے اس کا علاج یہ تجویز کیا کہ مسلمانانِ ہند مغربی علوم وفنون سے استفادہ کرکے اپنے اندر روشن خیالی اور حرّیتِ فکر پیدا کریں۔ اس کے لیے انھوں نے مختلف جتن کیے۔ مثلاً سائنٹفک سوسائٹی کی تشکیل کی

پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی، صدر شعبہ عربی و اسلامک اسٹڈیز، کشمیر یونیورسٹی سری نگر۔ ۱۹۰۰۶

تہذیب الاخلاق کا اجرا کیا، قرآن کی تفسیر لکھی، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی تاسیس کی اور مدرسۃ العلوم کی بنیاد ڈالی۔ ظاہر ہے کہ اس کام میں اس وقت کے حالات کے پیش نظر حکومت کا تعاون ضروری تھا اور یہ تعاون اسی صورت میں حاصل ہو سکتا تھا جب مسلمانوں کے بارے میں انگریزوں کے شکوک رفع کئے جاتے۔ اس مقصد کی خاطر انھوں نے اسباب بغاوت ہند لکھی۔ گویا سید احمد خاں نے ایک اعلیٰ مقصد کے حصول کی خاطر جو لائحہ عمل بنایا تھا اس کا ایک جزو ملکی حکومت کے ساتھ اشتراک عمل بھی تھا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ سید احمد خاں کو مسلمانوں کے تہذیبی ورثے کا احساس نہیں تھا یا وہ انھیں مغربی تمدن میں ضم کر دینے کے حامی تھے۔ ہاں وہ مغرب سے استفادہ کرنے کے قائل ضرور تھے۔ اس طرح وہ قدیم اور جدید میں توازن پیدا کر کے مسلمانوں کی ایسی نسل تیار کرنا چاہتے تھے جس کی جڑیں ماضی میں ہوں لیکن اس کی نظریں مستقبل کی طرف ہوں۔ ان کا یہ قول بہت مشہور ہے کہ فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہو اور نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر۔ اس کا مطلب بھی اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ ماضی اور حال کو ملا کر مستقبل کا نقشہ بنانا چاہتے تھے جس میں سب سے گہرا رنگ مذہب کا تھا لیکن وہ مذہب تقلیدی نہیں بلکہ اجتہادی تھا۔
یہاں اس ذکر کا موقع نہیں کہ سید احمد خاں کو اپنے عقائد و نظریات کے لئے کیا کچھ سننا اور سہنا پڑا لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ پورے عزم و حوصلے کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرتے رہے اور اپنے مشن کو کامیاب بنانے میں انھوں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ پھر بھی یہ کہنا ممکن نہیں کہ وہ اپنے مقاصد میں پوری طرح کامیاب ہو سکے۔ دنیا کے بیشتر مصلحین اور رہنماؤں کی مساعی کا بالعموم یہی انجام ہوتا ہے

کیوں کہ جس طرح وہ اپنے وقت سے آگے دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اس طرح ان کی قوم وہ صلاحیت نہیں رکھتی ہے۔ سید احمد خاں کا مدرسۃ العلوم ان کی زندگی ہی میں محمڈن اورینٹل کالج بن گیا تھا اور آگے چل کر علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں تبدیل ہوگیا لیکن تہذیب الاخلاق انھیں بند کرنا پڑا اور سائنٹفک سوسائٹی کا منصوبہ برگ و بار نہیں لا سکا۔ انھوں نے تہذیب الاخلاق کے آخری شمارے میں اس بات کا ماتم کیا تھا کہ

"وہ سامان ہمارے پاس موجود نہیں جس سے ہماری معلومات زیادہ ہوں اور ہمارے خیالات کو وسعت ہو . . . . یہ نقص اسی وقت رفع ہوگا جب انواع و اقسام کے علوم و فنون کی کتابیں ہماری زبان میں موجود ہو جاوینگی اور ہماری قوم کو عموماً ان پر دسترس ہوگی۔ سائنٹفک سوسائٹی علی گڈھ نے اس کام کو پورا کرنے کا ارادہ کیا تھا مگر افسوس ہے کہ قوم کو اس طرف توجہ نہیں ہے اور اسی سبب سے اس کا کام ادھورا پڑا ہے۔"

اس سے بھی بڑا المیہ یہ ہوا کہ سید احمد خاں کے جانشینوں نے ان کے اصلی مقصد کو بڑی حد تک بھلا دیا اور اپنی ساری توجہ ان کے حصول کے ذریعہ پر مبذول کر دی یعنی مسلمانوں کی تقلید پسندی اور توہم پرستی کی چنداں فکر نہیں کی بلکہ انھیں انگریزی پڑھا کر سرکاری ملازمتیں دلانے کو اولین اہمیت دی۔ مسلمانوں کا انگریزی پڑھنا اور ملازمتیں حاصل کرنا بھی ضروری تھا لیکن یہی سب کچھ نہیں تھا اور نہ یہ سید احمد خاں کے خواب کی تعبیر تھی۔ علی گڈھ کے ارباب اقتدار نے جو مسلک اختیار کیا اس کے لئے وہ سید احمد خاں کی سند لاتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ جیسا کہ عرض کیا گیا، سید احمد خاں اپنے مشن کی کامیابی کے لئے حکومت وقت کے ساتھ تعاون کے قائل تھے لیکن بعد کے

دور میں ان کا مشن نظروں سے اوجھل ہوگیا اور صرف طریقۂ کار پیش نظر رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود سید احمد خاں کی قائم کردہ درس گاہ کے فرزندوں میں سے بعض نے اس طریقۂ کار کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور ان کے جانشینوں سے ٹکر لی۔ یہ ٹکراؤ اُس وقت شدت اختیار کر گیا جب گاندھی جی کی قیادت میں ہندستان میں عدم تعاون اور ترکِ موالات کی تحریک شروع ہوئی اور اس میں سرکاری تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ شامل کر لیا گیا۔ علی گڑھ کے نام ور اولڈ بوائے مولانا محمد علی جوہر اُن دنوں گاندھی جی کے دست راست تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے ارباب اقتدار سرکاری امداد لینا بند کر دیں اور اگر ایسا نہ ہو تو کالج کے طلبہ اسے چھوڑ کر باہر آجائیں۔ ان کا مشورہ کالج کے ارباب اقتدار کے لئے قابل قبول نہیں تھا لیکن طلبہ کی ایک جماعت ان کی آواز پر لبیک کہنے کے لئے تیار ہو گئی۔ البتہ انھوں نے یہ مطالبہ ضرور کیا کہ ان کی تعلیم کا متبادل انتظام کیا جائے۔ جامعہ کی کہانی کے مصنف عبدالغفار مدہولی صاحب کا کہنا ہے کہ "جامعہ ملیہ کا خیال ... ان جوشیلے، ناتجربہ کار لیکن پُرخلوص اور آمادۂ عمل نوجوانوں کے باہمی مشورے سے پیدا ہوا۔" ان نوجوانوں کے سرخیل ذاکر حسین خاں تھے جو بعد میں ڈاکٹر ذاکر حسین کے نام سے معروف ہوئے۔ اس کے بعد محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے ارباب اقتدار اور حریت پسند زعمار کے درمیان جو کشمکش پیدا ہوئی اس کی داستان طویل ہے۔ بہر حال ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو کالج کی جامع مسجد میں مولنٰا محمود حسن دیوبندی کے ہاتھوں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس عمل میں آئی۔

جامعہ ملیہ تحریک ترک موالات کے پُرجوش سیاسی دور کی پیداوار ہے جب کہ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی غیر ملکی حکومت کے ساتھ موالات کے تصور کی یادگار ہے۔

اس کا اثر ان دونوں کے مزاج اور کردار پر پڑنا ناگزیر تھا۔ سید احمد خاں نے اپنی تعلیم گاہ میں ماضی اور حال کی آمیزش کی کوشش کی تھی اور ان کی نگاہ مستقبل

کی طرف تھی۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر انھوں نے آکسفورڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیوں کو نمونہ اور مثال بنایا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ وہ مغرب سے استفادے کے حامی تھے۔ اس کے بخلاف جامعہ ملیہ کے بانیوں کے پیش نظر جو کام تھا اس میں مشرقیت کو مغربیت پر ترجیح حاصل تھی اگرچہ حال کے تقاضوں سے وہ بھی بے نیاز نہیں رہ سکتے تھے اور مستقبل کو خوش آیند بنانے کا خواب انھوں نے بھی دیکھا تھا۔ گویا وہ سید احمد خاں اور ان کے رفقاء کے مقابلے میں ماضی سے استفادہ کرنے کے زیادہ قائل تھے تب ہی تو انھوں نے اپنے ادارے کی تاسیس کے لئے دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث کا انتخاب کیا تھا۔ مولانا محمود حسن نے اپنے تاسیسی خطبے میں اس عمل کو ہندستان کے دو تاریخی مقاموں (دیوبند اور علی گڈھ) کا رشتہ جوڑنے کا نام دیا تھا۔ اس طرح جامعہ ملیہ دیوبند اور علی گڈھ کی درمیانی کڑی بن جاتی۔ مولانا نے جامعہ ملیہ کے قیام کا یہ مقصد بھی بیان فرمایا تھا کہ مسلمانوں کی تعلیم مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور اغیار کے اثر سے مطلقاً آزاد۔ مسلمانوں کی تعلیم مسلمانوں کے ہاتھ میں سید احمد خاں بھی دیکھنا چاہتے تھے لیکن وہ اسے اغیار کے اثر سے مطلقاً آزاد رکھنے پر تیار نہیں تھے۔ ان کے سوانح نگار پروفیسر خلیق احمد نظامی کا کہنا ہے کہ "جہاں وہ یہ چاہتے تھے کہ حکومتِ برطانیہ ان کے تعلیمی پروگرام میں معاون ہو وہاں وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ مدرستہ العلوم کے تعلیمی امور میں حکومت مداخلت کرے۔ انھوں نے بار بار یہ بات زور دے کر کہی کہ تعلیم کو حکومت کی مداخلت سے علیحدہ رکھنا ضروری ہے"۔ یہ بات یقین سے نہیں کہی جاسکتی کہ ان کے جانشینوں کے دور میں یہ توازن کس حد تک برقرار رہ سکا۔ جامعہ ملیہ کی تاسیس کے ابتدائی دنوں میں اس کے طلبہ کو ذہنی اور روحانی غذا اقبال کی مثنویوں "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" کے اشعار، قرآن کی آیتوں اور تاریخِ اسلام کے ولولہ انگیز واقعات سے

مہیا کی جاتی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جامعہ کی تاسیس میں قومی کے علاوہ مذہبی جذبہ بھی کارفرما تھا بلکہ شاید سب سے قوی جذبہ یہی تھا۔ دینیات کی تعلیم علی گڈھ میں بھی ہمیشہ لازمی رہی لیکن وہاں اس کی حیثیت ثانوی ہی رہی، اسے اولیت کبھی حاصل نہیں ہو سکی حالاں کہ اگر اس کا صحیح نصاب تیار کیا جاتا تو اس کے ذریعہ مسلمانوں میں روشن خیالی پھیلانے کے کام میں مدد ملتی، رکاوٹ پیش نہ آتی۔ یہاں ایک امر کی وضاحت ضروری ہے۔ جامعہ ملیہ کی تاسیس میں من جملہ دیگر عناصر کے ہندو مسلم اتحاد کا عنصر بھی بہت اہم تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ سید احمد خاں اس اتحاد کی اہمیت سے ناواقف تھے۔ ان کے کالج اور بعد میں یونیورسٹی کے معاونین، اساتذہ اور طلبہ میں ہندوؤں کی خاصی بڑی تعداد ہمیشہ شامل رہی اور ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں ان کے اتنے اقوال مشہور ہیں کہ ان کا یہاں دہرانا ضروری نہیں۔

سیاسی تحریکوں کا مزاج بالعموم یہ ہوتا ہے کہ وہ جس جوش و خروش سے ابھرتی ہیں اسی تیزی سے دب بھی جاتی ہیں، دوسرے تعلیم کا کام جوش و خروش کا نہیں، عقل و ہوش کا طالب ہوتا ہے، گویا سیاست اور تعلیم کا زیادہ دور تک ساتھ ساتھ چلنا ممکن نہیں ہوتا ہے۔ پھر جامعہ ملیہ کے بانیوں میں سب سے اہم شخصیت مولانا محمد علی طبعاً بھی ہوش سے زیادہ جوش کے آدمی تھے۔ وہ کسی تحریک یا کسی ادارے کی بنیاد ڈال سکتے تھے اور اسے ایک رُخ اور ایک سمت بھی عطا کر سکتے تھے لیکن اسے کامیابی سے ہم کنار کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ ان کی ایک تقریر کا اقتباس ان کے مزاج اور مقصد کی بڑی اچھی عکاسی کرتا ہے۔ انھوں نے فرمایا تھا: "ہم نے کبھی تعمیر کا ارادہ کیا ہی نہیں تھا جس کی حسرت آج ہمارے دل میں ہو۔ جامعہ کی یہ آبادی تو مدینہ کے مہاجرین اور انصار کے لوگوں کی طرح ہے جو فتح مکہ کے انتظار میں ہیں، ہمارا اصل قلعہ تو علی گڈھ کالج ہے جس پر ہمیں ایک نہ ایک دن قبضہ کرنا ہے۔" گویا ان کے نزدیک جامعہ ملیہ مقصد

نہیں بلکہ مقصد کے حصول کا ذریعہ تھی۔ جلد ہی وہ وقت آگیا جب جامعہ ملیہ کو قائم رکھنے یا بند کر دینے کے مسئلہ پر اس کے بانیوں اور خیر خواہوں کے درمیان باہمی مباحثہ ہونے لگا۔ ایسے وقت میں حکیم محمد اجمل خاں کی مسیحا نفسی نے اسے حیات نو عطا کی اور وہ اسے ۱۹۲۵ء میں علی گڈھ سے دہلی لے گئے۔ اس کام میں حکیم صاحب کی سب سے زیادہ مدد اور ہمت افزائی گاندھی جی نے کی۔ دہلی منتقل ہو جانے کے بعد جامعہ ملیہ پر سے سیاسی رنگ آہستہ آہستہ اترنے لگا اور تعلیمی رنگ چڑھنے لگا لیکن اس نے اپنی اصلی حیثیت اس وقت اختیار کی جب ۱۹۲۶ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین نے جرمنی سے واپس آکر، جہاں وہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کی غرض سے گئے ہوئے تھے، شیخ الجامعہ کی حیثیت سے اس کی زمام کار سنبھالی۔ انھوں نے اور ان کے رفقائے کار نے قلیل مشاہرے پر طویل مدت تک خدمت انجام دے کر ایثار و بے نفسی کی ایسی مثال قائم کی جس کا ثانی کسی دوسرے ادارے میں ملنا محال ہے۔ جامعہ ملیہ کے بعض اراکین اپنی ذاتی حیثیت سے اس کے بعد بھی تحریک آزادی میں حصہ لیتے اور اس کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے۔

محمڈن اینگلو اورینٹل کالج اور اس کے بعد علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کا بھی سیاست سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور رہا اگرچہ یہ سیاست جامعہ ملیہ اسلامیہ کی سیاست کی یکسر ضد تھی؛ اور حصولِ آزادی سے پہلے کی ایک دہائی تو ایسی گزری جب وہاں سیاست کو تعلیم پر غلبہ حاصل ہو گیا۔ یہ مسلم لیگ کی نشاۃِ ثانیہ کا دور تھا اور علی گڈھ بقول مسٹر محمد علی جناح اُس دور میں مسلم انڈیا کے اسلحہ خانے کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ جامعہ ملیہ، جو سیاسی جوش و خروش کا ثمرہ تھی، اس دور میں سیاست سے دور رہی جب کہ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی، جس کے بانی نے مسلمانوں کو سیاسی ہنگاموں سے الگ رہنے کا مشورہ دیا تھا، پوری طرح سیاست کی

گرفت میں آگئی۔ اس کا سبب غالباً ان اداروں کے سربراہوں کی شخصیت تھی۔ جامعہ ملیہ کے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین تھے جنھوں نے اپنے ذاتی سیاسی عقائد و نظریات کا سایہ جامعہ کے تعلیمی کام پر نہیں پڑنے دیا اور جب نومبر ۱۹۴۶ء میں جامعہ کی سلور جوبلی ہوئی تو ہندستان کی دونوں متحارب سیاسی جماعتوں (کانگرس اور مسلم لیگ) کے لیڈروں کو بیک وقت اس کے پلیٹ فارم پر جمع کر دیا۔ مسلم یونیورسٹی کی قیادت اس دور میں کسی اتنی بڑی شخصیت کے ہاتھ میں نہیں تھی، اس لئے وہ اس سیاسی کش مکش میں ایک فریق بن گئی۔

جب ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندستان کی سرزمین پر آزادی کا سورج طلوع ہوا اس وقت ان دونوں اداروں کے اربابِ اقتدار، وابستگان اور خیر خواہوں کی ذہنی کیفیت ایک دوسرے سے بڑی حد تک مختلف تھی۔ علی گڑھ والوں میں بے یقینی، تذبذب اور اضطراب کی کیفیت پائی جاتی تھی جب کہ جامعہ ملیہ کے کارکن اور بہی خواہ ایک خوش آئند مستقبل کا انتظار کر رہے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے جامعہ ملیہ کی سلور جوبلی کے موقع پر اپنے پیغام میں اسے آنے والے دور کی بشارت ان الفاظ میں دی تھی: "جامعہ ملیہ پر اس کی زندگی کے ابتدائی پچیس۲۵ برس گزر گئے اور اب وہ اپنی زندگی کے ایک نئے دور میں داخل ہو رہی ہے۔ ان گزرے ہوئے پچیس ۲۵ برسوں کی مدت طرح طرح کی مشکلوں اور رکاوٹوں کی ایک مسلسل داستان تھی مگر اب وقت آ گیا ہے کہ کامرانیوں اور سربراہیوں کی ایک نئی داستان شروع ہو جائے، آج ہم اس کا پہلا ورق الٹ رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ نئی داستان زیادہ سے زیادہ کامیاب اور شاندار ہوگی۔" یہ صحیح ہے کہ آزادی اور تقسیم ملک کے جلو میں خوں ریز فسادات آئے تھے اور دہلی بدقسمتی سے پوری طرح ان کی زد میں تھی۔ ان کا سایہ جامعہ ملیہ پر بھی پڑا لیکن یہ ایک عارضی مرحلہ تھا جو چند روز کے بعد گزر گیا

علی گڑھ کا معاملہ اس سے مختلف تھا اور وہاں مستقبل کی فکر دامن گیر تھی۔

ان خامیوں کے باوجود جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا علی گڑھ نے حصول آزادی سے قبل کی اپنی بہتر سالہ زندگی میں کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے۔ مسلمانوں میں مغربی تعلیم کی طرف رجحان اور ذہنی بیداری سب سے زیادہ اسی نے پیدا کی تھی۔ اس کے فرزندوں نے ہندوستان کی سیاسی، سماجی، علمی اور ادبی زندگی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور تاریخ کے صفحات میں اپنی جگہ محفوظ کر لی تھی۔ اس نے ارباب اقتدار کا جو بھی سیاسی مسلک رہا ہو۔ ہندوستان کی تحریک آزادی میں اس کے فرزندوں کا حصہ کسی سے کم نہیں تھا لیکن حصول آزادی سے قبل کی دس سالہ سیاسی کشمکش کے نتیجے میں اس پر ہر طرف سے طرح طرح کے حملے ہو رہے تھے اور اس کا وجود خطرے میں پڑ گیا تھا۔ اطمینان کی بات یہ تھی کہ اس وقت ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو اور وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد تھے جنھیں سیاسی اختلاف رائے کے باوجود علی گڑھ کی اہمیت اور افادیت کا پورا پورا احساس تھا اور مولانا آزاد نے ۱۹۴۹ء میں مسلم یونیورسٹی میں جو کانووکیشن ایڈریس دیا اس میں اس کے طالب علموں کو یہ نوید دی کہ وہ ان کے لئے آزاد ہندوستان میں روشن مستقبل کے سارے امکانات دیکھ رہے تھے۔ ان ہی دونوں کی تحریک پر ۱۹۴۸ء کے اواخر میں ڈاکٹر ذاکر حسین جامعہ ملیہ کو چھوڑ کر علی گڑھ آگئے اور مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری کی ذمہ داری سنبھال لی۔ گویا مولانا محمد علی نے علی گڑھ کا قلعہ فتح کرنے کا جو خواب دیکھا تھا وہ اس طرح پورا ہوا۔ ذاکر صاحب کے آنے سے علی گڑھ کے لیل و نہار آہستہ آہستہ بدلنے لگے اور افسردگی و مایوسی کی جگہ نشاط و کامرانی کی فضا چھانے لگی۔ ذاکر صاحب کا آٹھ سالہ دور وائس چانسلری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا عہد زریں ہے۔ اس دور میں وہاں علمی کام کو بڑھاوا ملا، حریت فکر کو فروغ حاصل ہوا اور نظم و ضبط بحال ہوا۔ سید احمد خاں علمی میدان

میں آزادانہ تحقیق کے حامی تھے۔ ذاکر صاحب نے بھی اسی پر اصرار کیا۔ یہ کیسا عجیب اتفاق تھا کہ علی گڑھ تحریک کے ایک بانی کے ہاتھوں اس تحریک کے صالح عناصر کی بازیافت ہوئی! کوئی تحریک اُس وقت تک اپنا مقصد پورا نہیں کرتی جب تک اس تحریک کے بانی کی حقیقی منشا کو پیش نظر نہ رکھا جائے۔ ذاکر صاحب اس نکتے سے واقف تھے، اس لئے انھوں نے سید احمد خاں کے افکار پر عمل پیرا ہونے کی بڑی حد تک کوشش کی لیکن زمانے کی اس ستم ظریفی کو کیا کہئے کہ جن سید احمد خاں کے خلاف ان کی زندگی میں ان کی روشن خیالی کے باعث کفر کے فتوے صادر کئے گئے تھے اب بعض لوگ ان ہی کا نام لے کر تنگ نظری کی تبلیغ کر رہے تھے۔

ذاکر صاحب نے اس کی ذرا پرواہ نہیں کی اور اپنے کام میں لگے رہے۔ ان کے ذہن میں علی گڑھ کا تصور یہ تھا کہ ہندستانی قومیت کا مستقبل اس بات پر منحصر ہوگا کہ علی گڑھ کیا سوچتا ہے اور علی گڑھ کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ کام بہت بڑا تھا اور اسے پورا کرنے کے لئے آٹھ سال کی مدت بالکل ناکافی تھی۔ تاہم جتنا ہوا وہ بھی کچھ کم نہیں تھا۔ ذاکر صاحب ۱۹۵۶ء میں علی گڑھ سے چلے گئے۔ ۱۹۶۵ء تک مسلم یونیورسٹی کم و بیش ان ہی خطوط پر چلتی رہی جو ذاکر صاحب نے وضع کئے تھے لیکن اس سال اس کی زندگی میں ایک ایسا حادثہ پیش آیا جس نے گھڑی کی سوئیاں پیچھے کی طرف موڑ دیں۔ نواب علی یاور جنگ پر، جو اس وقت مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے، بعض شرپسندوں نے بعض غلط فہمیوں کی بنا پر حملہ کر کے انھیں بری طرح مجروح کر دیا۔ اب مرکزی حکومت میں نہ پنڈت جواہر لال نہرو تھے اور نہ مولانا ابوالکلام آزاد جو وسعتِ قلب کا ثبوت دے کر بگڑی کو بنا لیتے۔

علی گڑھ جس تباہی سے ۱۹۴۷ء میں بچ گیا تھا اسے اب اس کا سامنا کرنا پڑا۔ جس ایکٹ کے تحت یونیورسٹی چل رہی تھی وہ منسوخ کیا گیا اور اس کی جگہ ایک

آرڈیننس جاری کر دیا گیا جس نے اس کی اندرونی خود مختاری ختم کر دی۔ اس کے خلاف مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے نے ملک گیر مہم چلائی۔ اس کے بعد جو واقعات پیش آتے رہے ان کا تفصیلی ذکر مقصود نہیں، غرض یہ کرنا ہے کہ ان حالات و واقعات نے مسلم یونیورسٹی میں ایسا ماحول پیدا کر دیا کہ اسے آزاد ہندستان میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا جو اہم فریضہ انجام دینا تھا اور جس کی بنیاد ذاکر صاحب اپنے دور وائس چانسلری میں ڈال گئے تھے وہ ادھورا رہ گیا اور لوگوں کا دھیان دوسرے نسبتاً کم اہم اور وقتی کاموں کی طرف لگ گیا۔ دوسری طرف احتجاج اور ہنگاموں نے ان عناصر کو ابھرنے کا موقع فراہم کر دیا جو ذہنی طور پر سید احمد خاں کے مشن اور مقاصد سے ہم آہنگ نہیں تھے اگرچہ نام ان ہی کا لیتے تھے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اس وقت کے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے حصولِ آزادی سے کئی برس قبل ایک موقع پر جامعہ کے طالب علموں کو مخاطب کرتے ہوئے مستقبل کے بارے میں فرمایا تھا: "اس جامعہ کو بھی تمھیں میں سے بعض چلاتے ہوں گے۔ اس وقت روپیے کی کمی نہ ہوگی، کرایہ کی عمارتیں نہ ہوں گی، تعلیمی سامان کی کمی نہ ہوگی، کتب خانے میں نہ جانے کتنی کتابیں ہوں گی۔ تعلیم تمھارے ہاتھ میں ہوگی، سیاست تمھارے اشارے پر چلے گی، رائے عامہ پر تمھارا اثر ہوگا۔ آج ہم کم زور ہیں، اس وقت تم مضبوط ہو گے۔ ان شاء اللہ۔ ہاں اس وقت بھول نہ جانا کہ تم نے اور تمھارے اگلوں نے بے غرض خدمت کو اپنا شعار بنایا، جو ٹھیک سمجھا وہ دل لگا کر کیا اور نتیجے کو خدا پر چھوڑ دیا۔" ذاکر صاحب ہی نے ایک دوسرے موقع پر جامعہ ملیہ کی حیثیت اور اس کے مقصد کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا تھا: "میرے نزدیک جامعہ ایک اسلامی ادارہ ہے جس کا مقصد ہندستان کے مسلمانوں کی تعلیم ہے۔ اس تعلیم کی بنیاد دینِ اسلام اور تمدنِ اسلام ہے... اس بڑے مقصد میں چند

اور مقاصد بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ وہ یہ ہیں: آزادی کی خواہش۔۔۔ اردو کی خدمت۔ خلاصہ یہ کہ جامعہ کے کام کی بنیاد اسلامی تعلیمات، آزادی کی خواہش اور اُردو کی خدمت ہے۔"

بے شک حصولِ آزادی کے بعد جامعہ ملیہ میں روپے کی کمی نہیں رہی، کرایہ کی عمارتیں نہیں رہیں، تعلیمی سامان وافر مقدار میں مہیا ہو گیا، کتب خانہ کتابوں سے پُر ہو گیا لیکن کیا ایثار اور قربانی کی وہ دولت اسی طرح باقی رہی، جو اُس وقت حاصل تھی؟ اور کیا سیاست اور رائے عامہ پر اہلِ جامعہ کا اثر اُسی طرح قائم ہو سکا جس طرح ذاکر صاحب دیکھنا چاہتے تھے؟ اپنے تعلیمی کاموں میں بھی جامعہ کس قدر آزاد ہے یہ کہنا دشوار ہے۔ بے شک جامعہ ملیہ آج بھی ایک اسلامی ادارہ ہے جو سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر ہندستان کے مسلمانوں کی تعلیم کا انتظام کرتا ہے۔ وہاں منجملہ دیگر علوم کے اسلامی تمدن کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ اردو کی خدمت بھی وہاں کے اہلِ علم تصنیف و تالیف کے ذریعہ برابر کرتے رہے ہیں اور آج بھی کر رہے ہیں لیکن اسلامی تمدن کی تعلیم ہندستان میں اور ہندستان کے باہر اور بھی متعدد درس گاہوں میں دی جاتی ہے اور اردو تصنیف و تالیف کا کام اور مقامات پر بھی ہو رہا ہے۔

ان حالات میں دیکھنا یہ ہے کہ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس کا جو اصلی مقصد تھا آزاد ہندستان میں وہ کس حد تک پورا ہوا ہے اور آئندہ اس کے پورا ہونے کے کیا امکانات ہیں۔ علی گڈھ تحریک کا بنیادی مقصد مسلمانوں کی تقلید پسندی اور توہم پرستی کو دور کرنا تھا اور جامعہ ملیہ ایثار و قربانی کے ذریعہ ہندستان میں اسلام کا ایسا تصور پیش کرنا چاہتی تھی جو بقول ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم دلوں کو جوڑتا ہے، توڑتا نہیں ہے۔ جو کچھ اوپر عرض کیا گیا اس کی روشنی میں یہ سمجھنا چنداں دشوار نہیں کہ یہ دونوں ہی ادارے ابھی اس منزل سے بہت دور ہیں

تعلیمی اداروں کی خاکستر میں ایسی چنگاری یقیناً پوشیدہ ہے جسے کرید کر شعلہ بنایا جا سکتا ہے۔ ایسا کرنے کے لیے علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے کارکنوں، اساتذہ اور طلبہ کو ہمت و جرأت کا وہ سبق پڑھنا ہوگا جو سید احمد خاں اپنی ذاتی مثال سے انھیں پڑھانا چاہتے تھے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ارکین کو ایثار و قربانی کے اس نمونے کی پیروی کرنی ہوگی جو ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے ساتھیوں نے اپنے عمل کے ذریعہ ان کے سامنے پیش کیا تھا۔ آزاد ہندستان کو سید احمد خاں کی جرأت و ہمت کی بھی ضرورت ہے اور ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے ساتھیوں کے ایثار و قربانی کی بھی۔ ہندستان میں مسلمانوں کی تعداد اتنی ہے جتنی انڈونیشیا کو چھوڑ کر کسی مسلمان ملک میں بھی نہیں ہے اور اس ملک کی جو ہیئت ترکیبی ہے اس میں مسلمانوں کا رول بلا شبہ بہت اہم ہو جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کی راہ میں بہت سی دشواریاں حائل ہیں لیکن دشواریاں تو ۱۸۵۷ء اور ۱۹۲۰ء میں بھی حائل تھیں۔ ان کی نوعیت یقیناً بدل گئی ہے لیکن ان کی شدت میں میرے خیال سے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ ان دشواریوں کے باوجود مسلمان خود اپنی اور اپنے ملک کی خدمت صحیح طور پر اسی وقت انجام دے سکتے ہیں جب یہ دونوں ادارے ایسے نوجوان پیدا کریں جن کے دماغ روشن اور دل وسیع ہوں اور جو سچ کو سچ کہنے اور اس پر عمل پیرا ہونے میں تامل نہ کریں خواہ اس کے لیے انھیں کوئی بھی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔ اس سچ کا مظاہرہ انھیں دوسروں کے مقابلے میں بھی کرنا ہوگا اور خود اپنے ہم مذہبوں کے مقابلے میں بھی۔ سچ کہنے کے ساتھ سچ سننے اور اسے برداشت کرنے کی عادت ڈالنا بھی ضروری ہے۔ اب جب کہ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کو وہ اندرونی خود مختاری ایک مرتبہ پھر حاصل ہو گئی ہے جو اس سے ۱۹۶۵ء میں چھن گئی تھی میں سمجھتا ہوں کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ارباب حل و عقد کے ساتھ اس کے ارباب حل و عقد بھی اپنی توجہ اور صلاحیتیں اس کام پر پوری طرح صرف کر سکتے ہیں۔

ایک اور مسئلہ بھی قابل توجہ ہے۔ ایک طرف سائنس، ٹیکنالوجی اور سائنسی علوم کے میدان میں ان اداروں کو ملک کی دوسری درس گاہوں کے دوش بدوش چلنا ہوگا اور دوسری طرف ان علوم وفنون میں جو ان کی اسلامیت اور مشرقیت کے ضامن ہیں یعنی عربی، فارسی، اردو، اسلامیات اور دینیات، ایسا معیار پیش کرنا ہوگا جیسا کہیں اور موجود نہ ہو۔ یہ صرف اس لئے ضروری نہیں ہے کہ جیسا کہ عرض کیا گیا، یہ علوم وفنون ان کا طرۂ امتیاز ہیں اور ان سے ان کی شناخت ہوتی ہے بلکہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ اسلام کو پوری طرح سمجھنے اور دوسروں کو سمجھانے کی خاطر ان کا حصول ناگزیر ہے۔ بہت سے مسائل محض غلط فہمیوں کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں۔ ہندستان میں ایک ہزار برس سے زیادہ مدت سے ساتھ ساتھ رہنے کے باوجود آج بھی یہاں بسنے والوں کے درمیان بہت سی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ یہ غلط فہمیاں اسی وقت دور ہو سکتی ہیں جب ایک دوسرے کے مذہب اور روایات سے سچی واقفیت حاصل کی جائے۔ میرے نزدیک یہ کام ایک طرف بنارس ہندو یونیورسٹی اور دوسری طرف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ذریعہ سب سے بہتر طور پر انجام دیا جا سکتا ہے لیکن اس کے لئے کھلے دماغ اور وسیع دل کی شرط ہے۔ سید احمد خاں کی تفسیرِ قرآن کے ہر حصے سے اتفاق ضروری نہیں لیکن اس کی روح یعنی عقل اور عقیدے کے درمیان مفاہمت اس راہ میں ہماری رہ نمائی ضرور کر سکتی ہے۔

مسلمانوں کی اقتصادی حالت دوسروں کی بہ نسبت کم زور ہے؛ اس لئے نادار مسلم طلبہ کی تعلیم کا مسئلہ خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ کسی ہونہار اور باصلاحیت نوجوان کو محض پیسے کی کمی کی بنا پر تعلیم سے محروم نہیں رہنا چاہیے۔ یہ فریضہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دوسرے تعلیمی اداروں کی بہ نسبت زیادہ بہتر طور پر انجام دے سکتی ہیں۔ علی گڑھ میں اس سلسلے میں بہت کچھ ہو بھی رہا ہے۔ خاص طور سے ڈیوٹی سوسائٹی،

جس کے بانی مسلم یونیورسٹی کے ایک نامور وائس چانسلر صاحب زادہ آفتاب احمد خاں تھے، اس مقصد سے سرگرم عمل ہے لیکن یہ کام ملت کی اور زیادہ توجہ کا طالب ہے۔ یہ صرف مسلمانوں کی خدمت نہیں ہوگی بلکہ ہندوستان کی خدمت بھی ہوگی کیوں کہ تعلیم یافتہ، باصلاحیت اور روشن خیال مسلمان ملک کے زیادہ اچھے اور کار آمد شہری ثابت ہو سکتے ہیں۔

علی گڑھ اور جامعہ کے بانیوں کے پیش نظر اپنے حدود سے باہر بھی مسلمانوں کی سماجی اور اقتصادی بہتری کا کام تھا اور یہ ادارے کسی نہ کسی حد تک یہ کام انجام دیتے رہے ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بعض کارکنوں نے، جن میں شفیق الرحمٰن قدوائی صاحب کا نام سرفہرست ہے، تعلیم بالغان کی طرف خاص توجہ دی اور اس سے بہت سے لوگوں نے (جن میں غیر مسلم بھی شامل تھے) فائدہ اٹھایا۔ تقسیم ہند کے دنوں میں ذاکر صاحب کی قیادت میں اس ادارے کے اراکین نے بے گھر مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کی قابل قدر خدمات انجام دیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد نے پچھلے دنوں یوپی میں مسلمانوں کے صنعتی اداروں کا جائزہ لیا اور انھیں مفید مشورے دئے۔ اس یونیورسٹی کی تاسیس بہت دنوں تک اس لئے معرض التوا میں پڑی رہی تھی کہ اس کے ہمدردوں کی خواہش تھی کہ اسے مسلمانوں کے دوسرے تعلیمی اداروں کے الحاق کا حق حاصل ہونا چاہیئے۔ یہ خواہش تو پوری نہیں ہو سکی لیکن مسلم یونیورسٹی کے ارباب کار مسلمانوں کے تعلیمی اداروں کی بہتری اور ترقی میں ہمیشہ دلچسپی لیتے رہے ہیں اور اس کام میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا خاص رول رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس طرح کے کاموں کو نہ صرف جاری رکھا جائے بلکہ ان کی رفتار اور تیز کی جائے۔ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ صرف تعلیم گاہیں نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت تحریکوں کی ہے اور تحریکیں اسی وقت زندہ رہ سکتی اور ترقی کر سکتی ہیں جب کہ ان کا رشتہ اپنے عوام سے استوار رہے اور وہ ان کی فلاح و بہبود کی طرف سے غافل نہ ہوں۔

محمد اکرام خاں

تعلیم اور اس کا دائرۂ عمل

جانداروں کی دو قسمیں بتائی جاتی ہیں۔ ایک حیوان مطلق اور دوسرے حیوان ناطق۔ ہمارا اور آپ کا شمار حیوان ناطق میں ہوتا ہے۔ حیوان ناطق کو حیوان مطلق پر فوقیت اور برتری حاصل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حیوان ناطق کے اندر قدرت نے ماحول کو بدلنے، ماحول سے متاثر ہونے اور ماحول پر قابو پانے کی بے پناہ صلاحیتیں ودیعت کی ہیں۔ یہ عقل سے کام لے کر تہذیب و تمدن اور علم و فن کی دنیا میں مسلسل ترقی کرتا رہتا ہے اور اس نے اپنے معاشرے کو بدل کر طرح طرح کی سہولتیں فراہم کرلی ہیں۔ چنانچہ یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ تعلیم مہذب انسان کی ایک ذہنی ضرورت ہے۔

یہ مسلمہ امر ہے کہ ہر جان دار شے کو اپنی جان سلامت رکھنے کی فکر رہتی ہے۔ بعض اوقات گرد و پیش کا ماحول جاندار کی مرضی اور منشا کے خلاف ہوتا ہے لیکن وہ اپنی فطری صلاحیتوں اور قوتوں کی مدد سے اس پر قابو پالیتا ہے یعنی یہ کہ مخالف ماحول کو اپنے لئے موافق بنالیتا ہے اور جس جاندار میں یہ قوت نہیں ہوتی ہے کہ وہ مخالف ماحول کے ساتھ مطابقت پیدا کرسکے یا اپنے ہم جنسوں سے مل کر ماحول کو بدل سکے وہ ختم ہوجاتا ہے مثلاً مچھلی کو پانی سے نکال کر خشکی میں رکھنے سے وہ بالآخر مرجاتی ہے خواہ مچھلی اپنی

ڈاکٹر محمد اکرام خاں، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

ہو یا بہت سی مچھلیوں کا بڑا سارا ڈھیر، یہی حال بہت سے پودوں اور جانوروں کا ہوتا ہے۔

حیوان ناطق یعنی انسان میں فطری طور پر سیکھنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اس میں سماجی رسم و رواج اور معاشرتی اصولوں اور روایتوں کو نہ صرف باقی رکھنے بلکہ ان سے فیضیاب ہونے اور ان کو خاطر خواہ طریقے پر بدلنے اور بہتر بنانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ ان کو نظری اور عملی تعلیم کے ذریعہ نئی نسل تک منتقل کرتا ہے۔ سماجی ماحول جس میں علم و فن، عادات و اخلاق اور معاشیات و سیاسیات کی نمو پذیر دنیا شامل ہے۔ ہمارے آبا و اجداد کی ذہنی جد و جہد اور تخلیقی صلاحیتوں کے استعمال کا نتیجہ ہے۔ اس ماحول کی مزید ترقی ہماری اپنی کوششوں پر منحصر ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہماری موجودہ زندگی کا ہر پہلو خواہ عملی ہو یا ذہنی بڑی حد تک اپنے اسلاف کی کوششوں کا مرہون منت ہے۔ خواجہ غلام السیدین نے لکھا ہے:

> "ہماری موجودہ نسل ان تمام نسلوں کے ترکے کی حامل ہے جو ہم سے پہلے گزر چکی ہیں اور ہم تہذیب و تمدن کے ارتقا نے پیہم میں اپنی کوشش اس منزل سے شروع کرتے ہیں جہاں گذشتہ نسل نے اسے چھوڑا ہے۔ اسی لئے یہ کہا گیا ہے کہ ہر بچہ تمام گذشتہ زمانوں کا وارث ہے اور اسی وجہ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ماضی کبھی معدوم نہیں ہوتا۔ ہے بلکہ حال کا ایک جزو لازم بن کر مستقبل کی تعمیر میں نہایت اہم حصہ لیتا ہے۔"[۵]

تعلیم معاشرتی زندگی کی مسلسل تجدید کا نام ہے۔ در اصل تعلیم اس عمل کا نام ہے جس کے ذریعہ طلبا کو ایک مخصوص قسم کی معاشرتی زندگی کی لذت سے آشنا

۵۔ خواجہ غلام السیدین۔ اصول تعلیم پرانا ایڈیشن ص ۳۳۔

کرکے انہیں زندگی کا سرگرم محافظ بنایا جاتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ تعلیم ایک طرف تو قوم کی صدیوں کی ذہنی اور روحانی کمائی کو آئندہ نسل کی طرف منتقل کرکے اسے تباہی سے بچاتی ہے اور دوسری طرف اس نسل میں یہ قابلیت اور صلاحیت پیدا کرتی ہے کہ وہ بزرگوں کے عطا کردہ ثقافتی ذخیرے میں خود اپنی جدوجہد سے اضافہ کرے۔

زندگی، بالیدگی اور تعلیم : تعلیم کے ذریعے آئندہ زندگی کا رخ متعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اس لئے یہ کہا جاتا ہے کہ جس علم کو طالب علم خود اپنی زندگی میں استعمال نہ کرسکے وہ علم سماجی اور تعلیمی نقطۂ نظر سے بے کار اور بے معنی ہوتا ہے اور بے عمل عالم خود اپنے لئے، اپنے وطن کے لئے اور سرزمین عالم کے لئے عذابِ الٰہی سمجھا جاتا ہے

زندگی کی طرح تعلیم کی بھی مختلف منزلیں ہوتی ہیں۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ تعلیم کی ایک منزل اس کے بعد والی منزل تک پہونچنے کا ذریعہ نہیں ہوتی ہے۔ جس طرح بچپن لڑکپن اور سنِ بلوغ سفرِ حیات کی تین ابتدائی منزلیں ہیں ان کے بعد جوانی، ادھیڑ عمر اور بڑھاپے کی تین منزلیں ہوتی ہیں اور ان تمام منزلوں کے علیحدہ علیحدہ تقاضے اور ضرورتیں ہوتی ہیں، اسی طرح تعلیم کی منزلیں ہیں اور ہر منزل پر طالب علم کی عمر کے مطابق عام اور خاص مقاصد تعلیم حاصل کئے جاتے ہیں تاکہ طالب علم اپنی زندگی کی ہر منزل پر کامیاب اور کامراں رہ سکے اور اسے ایک منزل سے دوسری منزل تک پہونچنے میں کسی قسم کی ذہنی اور جذباتی دشواری پیش نہ آئے۔ جو استاد تعلیم کو زندگی سے مربوط نہیں کرتے اور تعلیم کی ایک منزل کو دوسری منزل کی تیاری کا زمانہ سمجھ کر تعلیمی فرائض انجام دیتے ہیں وہ بچوں کو ان کے نفسیاتی تقاضوں اور دلچسپیوں سے محروم رکھتے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ نفسیاتی تقاضوں اور دلچسپیوں کو دبانا بچے کے فطری تقاضوں اور دلچسپیوں کا خون کر دینا ہوتا ہے اور فطری تقاضوں کا خون کرنے کا مطلب ہے بچے کا خون کر دینا۔ یعنی یہ کہ بچے کو غیر سماجی انسان بنا دیا

دیا جاتا ہے۔ جب بچے کے فطری تقاضوں کو ناپسندیدہ طریقوں سے دبایا جاتا ہے تو اس کی بے قرار توانائی بے جا شوخی اور شرارت کی راہ اختیار کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ شیر خوارگی اور بچپن کے زمانے کو کردار سازی اور زندگی کا رخ اختیار کرنے کے سلسلے میں بہت اہم سمجھا جاتا ہے۔

زندگی روز اول سے روز آخر تک بالیدگی کا نام ہے۔ بالیدگی کی منزل مزید بالیدگی کے سوا کچھ نہیں ہوتی یعنی سیرت کی تعمیر اور کردار سازی میں کمال سے کمال تر کی کوشش۔ بالیدگی کی طرح تعلیم کا مقصد صرف مزید تعلیم ہونا چاہیئے۔ تعلیم کی کامیابی کی جانچ کے لئے یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ اس نے طالب علم کے اندر مزید تعلیم حاصل کرنے کی کتنی پیاس اور لگن پیدا کی ہے۔

انسان کے بچے کا بچپن دوسرے جانداروں کے بچوں کے مقابلہ میں زیادہ طویل ہوتا ہے اور وہ زیادہ مدت تک دوسروں کی مدد اور حفاظت کا محتاج رہتا ہے۔ اسے مہذب زندگی بسر کرنے کے لئے باقاعدہ تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس زمانے میں معاشرہ زیادہ ترقی یافتہ نہ تھا اور معاشرتی مسائل زیادہ پیچیدہ نہ تھے۔ علوم و فنون کا میدان اتنا وسیع اور پیچ پیچ نہ تھا تو والدین حسب ضرورت اپنے بچوں کو خود تعلیم دے کر زندگی بسر کرنے اور اپنی مدد کرنے کے قابل بنا لیتے تھے۔ انسان کی ذہنی تشنگی اس حد پر قانع نہیں ہوئی، جیسے جیسے اس کی جستجو تیز تر ہوتی گئی اس کے علوم و فنون میں اضافہ ہوتا گیا۔ معاشرتی ضرورتوں کو پورا کرنے کے سلسلے میں ایک کو دوسرے کا محتاج بننا پڑا۔ تعلیم کے لئے مدرسوں کی ضرورت محسوس کی گئی اور بالآخر حکومت اور عوام دونوں کی یہ ذمہ داری قرار پائی کہ وہ بچوں کو مدرسے بھیج کر باقاعدہ تعلیم دلائیں۔ مدرسے سے یہ امید وابستہ کی گئی کہ وہ اپنے طلباء کی ذہنی، جسمانی اور روحانی قوتوں کی مکمل نشوونما کا معقول انتظام کریں تاکہ وہ زندگی کی ہر منزل میں اچھی اور خوشگوار

زندگی بسر کر سکیں۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اچھی زندگی سے کیا مراد ہے۔ کیا اچھی زندگی وہ ہے جو صرف اپنے لئے ہو اور جس میں صرف اپنا پیٹ پالا جا سکے۔ اپنی دنیا کے عیش و آرام میں خلل نہ پڑے اور اپنے ذاتی مفاد اور وقار کو ٹھیس نہ لگنے پائے یا وہ زندگی اچھی ہے جس کا فلسفہ جدوجہد اور محنت و سخت کوشی ہے جو دوسروں کی خدمت اور بھلائی کے کاموں میں صرف ہو۔ جس میں حقوق العباد اور حقوق اللہ کی ادائیگی کا قدم قدم پر خیال رکھا جائے۔ جس میں ذاتی مفاد کو قومی مفاد پر قربان کیا جائے۔ جس میں اپنا پیٹ صرف اپنے بھائیوں اور اپنے وطن کی خدمت کی خاطر پالا جائے۔ جس میں پیٹ کی آگ بجھانے کے ساتھ ساتھ دل اور روح کی کلی کے کھلنے کا بھی انتظام کیا جائے۔ یقیناً موخرالذکر زندگی اچھی زندگی ہے لیکن یہ زندگی محض لکھنا پڑھنا سیکھ کر سرکاری ملازمتیں حاصل کرنے اور اپنا پیٹ پالنے کے قابل بن جانے والی تعلیم کے ذریعے نصیب نہیں ہو سکتی ہے۔ یہ زندگی کتابی تعلیم یا چند ہنرمندیوں اور اطاعت شعاری کی مخصوص عادتوں کے پیدا کرانے والی تعلیم کے ذریعے حاصل نہیں ہو سکتی ہے اس کے لئے تعلیم کو زندگی سے مربوط کرنا ہوتا ہے۔ اس کے لئے طلبا میں ان کی پوشیدہ صلاحیتوں اور قوتوں کی کامل نشوونما کے بعد یہ احساس پیدا کرنا ہوتا ہے کہ جماعتی زندگی سب کے تعاون اور سب کی خدمت سے بنتی اور سنورتی ہے۔ اس دنیا میں جو آتا ہے وہ اپنے اندر کچھ نہ کچھ تعمیری صلاحیتیں ضرور لے کر آتا ہے۔ ایسے تعلیم کے ذریعہ شروع ہی سے سماجی خدمت کے کاموں کا شوق دلانا ہوتا ہے۔ اس کو اپنی اور اپنے خاندان کی روزمرہ کی ضرورتوں کو پورا کر سکنے کے قابل بنا دینا ہوتا ہے۔ اسے اپنی ذات اور اپنے سماج کی عزت کرنے اور اس میں اضافہ کرنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ اچھی زندگی کے لئے دی جانے والی تعلیم طلباء کو ان کی اپنی تہذیب اور اپنے تمدن سے پورے طور پر واقف کراتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان کے دلوں میں

سے بہتر سے بہتر بنانے کی امنگ اور حوصلہ پیدا کراتی ہے۔ یہ تعلیم اپنے طلبا کو زیادہ سے زیادہ وسیع النظر اور جمہوریت، آزادی، مساوات اور انصاف پسند بنانے کے لئے موثر پیرایہ اختیار کرتی ہے۔ غرضیکہ اچھی زندگی کے لئے دی جانے والی تعلیم محض نظری یا کتابی تعلیم نہیں بلکہ زندگی اور مسائل زندگی سے مربوط تعلیم ہوگی اور اس تعلیم کے لئے تمام سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کو ایسے مدارس بنانا پڑیں گے جن کو تعلیمی اصطلاح میں "کام کا مدرسہ" کہا جاتا ہے۔

اکثر مفکرین تعلیم اور معلمین کی رائے ہے کہ اچھی زندگی کے لئے تعلیم کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش جاری رکھنی چاہیئے۔ ان کے نزدیک تعلیم ایک سماجی عمل ہے۔ یہ سماج کے لئے اور سماج کے ذریعے ہی دی جا سکتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اچھی زندگی کا انحصار افراد کے کردار پر ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ تعلیم کا مقصد اخلاق، سیرت اور کردار کو اچھا بنانا ہونا چاہیئے۔ تعلیم کا مقصد مکمل انسان پیدا کرنا ہے ایسا انسان جو علم اور عمل میں یکتا ہو۔ ایسا انسان جس کے جذبات اور عقل میں ہم آہنگی اور پختگی ہو۔ ایسا انسان جو فرائض اور ذمہ داریوں کو حقوق پر ترجیح دے اور اپنے حقوق حاصل کرنے کے مقابلے میں دوسروں کے حقوق کی ادائیگی کا زیادہ خیال رکھے، دراصل تعلیم مہذب انسان کی بنیادی ضرورت ہے اور اس کا اصل مقصد طالب علم کو ایک مخصوص قسم کی معاشرتی زندگی کی لذت سے آشنا کر کے اسے اس زندگی کا سرگرم حصہ دار بنانا ہوتا ہے۔

ہم اخلاق، سیرت اور کردار کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کر سکتے البتہ ان میں سے ہر ایک کے دو رخ ہوتے ہیں ایک اچھا اور دوسرا برا۔ تعلیم کا کام اچھا اخلاق اچھی سیرت اور اچھا کردار پیدا کرنا ہوتا ہے۔ ہم عام طور سے اس غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی علم اور فن کے کسی ایک حصہ میں کسی حد تک کمال

اور مہارت حاصل کر لیتا ہے تو وہ اچھے اخلاق، اچھی سیرت اور اچھے کردار کا بھی حامل ہوگا۔ بات دراصل یہ ہے کہ انسان میں قدرت کی طرف سے بے پناہ صلاحیتیں اور قوتیں ودیعت کی جاتی ہیں لیکن عام طور سے صرف وہی صلاحیتیں اور قوتیں بروئے کار آتی ہیں یا وہی صلاحیتیں اور قوتیں فروغ پاتی ہیں جن کے لئے والدین اور اساتذہ ایک دوسرے کی مدد سے مناسب طور پر کوشش کرتے ہیں۔ اخلاق، سیرت اور کردار بجائے خود ایک علم ہیں اور عملی مشق اور تربیت بھی۔ جو طالب علم علم وفن کے جس شعبے میں استاد کی نگرانی اور رہنمائی کے مطابق سوچ سمجھ کر جتنی محنت کرتا ہے وہ اس میں اتنا ہی کمال حاصل کر لیتا ہے اور جس کی طرف توجہ نہیں دی جاتی اس میں کمزور رہ جاتا ہے۔ بس یہی محنت اور رہنمائی اخلاق، سیرت اور کردار کے بنانے اور سنوارنے کے لئے بھی درکار ہوتی ہے۔

انسان ذہنی اعتبار سے خواہ کتنا ہی عروج حاصل کر لے لیکن اس کی اور اس کے گردوپیش کی زندگی اس وقت تک اچھی اور خوش گوار نہیں بن سکتی جب تک اس کے علم اور عمل میں ہم آہنگی نہ ہوگی۔ وہ اپنے علم کی بنا پر خارجی دنیا کے حالات اور معاملات سے پورے طور پر آگاہی حاصل کر سکتا ہے لیکن ضروری نہیں ہے کہ اس کی زندگی بھی خوش گوار ہو۔ اس کے لئے اسے اپنے اخلاق، سیرت اور کردار کا بھی جائزہ لینا ہوگا۔ اس کے لئے علم اور عمل میں مطابقت پیدا کرنی ہوگی۔ زندگی کو خوش گوار بنانے کے لئے ذہنی ترقی کے ساتھ جذباتی اور روحانی پختگی کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور یہی پختگی دراصل اخلاق، سیرت اور کردار کی تعمیر کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہے۔ اسی لئے تعلیم کے ذریعہ فرد کی جسمانی، ذہنی اور روحانی قوتوں کو فروغ دینے پر زور دیا جاتا ہے۔

اخلاقی قدروں کے بغیر انفرادی زندگی تو گزاری جاسکتی ہے لیکن اجتماعی زندگی میں ان کے بغیر بہار آنا مشکل ہے۔ اچھے معاشرے اور اچھی معاشرتی زندگی کے لئے

اخلاقی قدروں کو اپنانا اور ان کے مطابق عمل کرنا لازمی ہے۔ ہمیں آج کل اپنے سماج اور معاشرے میں یہ خیال تو رہتا ہے کہ ہمارا حق دوسروں پر کتنا ہے اور دوسروں کو ہمارا احترام اور ہماری عزت کس طرح اور کس حد تک کرنی چاہیئے۔ لیکن یہ کبھی یاد نہیں آتا ہے کہ ہمارے اوپر دوسروں کے حقوق کتنے ہیں اور ہم ان کو کس حد تک ادا کر رہے ہیں۔ ہمارے یہاں اکثر انفرادی اور اجتماعی خرابیوں کو دور کرنے میں اس لئے ناکامی ہوتی ہے کہ ہمارے دماغ غرور سے اور دل ہوس سے پر ہیں۔ ہمیں اپنی آبادی میں دوسروں کی بربادی کا مطلق خیال نہیں رہتا، ہمیں اپنے سکھ کی خاطر دوسروں کے دکھ کی پرواہ نہیں رہتی۔ ہمارے اندر عاجزی اور انکساری محض دکھاوے کی ہوتی ہے۔ اچھے سماج اور اچھے معاشرے کے لئے ضرورت ہے ایسے انسانوں کی جو اپنی بے غرض خدمات سے اپنے اور اپنے برادران وطن کو تنگ نظری، طفلیت، باہمی رقابت، نفرت اور تعصب کے عذاب سے بچائیں اور اپنے کو دین اور دنیا کا خادم جانیں۔

اگر ہم اپنے معاشرے کو حقیقت بیں نظروں سے دیکھیں تو آسانی سے سمجھ جائیں گے کہ تعلیم محض پیٹ پالنے کے لئے حاصل کی جاتی ہے اور اس کے اصل نصب العین کا خلاصہ بقول اکبر الہ آبادی یہ ہے ؎

بی اے کیا، نوکر ہوئے، پنشن ملی اور مر گئے

ہماری مروجہ تعلیم نے اخلاقیات کے فطری عمل کو بالکل روک دیا ہے اور ان قدروں کو جن کی بدولت زندگی کو دونوں جہان میں امن و سکون، کامیابی اور خوش حالی نصیب ہوتی ہے ذاتی اغراض و مفاد کے محدود دائرے میں محصور کر دیا ہے۔ ہمیں تعلیم کے ذریعے زندگی کو خوشگوار بنانا ہے اور شخصیت کی مکمل نشوونما کے لئے تعلیمی رہنمائی سے فائدہ اٹھا کر تعلیم کو بہتر بنانا ہے۔

صغرا مہدی

خدیجہ مستور کا فن

۱۹۳۶ میں ترقی پسند تحریک اس بات کا اعلان تھی کہ ادب میں اب نئی تبدیلیاں ہونے کی ضرورت ہے، جب ادب حسن کے معیار کو بدلنے پر زور دیا گیا۔ ادب کا رشتہ انسان سے بلکہ عوام سے جوڑنے پر اصرار ہونے لگا۔ ادب میں سماجی حقیقت نگاری کو لازمی قرار دیا گیا۔ اس زمانے کے کم و بیش سبھی ادیبوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ اس تحریک کے تحت مختلف اصناف ادب کو فروغ ملا۔

مختصر افسانہ جس کی بنیاد انیسویں صدی کے بالکل ابتدائی دور میں رکھی جا چکی تھی اور جو پریم چند کے ہاتھوں ترقی کی مختلف منازل طے کرتا ہوا "کفن" تک پہنچ چکا تھا۔ ترقی پسند افسانے کے لئے "نشان راہ ثابت ہوا"۔ انگارے کے افسانوں میں جنس کو بھی موضوع بنایا گیا اور ان ہی نقوش پر ترقی پسند افسانہ لکھا جانے لگا اور اس صنف ادب کو ترقی پسند تحریک کے تحت بہت فروغ ملا۔ کرشن چندر، غلام عباس، عصمت چغتائی، احمد علی، مہندر ناتھ، منٹو جیسے افسانہ نگاروں میں خدیجہ مستور کا نام بہت اہم ہے۔

انھوں نے ابتداء میں عصمت چغتائی کی طرح رومانی افسانے لکھے مگر ان

ڈاکٹر صغرا مہدی، لکچرر شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

افسانوں میں رومانیت کا وہ رنگ نہیں جو ان سے پہلے افسانوں میں عام تھا۔
شروع سے ہی ان کے افسانوں میں خلوص اور سچائی [illegible] انداز پایا جاتا ہے
[illegible] کا اندازہ ان کے ابتدائی افسانوں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے
فن کی اساس دردمندی پر ہے .... اور ان کا
رشتہ فن اور زندگی سے گہرا ہے۔ انھیں انسان کے دکھوں کا احساس شدت
سے ہے۔

تقسیم کے بعد جو نئے پاکستانی ادیب سامنے آئے ان میں افسانہ نگاری
میں ایک نام [illegible] صداقت اور حقیقت نگاری سے [illegible] اور
[illegible] ان کی فکر [illegible] پیدا کی۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں [illegible] نچلے متوسط
ادنیٰ اور متوسط طبقے کی عکاسی [illegible] پیش کیا۔ انھوں نے اپنے
اکثر افسانوں میں ان لوگوں [illegible] جو بظاہر شرافت کا [illegible] قدم قدم
پر اخلاقی گراوٹ کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس [illegible] کا افسانہ [illegible]
بہت مؤثر افسانہ ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے تقسیم ہند اور اس سے پیدا شدہ [illegible]
سماجی، معاشی بحران اور ہجرت کے دوسرے مسائل کو بھی اپنے افسانوں میں پیش کیا
ہے۔ انھوں نے مرد اور عورت کے رشتوں کو اپنے اکثر افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔
انھوں نے سماج میں مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی کم تر حیثیت [illegible]
اور اس کی وفاداری کے جذبے کو اپنے فن میں پیش کیا ہے اور انھوں نے اس کا
اصلی سبب سماجی اور معاشی اسباب کو بتایا ہے۔

[illegible] اور [illegible] ان کے افسانوں کے
مجموعے ہیں۔ انھوں نے زیادہ تر افسانے [illegible] ان کا شمار [illegible] اچھے افسانہ
نگاروں میں ہوتا رہا اور زیادہ تر بحیثیت افسانہ نگار کے ہی مشہور رہیں۔ مگر جب

ن کا ناول "آنگن" شائع ہوا تو ان کے اس ناول کو لوگوں نے بہت پسند کیا اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اس ناول کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوا کہ خدیجہ میں ناول نگاری کی اچھی صلاحیت ہے۔ اس ناول کو پاکستان کا سب سے بڑا ادبی انعام آدم جی انعام بھی ملا۔

"آنگن" کا موضوع غیر منقسم ہندوستان کی سیاسی اور سماجی زندگی ہے۔ اس میں تقسیم کے زمانے کے ہندوستان کی سیاسی حالت کی بہت سچی اور پُراثر تصویر پیش کی گئی ہے، ناول ختم ہوتا ہے قیام پاکستان پر۔ پورے ناول پر ایک ایسی گھٹا چھائی ہوئی ہے کہ جو نہ کھلتی ہے نہ برستی ہے بس دل ہے کہ امڈا آتا ہے۔ مگر دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ قاری کی توجہ ایک منٹ کے لیے بھی ناول سے نہیں ہٹتی ہے اور یہ فضا بیحد جانی بوجھی اور کردار ایسے جیتے جاگتے ہیں کہ ذرا بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔

اس میں انھوں نے چھوٹی چھوٹی جزئیات کو ایک خاص معنویت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس ناول میں کوئی ویلن نہیں ہے مگر ہر کردار میں ویلن والی کوئی نہ کوئی خصوصیت ہے۔ یہ ناول اس لیے بھی بہت اہم ہے کہ ہم برصغیر کے ایک خاص سیاسی دور میں سانس لیتے چلتے پھرتے ہیں اور اس کا ایک حصہ بن جاتے ہیں۔ افسانویت اور حقیقت کے رنگ آپس میں گھل مل گئے ہیں اور افسانوی ادب کی یہی سب سے بڑی خوبی ہے۔

"زمین" خدیجہ کا دوسرا ناول ہے، جو ان کے انتقال کے بعد شائع ہوا ہے اور اس میں ماضی کی نہیں حال کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ پاکستان کے موجودہ سیاسی، سماجی اور اخلاقی انتشار کی کہانی، انسانوں کے خوابوں کے بکھرنے کی کہانی۔ اور قابل لحاظ بات یہ ہے کہ اس کہانی کو کہنے کے لیے انھوں نے کوئی علامتی یا تمثیلی انداز بیان نہیں اختیار کیا ہے۔ یہ کہانی براہ راست دھیمے مگر دلدوز لہجے میں کہی گئی ہے اور یہی

ان کی فنی بصیرت ہے۔

اس ناول کا موضوع سماج میں ہونے والے مظالم ہیں جن کا شکار خاص طور سے عورت ہے۔ خدیجہ نے ان مظالم کے خلاف پرسوز آواز اٹھائی ہے جن میں خلوص کی آنچ ہے احساس کی شدت ہے اور طنز کی کاٹ ہے جس کا اندازہ ایک مردانہ کردار کے اس ایک جملے سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے: "اخلاقیات کے تصور نے عالیہ باجی کو کسی کام کا نہیں رکھا۔ تاجرے میں نانا نے تھاما تو اور کوئی اٹھاتا وہ دنیا میں اسی لیے پیدا ہوئی ہے۔"

خدیجہ مستور کے اسلوب میں بلا کی قوت ہے۔ وہ مشکل سے مشکل پیچیدہ سے پیچیدہ بات آسان اور دل نشین انداز میں کہہ جاتی ہیں۔ دنیا دکھوں کا گھر ہے اور دکھ دنیا میں رہنے والے ہر انسان کا مقدر ہیں اور انسان صرف یہی کرسکتا ہے کہ حتی المقدور ان دکھوں کا مداوا کرے اور اپنی محبت اور دردمندی سے زخمی دلوں پر اپنی محبت اور ہمدردی کا پھاہا رکھے۔ جس انسان اور جس فنکار نے اس حقیقت کو جان لیا، انسانی دکھ درد کو سمجھا، اس کو اپنے فن میں پیش کیا وہ سچا فن کار ٹھہرا۔

مجموعی طور پر جب ہم خدیجہ مستور کے فن کا جائزہ لیتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں اپنے ملک سے شدید محبت ہے۔ ان میں آزادی کا جذبہ ہے، عام انسانیت کا درد ہے۔ نسل انسانی کی تباہ کاریوں اور اس میں ملوث بڑی طاقتوں سے شدید نفرت کا اظہار ہے۔ نوع انسانی کے لیے ایک گہرا دردمندی کا جذبہ ہے۔

ہر انسان خاص طور سے ہر عورت بنیادی طور پر امن پسند ہوتی ہے اسے اپنی آزادی پیاری ہوتی ہے۔ خدیجہ اس پر یقین رکھتی ہیں۔ آپ ایک جگہ لکھتی ہیں: "مجھے امن سے محبت ہے جنگ سے نفرت ہے مگر مجھے اس جنگ سے بھی امن کی طرح

محبت ہے جو انسان اپنی آزادی، اپنی عزت، اپنے ملک کی بقا کے لیے لڑتا ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ جنگ ختم ہو گئی۔ مگر میں جب تک زندہ ہوں میری یادیں ختم نہ ہوں گی۔ اب میں اس آٹھ دس سال کے بچے کو کس طرح بھولوں جو جنگ کے زمانے میں میرے گھر کے قریب گھر کی چھت پر کھڑا پتنگ اڑا رہا تھا۔ اس دن اتنے جہاز اڑ رہے تھے کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ یہ معلوم ہوتے ہوئے کہ یہ جہاز اپنے ہیں۔ میرا دل خوب دہشت سے لرز رہا تھا۔ میں نے چیخ کر لڑکے سے کہا کہ چھت پر سے اتر جاؤ۔ وہ کہنے لگا دشمن کے جہاز آئے تو اسی پتنگ سے گرا لوں گا۔ میں آپ کی طرح ڈرتا نہیں ہوں۔"

اپنے سیدھے سادے مگر دل نشین انداز میں خدیجہ نے بہت کچھ کہہ دیا، اس ایک جملے میں جو انھوں نے ایک بچے سے کہلوایا ہے انسانی زندگی کی ایک اہم ناک حقیقت پوشیدہ ہے۔

خدیجہ مستور کی یہ خوبی ہے کہ ترقی پسندوں کی صف میں رہ کر بھی انھوں نے اپنے فن کو فارمولوں کا پابند نہیں کیا نہ اس کو اپنے سیاسی نظریات کے پروپیگنڈے کا ذریعہ بننے دیا۔ اس لیے ان کے افسانے اور ناول اپنی ایک ادبی حیثیت رکھتے ہیں۔

خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور دونوں سگی بہنیں ہیں۔ دونوں نے اپنی زندگی ایک ساتھ گذاری ہے۔ ادبی زندگی ایک ساتھ شروع کی۔ ہندوستان سے پاکستان ہجرت بھی ساتھ کی۔ ادب میں ان دونوں کے نام ایک ساتھ لیے جاتے رہے۔ ایک ساتھ ہی ان کے فن پر اظہار رائے ہوتا رہا۔ ان دونوں کے نام اور ان دونوں کے کاموں کو ایک دوسرے سے ملا کر دیکھا گیا ہے۔ ان کے افسانے کو اُن کے نام اور ان کے ڈرامے کو ان کے نام منسوب کر دیا گیا۔ "آنگن" لکھنے کے بعد خدیجہ مستور کی کچھ الگ پہچان ہوئی۔ مگر اب اس کی ضرورت ہے کہ خدیجہ مستور نے جو بھی لکھا

ہے اس کا جائزہ لیا جائے اور اس کی ادبی حیثیت متعین کی جائے۔ اس کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ وہ اب ہم میں نہیں ہیں۔

ان کے فن کے مطالعہ کے بعد یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ خدیجہ مستور نے اردو افسانوی ادب میں ایک گراں قدر اضافہ کیا ہے۔

قمر غفار

فرخی

محمود غزنوی کے دور کی نہایت نامور اور قابل قدر ادبی شخصیتوں میں ایک نام فرخی کا بھی ہے۔ اس کی ابتدائی زندگی کے بارے میں سب سے پہلی شہادت صاحب چہار مقالہ اپنی کتاب کے باب دوم "در چگونگی شاعر و شعراو" میں پیش کرتے ہیں۔

فرخی سیستان کا رہنے والا تھا۔ یہ قدیم سرزمین، ایران کے داستانی قہرمانوں اور پہلوانوں کی تولدگاہ سمجھی جاتی ہے۔ اور قبل اسلام کے ایران سے متعلق اکثر و بیشتر داستانوں کا مرکز یہی علاقہ ہے۔ ایران کے بعض شریف خاندان اور اشرافی سلسلے اسلام کے بعد اس علاقے میں حفظ و امان کے ساتھ رہتے رہے تھے۔ البتہ شاعری اور ادب سے زیادہ اس سرزمین کی آب و ہوا اہل سیف اور سپاہی پیشہ لوگوں کو پیدا کرتی رہی۔ چنانچہ صاحب چہار مقالہ نے فرخی کا جو قیافہ پیش کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نہایت قوی جسم اور توانا تن و توش کا آدمی تھا۔ اس کے سر پر بہت بڑی پگڑی اور پاؤں میں بھاری بھرکم جوتا دیکھ کر مشکل سے اہل نظر کو یہ گمان ہو سکتا تھا کہ وہ ایک بلند تخیل اور نازک طبع شاعر بھی ہے۔

فرخی کا نام علی کنیت ابوالحسن اور اس کے باپ کا نام جولوغ تھا۔ صاحب چہار مقا

ڈاکٹر قمر غفار صاحبہ، لکچرر ڈپارٹمنٹ آف عرب ایرانین اینڈ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۲۵

کی اطلاع یہ ہے کہ آغاز جوانی ہی سے فرخی نے فنون لطیفہ میں غیر معمولی دلچسپی دکھانا شروع کر دی تھی۔ علم موسیقی، چنگ نوازی اور شاعری کے متنوع فنون میں مہارت رکھتا تھا اور چونکہ شعر و موسیقی کا چولی دامن کا ساتھ ہے اس لیے موسیقی کے ذوق نے اس کے شاعرانہ مزاج و فن کو اور جلا بخشی۔ یہی وجہ ہے اس کے کلام میں ایک روانی اور موسیقیت پائی جاتی ہے۔ الفاظ کا بہاؤ ہے کہ جیسے نرم رو دریا بہہ رہا ہو۔ بہار کی ہوائیں گنگناتی ہوں جنہوں نے چمن کا سماں رنگا رنگ، روپ، مستی اور خوشبو بکھیر دی ہو۔ ان کمالات کی وجہ سے اس کو سیستان کے ایک دہقانی امیر کے ہاں ملازمت مل گئی جس کا نام خلف بن احمد تھا۔ اس طرح فرخی نے عنفوان شباب کے چند دن خلف بن احمد کی حمایت میں گذارے۔ یہیں اس نے ایک لڑکی سے شادی کر لی اور اپنے مربی کو اطلاع دی کہ میرا خرچ اب دگنا ہو گیا ہے لہٰذا تنخواہ بصورت نقد و جنس عنایت کی جاتی ہے اس میں اضافہ کر دیا جائے۔ غالباً خلف ابن احمد کی مالی استعداد بہت زیادہ نہ تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنے نوجوان ملازم کی عرضداشت کو محض زیادہ طلبی اور ہوس عیش و نوش سمجھا ہو۔ الغرض فرخی کی جو تنخواہ مقرر تھی اس میں اضافہ نہ ہوا اور شادی خانہ آبادی کے نتیجے میں نوکری بھی گئی۔ بہرحال فرخی کا حوصلہ بلند رہا اور اس عالی ہمت انسان نے بہت جلد نیا ملجا و ماویٰ تلاش کر لیا۔

نوجوانی کی امنگوں سے بھرپور اور تخلیقی صلاحیتوں سے سرشار فرخی نے نئے مربی اور بہتر مواقع کی تلاش میں اپنے وطن سیستان سے قدم باہر نکالا اور چغانیان میں جا کر وہاں کے امیر ابوالمظفر چغانی کے دربار میں رابطہ و ضبط پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ابوالمظفر چغانی ایک باذوق اور ہنر پرور شخص تھا۔ ساتھ ہی اس کا مختار کل (کدخدای امیر) خواجہ عمید اسعد نامی ایک نہایت ہی زیادہ علم دوست اور سخن شناس واقع ہوا تھا۔ فرخی نے عمید اسعد سے ملاقات کی اور راستے میں جو قصیدہ نظم کیا تھا وہ پیش کیا۔

قصیدہ کا مطلع ایک براہ راست موضوع بیان سے شروع ہوتا ہے کہ میں اپنے گھر سے نکل کر حلہّ کی طرف جانے والے قافلے میں شامل ہوگیا۔

با کاروان حلّہ برفتم ز سیستاں

با حلہّ تنیدہ ز دل بافتہ زجاں

اور اس قافلے کے ہمراہ چلتے چلتے بالآخر آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ مگر اس خالص بیانیہ اور روکھے سوکھے گذارش احوال میں فرخی نے اپنے فن اور تخیل کی بھرپور توانائی سے ایک عجیب وغریب ادبی دلکشی پیدا کردی۔۔ جس کی وجہ سے خواجہ عمید اسعد کو بہت حیرت ہوئی۔ وہ بار بار کبھی قصیدے کے اشعار پر نظر ڈالتا تھا! ور کبھی فرخی کے نیم مہذب دہقانی قیافہ اور اس کی سگزی وضع وقطع کو دیکھتا تھا۔ یہ دو منظر ایسے متضاد تھے کہ عمید اسعد کو اعتبار نہ آتا تھا کہ قصیدہ واقعی فرخی نے کہا ہے۔

عمید اسعد نے امتحان کی خاطر فرخی سے کہا کہ میں تم کو امیر ابوالمظفر کے پاس ابھی لے چلتا مگر آج کل امیر داغگاہ گیا ہوا ہے جہاں نئے گھوڑوں کی گنتی ہو رہی ہے اور ان کو داغ لگائے جارہے ہیں۔ اگر تم داغگاہ کے منظر اور وہاں کی کیفیت پر مشتمل ایک قصیدہ نظم کرو اور حسب موقع امیر کی مدح کہو تو میں تم کو امیر کی خدمت میں متعارف کرادوں گا اور اس کے ساتھ داغگاہ کا نقشہ زبان وبیان میں کھینچ کر دکھایا کہ کوسوں تک سبزہ زار ہے، جابجا چشمے بہتے ہیں، بے تکلف احباب کی محفلیں جمتی ہیں۔ ناچ دگانے اور جام ومینا کے دور چلتے ہیں۔ بادشاہ ایک ہاتھ میں پیالہ اور دوسرے میں کمند لے کر بیٹھتا ہے۔ شراب پیتا جاتا ہے اور لوگوں کو گھوڑے انعام میں دیتا جاتا ہے۔

چنانچہ فرخی نے فوراً اسی رات تعمیل ارشاد میں قصیدہ نظم کیا جو عام طور پر

ادبی تاریخ میں "قصیدہ داغگاہ" کے عنوان سے معروف ہے اور فارسی شاعری کا نہایت مشہور شاہکار شمار ہوتا ہے۔ قصیدہ کا مطلع اور چند اشعار درج ذیل ہیں:

چون پرند نیلگون بر روی پوشد مرغزار　　پرنیان ہفت رنگ اندر سر آرد کوہسار

خاک را چون ناف آہو، مشک زاید بی قیاس　　بید را چون پر طوطی، برگ روید بی شمار

داغگاہ شہریار اکنون چنان خرم بود　　کاندرو از خرمی خیرہ بماند روزگار

سبزہ اندر سبزہ بینی چون سپہر اندر سپہر　　خیمہ اندر خیمہ چون سیمین حصار اندر حصار

گردن ہر مرکبی چون گردن قمری بطوق　　زکمند شہریار و شہرگیر و شہردار

ہر کرا اندر کمند شست بازی در فگند　　گشت نامش بر سرین و شانہ و رویش نگار

ہر چہ زین سو داغ کرد از سوی دیگر ہدیہ داد　　شاعران را با لگام و زایران را با فسار

روز یک نیمہ کمند مرکبان تیز تگ　　نیم دیگر مطربان و بادۂ نوشین گوار

عمید اسعد اس قصیدے کو سن کر اور زیادہ حیران ہوا۔ فرخی کو امیر ابوالمظفر کے پاس لے جا کر بہت تعریف و توصیف سے متعارف کرایا۔ جہاں اس کو ایک اطمینان بخش جگہ مل گئی۔ کچھ عرصہ چغانیان میں گذارنے کے بعد فرخی وہاں سے سلطان محمود کے دربار کی طرف متوجہ ہوا۔ دراصل وہ ایک بڑے فنکار اور صاحب توسل ادیب کی طرح خوب سے خوب تر کا قائل تھا اور سلطان محمود کے دربار کا حلقہ واقعی طور سے اس کے شایان شان تھا۔

فرخی کے قصیدۂ داغگاہ کے بارے میں جس کا حوالہ مختصراً اوپر گذرا چند اجمالی باتیں عرض کرنا ضروری ہیں۔ پہلی بات یہ کہ نظم داغگاہ منظر نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔ مثال کے طور پر:

سبزہ اندر سبزہ بینی چون سپہر اندر سپہر　　خیمہ اندر خیمہ بینی چون حصار اندر حصار

روی ہامون سبز، چون گردون ناپیدا کنار　　روی صحرا سادہ چون دریای ناپیدا کنار

ہر کجا سبزہ است شادان یاری از دلدار یار ہر کجا خیمہ است خفتہ عاشقی با دوست مست

شاعری کی یہ تعریف اپنی جگہ مسلم ہے کہ وہ احساسات و جذبات کی تصویر کشی کا دوسرا نام ہے۔ یہ قصیدہ مذکورہ تعریف کے معیار پر پورا اترتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ فرخی اس ماحول کی روح کو اپنے کلام کے اندر محفوظ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ جس ماحول کو وہ پیش کرنا چاہتا تھا۔ پورے قصیدہ میں داغگاہ کا ماحول متحرک اور شگفتہ شکل میں نظر آتا ہے۔ حالانکہ انداز بیان نہایت سلیس ہے اور بظاہر کسی فنکارانہ مہارت کا التزام نہیں کیا گیا ہے پھر بھی یہ شاعر کے تخیل کی گرمی اور احساس کی جولانی ہے کہ بغیر کسی صنعت گری کے داغگاہ کے ماحول کو فارسی ادب کا زندہ جاوید عنصر بنا دیا۔

فرخی کے کمال کا جوہر آخر کار محمود کے دربار میں اور زیادہ چمکا اور اس کو شعرائے محمودی کے مخصوص و اعلا طبقے میں ایک نمایاں مقام حاصل ہوا۔ اس کے قصائد کا بڑا حصہ دربار غزنہ کی مدح سے متعلق ہے۔ مدح سے قطع نظر ان قصائد میں جہاں اس نے سلطان محمود کی فتوحات کا ذکر کیا ہے اس کی واقعات نگاری کی صنعت پوری طرح جلوہ گر ہے۔ فرخی سے پہلے بھی یہ صنعت موجود تھی لیکن سینکڑوں گوناگوں واقعات کو بے تکلفی اور برجستگی سے ادا کرکے اس نے واقعہ نگاری کی ایک شاہراہ قائم کردی اور آئندہ نسلوں کے لئے راستہ صاف کر دیا۔ اکثر قصائد میں فتوحات کا ذکر کرتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ایک مورخ ہے جو ذکا ست ٹھیک ٹھیک حالات لکھتا چلا جاتا ہے۔

فرخی محمود سے تقرب کی وجہ سے ہندستان کے اکثر محاذوں میں شریک رہا۔ چنانچہ اس دوران پیش آنے والے واقعات اور مقامات کا ذکر تفصیل سے کرتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ قصائد تاریخی اعتبار سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں جبکہ

بلکہ ان کا مشاہدہ بھی کیا ہے۔

فرخی سومنات کی مہم میں، جس کو محمود کا غالباً سترھواں حملہ کہا جاتا ہے اور جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت مشہور ہے، محمود کے لشکر میں موجود تھا۔ اس کا قصیدہ جو فتح سومنات سے متعلق ہے بہت زیادہ معروف ہے۔ اس قصیدہ میں شاعر نے محمود کے لشکر کی روانگی سے لے کر سومنات کی فتح کے بعد غزنہ واپسی تک کے تمام حالات کی طرف اشارے کئے ہیں۔ اس کو پڑھ کر بہت سے مناظر آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ مثلاً وہ خوفناک جنگلات جن کو فوج نے عبور کیا اور جہاں خود ہی راستے بنائے گئے۔ وہ زہریلے سانپ جو راستے میں ہر جگہ نظر آتے تھے، مضبوط قلعے جن کو فتح کیا گیا وہ طاقتور غنیم جو پشاور سے لے کر گجرات تک ہر منزل پر فوج کا راستہ روکنے کے لئے جان توڑ کوشش کرتا رہا۔ فرخی کی قوت مشاہدہ یقیناً بے مثال تھی۔ اس نے جو کچھ دیکھا نہایت خوبی سے اپنے قصیدہ میں اس کا ذکر کیا۔ مثلاً ہندو کس طرح اپنی مورتیوں کی پوجا کرتے تھے۔ کس احترام اور عقیدت کے ساتھ ان کو دودھ، گلاب اور زعفران سے غسل دیتے تھے اور کس طرح ان کی عبادت کرتے تھے ان تمام مناظر کی روشن جھلک فرخی کے قصیدوں میں ملتی ہے۔ شاعر اس حقیقت کو اچھی طرح محسوس کرتا ہے کہ محمود اور اس کے سپاہی اجنبی ملک میں جہاں انسان اور آب و ہوا دونوں جانی دشمن ہیں یقیناً ایک عظیم اور تاریخی کارنامہ انجام دے رہے ہیں۔ وہ پرجوش انداز میں محمود کی جنگی صلاحیتوں کی تعریف کرتا ہے اور ساتھ ہی فوج کے جنگی حوصلے کی بھی دل کھول کر داد دیتا ہے۔

فرخی نے تمام اصناف شعر میں اپنی موزوں طبیعت کو آزمایا۔ اس کے دیوان میں نو ہزار سے زیادہ شعر ہیں اور ان میں قصائد کے سوا غزلیات، قطعات، ترجیع بند اور رباعیاں بھی شامل ہیں۔ فرخی کے دیوان میں جو کچھ دن پہلے شائع ہو چکا ہے قصائد کی ایک بڑی تعداد سلطان محمود غزنوی کی مدح میں ہے۔ غزنوی دور بنیادی طور

سے قصیدہ گوئی کا دور تھا اور اس وقت تک کسی دوسری صنف شعر کو بہت زیادہ موزوں توجہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ فرخی بھی زندگی بھر قصیدے کہتا رہا۔ مطبوعہ دیوان کے آخر میں فقط چار ترجیع بند اور چند رباعیاں ملتی ہیں۔ البتہ دیوان کی بیشتر ضخامت قصائد پر مشتمل ہے

فرخی کے پورے کلام میں جو خصوصیات نمایاں ہو کر سامنے آتی ہیں وہ نقادان ادب کے نزدیک فقط دو ہیں۔ ایک 'روانی' دوسرے 'تازگی'۔ پہلی خصوصیت کا تعلق ترتیب الفاظ اور صوتی تکنیک سے ہے یعنی شاعر اپنے کلام میں ایسے الفاظ کا انتخاب کرتا ہے اور آواز کی وہ ترتیب مقرر کرتا ہے کہ پڑھنے والے کو یہ احساس ہو گویا آبشار یا دریا کا پانی بہہ رہا ہے۔ دوسری خصوصیت کا تعلق الفاظ کی تکنیک سے نہیں بلکہ احساس کے ابلاغ سے ہے یعنی فنکار اس قسم کے احساسات دوسروں تک پہنچانے پر قادر ہو کہ جس کے نتیجہ میں پڑھنے والوں کا احساس تازہ اور شگفتہ ہو جائے۔ یہ صفت کم و بیش ہر فنکار کے یہاں ہوتی ہے اور تمام فنون لطیفہ کا مجموعی تاثر یہی ہے کہ اس سے احساس کی پژمردگی دور ہوتی ہے۔ البتہ فرخی کے یہاں یہ صفت غالب طور سے موجود ہے۔ ان دونوں صفات کا اگر صحیح اندازہ مندرجہ بالا تعریف سے نہ ہو سکے تو مزید ثبوت کے لیے فرخی کے چند اشعار کافی ہوں گے۔

دوش وقت صبحدم بوی بہار آورد باد
حبذا باد شمال و خرما بوی بہار

باد گوئی مشک سوده دارد اندر آستین
باغ گوئی لعبتان جلوه دارد در کنار

باغ بوقلمون لباس و شاخ بوقلمون نمای
آب مروارید گون و ابر مروارید بار

راست پنداری که خلعتهای رنگین یافتند
باغهای پر نگار از داغگاه شهریار

محمد ذاکر

تعارف و تبصرہ

آج جن کتابوں کا ذکر مقصود ہے وہ ہیں "لل دید"، "سُراب در سراب"، "لاحاصل"، "... جدیدیت: تجزیہ و تفہیم"

سرِ فہرست ہے لل دید۔ یہ کشمیر کی مشہور عارفہ شاعرہ لل دید کی حیات اور اس کے کلام کے محققانہ تذکرے اور اس کے تذکروں پر مشتمل ہے جسے جے لال کول نے ساہتیہ اکاڈمی کے لیے ترتیب دیا اور موتی لال ساقی نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اکاڈمی ہی کی طرف سے اسے شائع کیا گیا ہے۔

دنیا میں ایسی ہستیاں کم ہیں جن کے گزر جانے کے بعد ان کے گرد عقیدت و روایت کا ہالہ یا دھندلکا بن جاتا ہے۔ لل دید ایسی ہستی ہے جس کے چاروں طرف افسانوں کی روایات اور اس سے منسوب غیر معمولی واقعات کا ایسا سلسلہ ہے جس کے ہوتے ہوئے اصل حقیقت تک پہنچنا اور اس سے سیر حاصل بحث کرنا کسی بھی سوانح نگار اور مبصر شعر و ادب کے لیے ایک زبردست چیلنج ہے۔

ایسی ہستیوں کا کلام بھی ضبطِ تحریر میں آنے سے پہلے زیادہ تر عوام کے دلوں پر نقش ہو جاتا ہے اور نسل بعد نسل سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہتا ہے۔ اس طرح اس

پروفیسر محمد ذاکر، شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

میں الحاقی عناصر راہ پا جاتے ہیں اور ہوتے ہوتے ان کا کلام یا اُن کے بول لوک ادب کا
۲ حصّہ بن جاتے ہیں۔ لَل دید کے واکھیوں کے ساتھ بھی یہی عمل ہوتا رہا ہے۔ [یہاں یہ
بتا دینا مناسب ہے کہ واکھیہ جے لال کول کے مطابق عموماً چار سطروں (مصرعوں؟) پر مشتمل
ایک بند ہوتا ہے جس میں قافیہ بندی کا التزام بالقصد نہیں ہوتا۔ اس اعتبار سے اسے چار مصرعوں
کے اردو قطعے سے مماثل کہا جا سکتا ہے۔] چنانچہ سر جارج گریرسن کے مرتبہ متن کے باوصف جو تمام
معتبر مجموعوں کی بنیاد ہے لَل واکھیوں کے کسی بھی متن کو سو فیصد مستند نہیں کہا جا سکتا۔ جے لال
کول نے بہر حال عقیدوں اور ماضی کے دھندلکوں اور روایتوں میں گھری ہوئی اس شخصیت
سے متعلق تمام مواد کو سنسکرت اور فارسی ماخذ کی روشنی میں کھنگالا ہے اور لَل دید کا زمانۂ
حیات کا تعین چودھویں صدی عیسوی میں کیا ہے اور لَل دید سے منسوب واکھیوں کے
ماخذ اور مجموعوں پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ انھوں نے ان تمام واکھیوں کو داخلی شہادتوں
کی کسوٹی پر پرکھا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ لَل دید کے مستند واکھیوں کی تعداد
اسی اور سو کے درمیان ہے

ڈیڑھ سو صفحے کی اور چھے ابواب پر مشتمل اس کتاب میں لَل دید کے کلام میں فکری عناصر
اور اُس کے دور اور ماحول سے بھی خاطر خواہ بحث کی ہے اور اس سلسلے میں لَل واکھیوں
کے ذخیرۂ الفاظ اور سوتروں کی اصطلاحات کے حوالے دیکر لَل دید کو شیو یوگنی قرار
دیا گیا ہے۔ کول اس بات کے معترف نہیں ہیں کہ لَل دید نے اسلامی طرز کو اپنے اندر
جذب کر لیا تھا۔ لیکن اُس زمانے میں تصوف کے چلن اور مسلمان صوفیوں سے لَل دید کی
ملاقاتوں کی شہادت کی روشنی میں اس سے انکار کرنا مشکل ہے کہ اسلامی تصوّف کا اس پر کچھ نہ
کچھ اثر ضرور ہوا ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ خود اسلامی تصوف کی تشکیل میں پہلے ہی ایرانی یا
آریائی ذہن نے کتنا حصہ لیا تھا اور اب اس پر ہندستانی اثر کتنا ہو چکا تھا۔ اس کے
علاوہ خود کول کے مطابق واکھیوں میں بیان کی گئی حقیقت اور صوفیوں کی تعلیم میں کسی

قسم کا کوئی ٹکراؤ بھی نظر نہیں آتا۔ (ص ۱۰۴)۔ ہمارے خیال میں یہ بات اتنی زیادہ اہم نہیں کہ لل دید دورِ متوسط کے عارفوں میں صف اول کی عارفہ تھی یا دورِ قدیم کی آخری ہوگئی۔ اصل میں جو بات زیادہ اہم ہے وہ خود کول کے الفاظ میں یہ ہے کہ "لل دید نے فلسفے یا شاعری میں اضافہ کرنے کے لیے قصداً واکھ نہیں کہے، نہ ان کو کبھی مُدھر لے میں گایا، نہ کیرتن کے لیے کاغذ پر اُتارا، بھجن کیرتن کا جو راستہ بعد کے بھگتی شاعروں نے اپنایا وہ بھی یہاں نظر نہیں آتا" (ص ۶۲) لل دید پاکدامن صاف دل ہستی تھی؛ وہ ایسی پارسا تھی جس نے اپنے آپ کو مروج پارسائی کے قاعدوں کا پابند نہیں بنایا۔ دیوانہ وار گھوم پھر کر اس نے عام لوگوں کے سامنے ایک ایسی زبان میں روحانی تجربے پیش کئے جسے ادبی حیثیت حاصل نہ تھی۔ لل واکھیے یا لل کا کلام تو دراصل روح کی پکار ہے جس کی کوئی خاص لے نہیں ہوتی۔ افہام و تفہیم اور مقابلہ و موازنہ کے لیے مبصرین اسے اپنی اپنی مختلف اصطلاحات میں ناپنے تولنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ لل دید کے کلام سے ظاہر ہے کہ وہ صوفیا کی طرح بے لاگ اور سزا و جزا سے بے نیاز ہو کر عمل کا سبق دیتی ہے، عمل جو ذات باری کی نذر کیا جائے۔ وہ بے ثباتیِ دنیا کی طرف اشارہ کرتی ہے اور ظاہر داری چھوڑ کر تزکیۂ نفس اور وسیع المشربی کی تلقین کرتی ہے۔ اس کے علاوہ چاہے ایسے عارفوں کا مقصد معاشرتی اصلاح نہ ہو مگر عملاً ان کی فکر اور کلام کو اس سے معرا نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح ان کے کلام میں عصری سماجی کیفیت پر بھی روشنی پڑ سکتی ہے۔ چنانچہ لل دید کے واکھیے جہاں روحانی تجربے کی شدت، زندگی اور موت کے اسرار جاننے کے شوق کی آگ کا پتہ دیتے ہیں وہیں ان سے لل دید کی انسان دوستی کے جذبات بھی ظاہر ہوتے ہیں۔

کتاب کے آخر میں ۱۳۸ واکھیوں کا ترجمہ دیا گیا ہے۔ نمونے کے طور پر یہ تراجم ملاحظہ ہوں:

کچے دھاگے سے ہوں کھینچتی ناؤ کو   کاش حق مجھ کو اُتارے گھاٹ پر
خام کوزے میں رِسا جاتا ہے آب   وصل حق کی ہے مجھے بس آرزو
(ص ۱۱۶)

نفس منہ کو بھوک سے دیکھیں نڈھال   جیسے پت جھڑ میں درختوں کا سماں
عقل کا اندھا بنا سردار ہے   ہٹنا تھا وہ رسوئیے کو وال
تب سے میں نِت غرقِ غم ہوں کیا کروں   چھوٹ جاؤں جنم کے بندھن سے کب؟
(ص ۱۱۷)

پوتھیوں کا پاٹھ آٹھوں پہر کرتے رہتے ہیں   جیسے طوطا بند پنجرے میں جپے ہے رام رام
کرتے ہیں بکواس پانی میں مکھن کرکے تلاش   ایسے پڑھنے سے ہوا اُن کے کبر کا اہتمام
(ص ۱۲۳)

کون ہے شرما کے رستے میں رکاوٹ بن سکے   کون ہے جو بند کر لے ان ہواؤں کو بہتا
اندریوں کو جو سمیٹے اور کر لے زیر بار   گھپ اندھیرے میں وہی سورج کو لے گا ہاتھ میں
(ص ۱۲۶)

نام، شہرت کیا ہے بس جیسے کہ چھلنی میں آب   ہے وہی بلوان جو مٹھی میں بند کر لے ہوا
زلف کے اک تار سے ہاتھی کو بھی باندھے رکھے   یہ ہو کر بیٹھا وہی سمجھو کہ ہے بس کامیاب
(ص ۱۲۶)

غرض فکر و بیان کی یہی وہ خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے للہ دید بجا طور پر جدید کشمیری زبان و ادب کے معماروں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس کی بدولت کشمیری زبان میں فلسفیانہ خیالات کو سمونے کی گنجائش پیدا ہوئی۔ یہ اور بات ہے کہ للہ کے زمانے سے بہت بعد تک کشمیری زبان کو وہ سرپرستی حاصل نہ ہو سکی جس کی وجہ سے وہ اور زیادہ ترقی کر سکتی۔

موتی لال ساقی کا ترجمہ کامیاب ہے خصوصاً واکھیوں کا اگرچہ کہیں کہیں جگہ معلوم ہوتا ہے کہ انھیں نہ شائع ہوا ہے۔ ساہتیہ اکاڈمی کی پیش کردہ کتاب میں پروف ریڈنگ کی کمی کھٹکتی ہے۔ متن میں کشمیری الفاظ اور عبارتیں بھی اگر حواشی میں ہوتیں تو زیادہ مناسب ہوتا۔ کتاب کی قیمت بیس روپے ہے۔ مناسب ہوگا کہ اس کا سستا ایڈیشن شائع ہوتا کہ یہ اور بڑے حلقے تک پہنچ سکے اور قومی یکجہتی کے صالح جذبات کے لیے زمین ہموار کرنے میں اس سے اور مدد مل سکے۔

دوسری کتاب "سراب در سراب" پرتپال سنگھ بیتاب کی غزلوں اور نظموں پر مشتمل ہے اور جموں و کشمیر کلچرل اکادمی کی مالی اعانت سے اسے شائع کیا گیا ہے۔ بیتاب کی یہ دوسری پیشکش ہے۔ ان کے یہاں زندگی کا ایک سفر ہے مگر گم گشتہ راہوں کا۔ برف، کشتی، دریا، بحر، جزیرہ — یہ الفاظ ان کی غزلوں میں بار بار آئے ہیں۔ ظاہر ہے ان کا بنیادی رشتہ پانی سے ہے۔ پانی جو سیلاب کی صورت میں سب کچھ بہا لے جاتا ہے مگر وہ پیاس بھی بجھاتا ہے اور اسی کی تلاش میں سراب سے بھی واسطہ پڑتا ہے۔ اسی لیے غالباً اس مجموعے کا نام سراب در سراب رکھا گیا ہے۔ دورِ حاضر کی بے یقینی اور عدم سیرابی کے پیش نظر مجموعے کا یہ نام معنی خیز ہے۔ بیتاب کے یہاں تجسس اور تلاش کے کرب کی نشاندہی بھی کی جا سکتی ہے اور پناہ گاہوں کے باوجود بے آسرائی، فرد کی شکست اور اندرونی ٹوٹن اور انسانی زندگی کے مستقبل کے سفر کے اندھیرے کے احساس کی بھی جو آج کے انسان کا مقدر ہے۔ دو ایک شعر ملاحظہ ہوں:

خوب صورت ہیں یہ کھلونے مگر — سبھی ٹوٹے ہوئے ہیں اندر سے

(ص ۳۲)

تاریک جنگلوں میں تو محفوظ ہم رہے — اپنی پناہ گاہوں میں بے آسرا ہوئے

(ص ۱۰)

آپس میں اُلجھتے ہی چلے جائیں گے رستے　　کوئی بھی سڑک شہر میں سیدھی نہ رہے گی
(ص ۲۵)

جدید تر غزل میں خیالات و لفظیات کے اعتبار سے جو نیا انداز در آیا ہے اس کا اثر بھی بیتاب کے ہاں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ یہ شعر دیکھیے:

دن کی دہلیز پہ سوچوں بیتاؔب　　جائے گی اب یہ سیہ رات کہاں
(ص ۵۵)

شہر میں برف گر رہی ہو گی　　اور اک شخص جل رہا ہو گا
(ص ۵۷)

اس مجموعے میں تقریباً چالیس آزاد نظمیں ہیں۔ عنوان کسی پر نہیں۔ نظموں کو "بلا عنوان" رکھنے کا جواب بیتاؔب نے یہ دیا ہے کہ "اس سلسلے میں میرا نظریہ یہ ہے کہ میں جس نسل سے تعلق رکھتا ہوں وہ نسل ہی بلا عنوان ہے" (ص ۲۶)۔ ہمارے خیال میں قاری کو اس جواب سے تسلی نہیں ہو سکتی۔ نظموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں بھی ایک طرح کی یاسیت بیتاؔب کو جکڑے ہوئے ہے۔ شاید اس کی وجہ یہی ہو کہ خود زندگی میں کرب زیادہ ہے لیکن اس کرب کو سمو کر، منوّر کر کے، لفظوں میں اس طرح اتارنا کہ وہ دوسروں کی دھڑکن کا پتہ بھی دینے لگے اس طرح کہ وہ سب کے لیے عزیز از جان سرمایہ بن جائے بڑی شاعری کی وہی منزل ہے۔ بہر حال بیتاؔب کی نظموں میں خلوص اور سچائی ہے، ہر دم ستانے والا اور اظہار پر اکسانے والا احساس اور جذبہ ہے اور وہ بلند آہنگ الفاظ اور دور از کار تشبیہات کا سہارا نہیں لیتے۔ یہ باتیں ان کے آئندہ شعری سفر کے لیے کامیابی کی بشارت بن سکتی ہیں۔

زیر تذکرہ تیسری کتاب "لا حاصل" ہے جو جمیل الدین عالیؔ کے کلام کے دوسرے مجموعے کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ اس میں غزلیں بھی ہیں، دوہے بھی، نظمیں اور

گیت بھی۔ عالی ہند و پاک کے نامور شاعروں میں ہیں اور زیادہ تر اپنے دوہوں کی وجہ سے ممتاز ہیں اگرچہ ان کی غزل بھی ان کے دوہے سے کسی طرح ہیٹی نہیں۔ دوہا ہند و پاک کی وہ پرانی صنفِ سخن ہے جو کئی ہزار دیہات پر مشتمل ان ملکوں کے عوام سے شاید سب سے زیادہ قریب ہے۔ میرے خیال میں یہ ایک ایسی ذہنیت کی پیداوار ہے جسے دائرہ کرنے کا شوق ہے۔ حقیقت میں اس میں ان عام صداقتوں کا بیان ہوتا ہے جنھیں بہت ممکن ہے کہ سب پہلے ہی جانتے ہوں لیکن اس کا مخصوص، قطعی اور فیصلہ کن آہنگ یا کہیے عروضی در و بست سامع کو مرعوب بھی کر دیتا ہے اور سوچنے پر مجبور بھی، اور اس اعتبار سے دوہا علم و دانش کی ایک گرہ بن جاتا ہے۔ ہیئت یا عروض سے تعلق رکھنے والے کچھ بھی کہیں مگر میرے خیال میں دوہے کا یہ جوہرِ خاص ہے۔ دوہے میں حسنِ ارضی کی جھلکیاں بھی ہو سکتی ہیں مگر آفاقیت و ماورائیت کا پہلو بالعموم حاوی رہا ہے جس کا رشتہ اخلاق سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن ہر صنف کی طرح دوہا بھی دیگر سماجی حقیقتوں کی فوری آنچ سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ عالی کے دوہوں میں حسنِ ارضی کی طرف میلان سے انکار نہیں لیکن اُن میں پُرتشویش سماجی حقیقت سے پیدا ہونے والی ذہنی کیفیات کی جھلکیاں نمایاں ہوئے بغیر نہیں رہتیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے مربوط یا مسلسل دوہے بھی کہے ہیں جنھیں دوہے کے مخصوص آہنگ میں نظمیں کہنا بیجا نہ ہوگا۔ "پاکستان کتھا" اور "انجیر یا بانی" کے علاوہ اور ایسی نظمیں اس مجموعے میں شامل ہیں اور ان میں سے بیشتر میں ہندی الفاظ کا لوچ خاص کیفیت دکھاتا ہے۔ چند دوہے ملاحظہ ہوں:

چاند اُڑا کر سب ہیں مگن پر سوچ میں ہیں کچھ لوگ
یہ دھرتی کا مان بڑھایا دھرتی کے روگ (ص ۱۵)

جگ کے پربت تولے اور پھر اتنے ہی پربت تولے
میرے مہا پاپوں کا پلڑا اپنی طرف ہی ڈولے (ص ۹۹)

گرج گرج کر گھنٹے گھڑیاں روز مجھے دھمکا ئیں
جاتے دن ۔ورو رخصت ہوں آتے دن سہما ئیں (ص ۱۳۲)

آؤ تمھیں اک بات بتائیں ، مطلب جانو آپ
بھنور سے نیچے جا کر دیکھا پانی تھا چپ چاپ (ص ۱۸۰)

غزلوں میں عالی کے ہاں ارضی حسن کا پہلو نمایاں تو ہے مگر کم کم ۔ مگر دوہوں ہی کی طرح ان کی غزل فکر اور خلش ہائی روزگار سے بے نیاز نہیں ہے ۔ زبان و محاورے پر انھیں قدرت ہے ۔ ہندی الفاظ کے باسلیقہ استعمال کے علاوہ وہ جب چاہتے ہیں فارسی تراکیب سے کام لے لیتے ہیں ۔ وہ غزل کی روایات کے امین ہیں بلکہ بے شبہ انھوں نے فکر و اسلوب کی تازگی سے غزل کی کلاسیکی روایت کو آگے بڑھایا ہے غزل کے مخصوص مضامین اور زبان و بیان پر قدرت کی وجہ سے جو بے ساختگی پیدا ہوتی ہے اس سے ان کے اشعار سہل ممتنع کی حدود کو چھو لیتے ہیں ۔ نمونے کے طور پر یہ شعر ملاحظہ ہوں :

تیرے ساتھ عمر بھر اپنی یوں ہوئی گزر ایک آہِ بے اثر، اک نمازِ بے ثواب
(ص ۱۷)

اہلِ شہر، اہلِ چمن ، اہلِ قفس خیر تو ہے کیا خبر بھی نہیں آئی کہ بہار آئی ہے
(ص ۲۴)

سننے والو! غور نہ کرنا ورنہ تم جاگ اٹھو گے ہم کچھ سچے اور کچھ جھوٹے خوابوں کے دیوانے ہیں
(ص ۶۶)

کہیں نہ ہونے دیا رنجِ گمرہی مجھ کو کہاں کہاں مرے آگے وہ نقشِ پا آیا
(ص ۹۱)

ذرا بھی چھو لو تو اُڑ جاؤں کہکشاں کی طرح
پڑا ہوا ہوں میں اک تیرِ بے کماں کی طرح (ص ۱۳۳)

کس قدر کشمکش کے بعد کھلا — عشق ہی عشق سے رہائی ہے (ص ۱۶۱)
تو بہ بدنام ہوا اسی خاطر — ساری دنیا سے آشنائی ہے (〃)

چندر نے شبدوں کے شعلے کیسی لَے میں بھڑکتے تھے
تم آکر سنتے تو سبھی کل ساری رات اُجالا تھا (ص ۱۶۷)

ہوا سے پوچھا کیا لائی ری، کہا سندیسہ لائی
کہا وہ خوش تھی، کہا نہیں، وہ ہاں کہہ کر پچھتائی (ص ۱۷۴)

ہم تو سمجھے تھے کہ ممکن ہی نہیں — شام سے روز سویرا کرنا (ص ۱۷۶)
چاہتے آپ تو کیا مشکل تھا — کسی بیمار کو اچھا کرنا (ص ۱۷۷)

ایک دنیا عجب خیالوں کی — کھویا کھویا سا اک پتا آیا (ص ۱۸۶)

'نذرِ ناصر کاظمی' (ص ۷۹) اور "سحرانیات" (ص ۱۴۸ تا ۱۵۳) بھی اس مجموعے میں خاصے کی چیزیں ہیں۔

غرض دوہے ہوں یا غزلیں اور نظمیں عالی ہر جگہ باخبر بھی ہیں اور باشعور بھی۔

کتاب کا گٹ اَپ عمدہ، کاغذ عمدہ، کتابت عمدہ، ناشر مکتبہ اسلوب کراچی، قیمت -/۳۵ روپے۔

مجموعے کا نام "لاحاصل" محلِ غور ہے۔ فن کار اپنے پیش ناموں سے اکثر بے نیاز ہو کر انھیں لاحاصل کہہ اٹھتا ہے کیونکہ اس کی نظر ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہتی ہے؛ جو کچھ اس نے حاصل کر لیا ہے اس کی نظر میں وہ پھیکا پھیکا ہوتا ہے اس کے مقابلے میں جو وہ حاصل کرنا چاہتا ہے اور جس کا رنگ روپ بھی وہ ابھی متعین نہیں کر سکتا۔ یہ اس کی فطری کبھی نہ ختم ہونے والی تڑپ اور بے قراری ہی اس کی بلندی ——— اور بلندی کی ضامن بنتی ہے، اور فنکار کے اس طرح کے "لاحاصلی" کے انفرادی احساس سے فن کے نئے سمن اور نئے نئے گلاب کھلتے ہیں۔ ہاں، کبھی کبھی فنکار کا اپنے کارناموں کو لاحاصل کہہ اٹھنا خارجی عوامل کی ایسی دم گھونٹنے والی جبر آمیز کارفرمائی کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے جس کی تابِ مقاومت فنکار بظاہر اپنے میں نہ پاتا ہو اور ایسی صورت میں بیزاری کا جذبہ جنم لیتا ہے اور برہمی کا بھی اور خود زندگی ہی کو بے معنی کہنے کا بھی۔ مگر یہ کیفیتیں سچے مگر بڑے فنکاروں کو زیادہ دیر تک مقید نہیں رکھ سکتیں۔ عالی خوش فکر شاعر ہیں، ان کا فن جوان ہے اور شاداب بھی؛ زندگی سے جو اثباتی قربت اُن کے ہاں ہے اس کے پیش نظر بآسانی کہا جا سکتا ہے کہ اردو شاعری ان سے اور بہت امیدیں رکھتی ہے۔

اردو ادب میں ہندوستان کی آزادی کے کچھ عرصے بعد

ایسی تخلیقات سامنے آئیں جن پر بحث کرتے ہوئے یہ کہا گیا کہ وہ ایک ایسے رجحان کی حامل ہیں جو سابقہ رومانی اور مخصوص ترقی پسندانہ رجحانات سے مختلف ہے۔ اس سلسلے میں بڑی بحثیں بھی ہوئیں اور پھر دو ایک مبسوط کتابیں بھی لکھی گئیں۔ اب اگرچہ وہ غلغلہ نہیں ہے مگر ضرورت تھی کہ وہ تمام مواد جو جدیدیت کی مخالفت اور موافقت میں سامنے آیا وہ یکجا کر دیا جاتا۔ "جدیدیت: تجزیہ و تفہیم" اسی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ یہ اُن مضامین پر مشتمل ہے جو مختلف ادیبوں اور شاعروں نے مختلف رسالوں اور ہفت روزہ پرچوں میں نئے ادب یا جدیدیت سے متعلق لکھے یا مختلف سیمیناروں میں پڑھے گئے۔ چنانچہ اس میں جدید ادب کے تقریباً ہر پہلو پر مختلف نقطہ ہای نظر کے بیشتر ناقدین کے مضامین شامل ہیں۔ ۶۸۰ صفحے کی یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ تفہیمان توضیحی اور نظریاتی مضامین پر مشتمل ہے جن میں نئے اردو ادب میں عام طور پر مروج اصناف سے بحث کی گئی ہے اور دوسرے حصے میں نئے افسانے، نئی غزل اور نئی نظم پر علیحدہ علیحدہ تجزیاتی مضامین شامل ہیں۔ یہ مجموعہ ڈاکٹر مظفر حنفی نے ترتیب دیا ہے اور انھوں نے اس حد تک محتاط اور غیر جانبدار رہنے کی کوشش کی ہے کہ اپنے ان مضامین ہی کو کافی سمجھا جو اس مجموعے میں شامل ہیں؛ علیحدہ سے بطور پیش لفظ کچھ لکھنا اس موقع پر مناسب نہ سمجھا۔ مناسب ہوتا کہ ہر مضمون کے ساتھ نشاندہی کر دی جاتی کہ کہاں سے

اخذ کیا گیا ہے۔ کتاب کے نام میں تجزیہ وتفہیم کے بجائے تفہیم وتجزیہ ہوتا تو بہتر تھا؛ ہر دو حصص کی ترتیب بھی اسی طرح ہے۔ کتاب کی افادیت مسلّم اور ڈاکٹر مظفر حنفی کی یہ کوشش مستحسن۔

کتابت، طباعت تسلی بخش۔ ناشر نسیم بکڈپو لکھنؤ۔ قیمت -/۵۰ روپے۔

تصحیح

جامعہ نومبر ۱۹۸۵ء کے شمارے میں صفحہ ۱۴ پر "عربی ادب میں ترجموں کا دور" کے مضمون نگار کا نام انوار الجندی کے بجائے انور الجندی پڑھا جائے۔

مراسلہ

مکرمی ایڈیٹر صاحب! تسلیم

"جامعہ" ماہ اکتوبر ۱۹۸۵ء کے شمارے میں میرا مضمون بعنوان "رزمیہ شاعری اور میرانیس" شائع ہوا ہے۔ اس مضمون کی طباعت میں کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں، ان کی تصحیح ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ناظرین یہ خیال فرمائیں کہ اصل مسودہ میں بھی یہی سہو رہے ہوں گے۔

صفحہ ۳۴ پر "تیغیں بھی چمکتی ہیں سنانیں بھی سپر بھی" اصل مصرعہ ہے۔ "ستانیں" غلط ہے۔

اس کے علاوہ مندرجہ ذیل اشعار مسدس کی شکل میں چھپ گئے ہیں جبکہ وہ متفرق اشعار ہیں۔

ص ۳۴ پر
ہم گھاٹ روکنے کے لئے آئے ہیں ادھر
ہے آج شب کو داخلۂ شمر کی خبر

لاکھوں میں کوئی قبل کوئی بعد آئے گا
گیتی ہلے گی جب عمر سعد آئے گا

کیجیے مقام گر کوئی گوشہ جدا ملے
ممکن نہیں کہ نہر پہ خیمہ کو جا ملے

یکساں ہے بر و بحر ہماری نگاہ میں — غیظ و غضب کو دخل نہیں حق کی راہ میں

کیا دشت کم ہے صابر و شاکر کے واسطے
یہ اہتمام ایک مسافر کے واسطے

ص۳۵ پر اسدِ حق کے گھرانے کا یہ دستور نہیں
میں نبی زادہ ہوں سبقت مجھے منظور نہیں

لازم ہے تم کو پاس قرآنِ مجید کا
کلمہ نبیؐ کا پڑھتے ہو تم یا یزید کا

مجھ کو لڑنا نہیں منظور یہ کیا کرتے ہو
کیوں نبیؐ زادے پہ آخر یہ جفا کرتے ہو

کرنا ہے عاجزی وہی جو حق شناس ہے
مجھ کو نبیؐ کی روحِ مطہر کا پاس ہے

مندرجہ ذیل مصرعہ میں "کھا جاتی" کی جگہ "کھاتی" شائع ہوگیا ہے (صفحہ ۳۷)

کیا جانئے ملا تھا مزا کیا زبان کو
کھا جاتی تھی ہما کی طرح استخوان کو

قارئین سے درخواست ہے کہ مندرجہ بالا تصحیح کو ملحوظ رکھیں۔

طاہر حسین
ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی-۲۵

جامعہ

سالانہ قیمت
بارہ روپے

قیمت فی پرچہ
ڈیڑھ روپے

جلد ۸۳ | بابت ماہ فروری ۱۹۸۶ء | شمارہ ۲

فہرست مضامین

خط وکتابت کا پتہ

ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

طابع وناشر: عبداللطیف اعظمی • مطبوعہ: جمال پریس دہلی ۶ • ٹائیٹل: فائن پریس دہلی ۶

شذرات

ہر سال فروری کا مہینہ آتا ہے تو مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی یاد بھی آتی ہے کہ اسی مہینے کی ۲۲ ویں تاریخ کو ان کا طائر روح جو عناصر کے قفس کا اسیر تھا، آزاد ہوا تھا۔ جامعہ کے اس شمارے میں مولانا آزاد کے فکر کی معنویت، ہندوستانی مسلمانوں کے لئے آج کیا ہے، اس موضوع پر ایک مختصر سا مضمون شامل ہے۔ اس مضمون میں جو کچھ کہا گیا ہے، اس کے علاوہ ہماری انفرادی اور جماعتی زندگی کے نہ معلوم کتنے تاریک گوشے ایسے ہیں جنھیں ہم مولانا مرحوم کے نورانی فکر و دانش اور مجاہدانہ عزم و عمل سے فیضان حاصل کر کے روشن کر سکتے ہیں۔ ذرا غور کیجئے تو بظاہر تضاد سا محسوس ہوتا ہے اس بات میں کہ تقسیم وطن سے پہلے کے برسوں میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت نے مولانا آزاد کو اپنا کسی سطح کا بھی رہنما ماننے سے انکار کر دیا تھا، ان کے خلاف ہر طرح کی باتیں کہی جاتی تھیں اور مسلمانوں کی جذباتیت کا یہ عالم تھا کہ مولانا آزاد کے بارے میں نہ صرف ان کی زبان اور ان کا ذہن ہی بگڑ گیا تھا بلکہ ان کا ہاتھ بھی "دست تطاول" بن چکا تھا۔ اس موقع پر ہمیں، ان کی تقریر کا وہ ٹکڑا یاد آتا ہے جسے ہم حرف شکایت نہیں، بلکہ ایک درماندہ رہرو کی صدائے دردناک کہہ سکتے ہیں: تقسیم کے بعد اکتوبر ۴۷ء میں مولانا نے مسجد شاہجہانی (دہلی) میں پریشان اور مضطرب مسلمانوں کے ایک بڑے اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

> "سچ پوچھو تو میں ایک جمود ہوں یا ایک دور افتادہ صدا، جس نے وطن میں رہ کر بھی غریب الوطنی کی زندگی گذاری ہے۔"
>
> "تمھیں یاد ہے، میں نے تمھیں پکارا، تم نے میری زبان کاٹ لی، میں نے قلم اٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قلم کر دئے۔ میں نے چلنا چاہا تم نے میرے پاؤں کاٹ دئے، میں نے کروٹ لینی چاہی، تم نے میری کمر توڑ دی .... میں نے تمھیں خطرہ کی شاہراہ پر جھنجھوڑا، لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف احتراز کیا بلکہ غفلت و انکار کی ساری

سنتیں تازہ کردیں۔"

اپنی اسی تقریر میں مولانا مرحوم نے آزاد ہندوستان کے مسلمانوں سے کہا تھا کہ "تذبذب کا راستہ چھوڑدو، شک سے ہاتھ اٹھالو اور بدعملی کو ترک کردو۔" یہ تین دھار کا انوکھا خنجر دو دھاری تلوار سے زیادہ جان لیوا ہے۔ آج ہم قرآن وسنت کی آفاقی اور زمان ومکان کی پہنائیوں پر حاوی تعلیمات کی دولت رکھتے ہوئے بھی زندگی اور زندگی کے تقاضوں سے ڈرتے ہیں، ہر نئی چیز کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں چاہے وہ ہماری اجتماعی زندگی کے لئے مفید ہی کیوں نہ ہو، نہ معلوم کتنے رواج، کتنے طور طریقے اور کتنی رسمیں ہیں جو قرآنی تعلیمات کے اصل اصول کے منافی ہیں، لیکن ہمیں ان سے ہاتھ اٹھا لینے میں اس لئے تامل اور تذبذب ہے کہ ہمارے باپ دادا اسی طرح کرتے آئے تھے، "غفلت و انکار کی سنتوں" کا ایک پہلو یہ بھی ہے۔ اور ہماری بدعملیاں؟ الحفیظ والاماں! ہمارا معاشرہ بداعمالیوں اور بے اعتدالیوں کا معاشرہ ہے اور مسلمانوں کا ہر طبقہ اس میخانے میں مست نظر آتا ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اٹھارویں صدی میں تفہیمات میں مسلمانوں کے مختلف طبقوں کی اخلاقی خرابیوں کو ایک ایک کرکے جتایا تھا کہ تمہارا یہ حال ہے" تم نہ بدلوگے تو تباہی یقینی ہے۔ درحقیقت تبدیلی پہلے اندر ہوتی ہے، فکرونظر کے معیار اور انداز بدلتے ہیں اور پھر اعمال میں ان تبدیلیوں کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ اس لئے بقول مولانا آزاد" اپنے گردوپیش اپنی زندگی خود فراہم کرو۔ یہ منڈی کی چیز نہیں کہ تمہیں خرید کرلادوں۔ یہ تو دل کی دکان ہی میں سے اعمال صالحہ کی نقدی سے حاصل ہوسکتی ہے۔"

اس ملک میں پہلے بھی ایسے لوگ (خصوصاً مسلمانوں میں) تھے اور آج بھی ہیں جو مولانا مرحوم کی فکرونظر کی بلندیوں کی طرف آنکھ اٹھاکر دیکھنے کے بجائے، ان کی کمزوریوں کو ڈھونڈتے تھے، اور غلط یا صحیح اگر بزعم خود ان کی کوئی کمزوری پاجاتے تھے تو بڑا شور مچاتے تھے اور افتراپردازیوں کا بازار گرم کردیتے تھے۔ ہم نے اکثر اپنے محسنوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا ہے۔ ہم نے بارہا اپنے ارباب عزیمت کی قدر اسی طرح کی ہے۔ اب تو اس خیال ہی پر ہنسی آتی ہے، لیکن ابھی تھوڑے ہی عرصے پہلے تک بعض حلقوں میں یہ غیر متعلق بات زیر بحث رہتی تھی کہ مولانا انگریزی زبان سے واقف نہ تھے

اور خواہ مخواہ دوسروں کو مرعوب کرنے کے لئے اپنی تحریروں میں انگریزی کتابوں کے حوالے دیتے تھے اور انگریزی الفاظ اور اصطلاحوں کا استعمال کرتے تھے۔ ایسی باتوں کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ یہ ثابت کیا جائے کہ مولانا عام طور پر غلط بیانی سے کام لیتے ہیں۔ حالانکہ بات ایسی نہ تھی اور جیسا کہ ہم سمجھتے ہیں صورت یہ تھی کہ مولانا نے انگریزی اپنی طالب علمی کی عمر میں نہیں پڑھی تھی۔ انھوں نے انگریزی بعد میں جیل میں سیکھی، اور چونکہ اس سے ان کا خاص مقصد جدید علوم و تمدن کا مطالعہ اور ان سے متعلق غور و فکر تھا، اس لئے انھوں نے اس باب میں خاص صلاحیت و لیاقت پیدا کر لی تھی، البتہ وہ انگریزی زبان میں گفتگو کرنے سے احتراز کرتے تھے، اس کی دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انھیں یہ گوارا نہ ہو گا کہ بولنے میں زبان کی غلطی کریں یا اچھی اور بامحاورہ زبان میں گفتگو نہ کریں، یہ خصوصیتیں مشق سے پیدا ہوتی ہیں اور انگریزی زبان میں گفتگو کی مشق کا انھیں موقع نہ ملا تھا۔

یہ واقعہ تو مشہور ہے کہ آزادی سے پہلے جب سر اسٹیفرڈ کرپس کی سرکردگی میں حکومت برطانیہ نے ہندوستان کے آئینی مسئلہ کے مطالعے اور اس کی روشنی میں اس مسئلہ کے حل کی تلاش کے لئے ایک مشن بھیجا تھا تو بحیثیت صدر کانگرس مولانا آزاد سے کرپس کی کئی ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ ان ملاقاتوں میں مسٹر آصف علی مولانا آزاد کے خیالات کی ترجمانی (انگریزی میں) کے لئے ان کے ساتھ شریک رہتے تھے۔ اور خود یہ آصف علی مرحوم کا بیان ہے کہ جب کبھی ان سے ترجمانی میں کوئی غلطی ہو جاتی تھی یا صحیح صحیح الفاظ میں وہ ترجمانی نہ کر پاتے تھے تو مولانا ان سے کہتے تھے کہ "نہیں، میرے بھائی، میں نے یہ نہیں کہا ہے۔ میں یہ کہہ رہا ہوں اور اس کے لئے آپ یہ الفاظ (انگریزی کے) استعمال کیجئے۔" مولانا جب وزیر تعلیم تھے تو فائلوں پر تمام نوٹنگ انگریزی میں ہوتی تھی، اور ان کی روشنی میں ان کے احکامات خوشخط اردو میں لکھے ہوتے تھے جن کا ترجمہ ان کے پرائیویٹ سکریٹری تحریر کر دیتے تھے۔ کبھی مولانا اپنے احکامات انگریزی میں بھی لکھ دیتے تھے۔

مولانا مرحوم کا جب انتقال ہوا اور ان کا جنازہ اٹھا تو بڑی دھوم سے اٹھا کہ یہ عاشق کا جنازہ تھا، مرنے والا عاشق تھا حریت فکر کا، آزادی عمل کا، ملک و ملت کا، اعلا اخلاقی اقدار کا، صاف ستھری

پبلک لائف کے آدرش کا، وہ عاشق تھا حقوق انسانی کا، عدل وانصاف کا، پسماندہ اور اقلیتی طبقوں کے حقوق کا ــــــ اسی لئے اس کے جنازہ میں لاکھوں مسلمان، ہندو، عیسائی، سکھ، ہر طبقے اور ہر علاقے کے شریک تھے، نہ معلوم کتنے سکھ اور عیسائی یہ کہہ کر روتے ہوئے دیکھے گئے کہ "آج ہمارا سہارا اٹھ گیا۔" مولانا کو اقلیتیں، مذہبی اور لسانی اقلیتیں، اپنے حقوق کا سب سے بڑا محافظ سمجھتی تھیں، ان لسانی اقلیتوں میں اینگلو انڈین کمیونٹی بھی شامل تھی جن کے پبلک اسکول کی بقا کی ذمہ داری مولانا نے لی تھی کہ ان اسکولوں کا اور انگریزی زبان کا ملک وقوم کی سیاسی، تہذیبی، علمی اور تمدنی زندگی میں ایک اہم رول تھا، مولانا کہا کرتے تھے کہ آج جب ہمارے ہاتھوں میں اقتدار ہے، کسی طبقے کو ایک لمحے کے لئے اس کا احساس بھی نہیں ہونا چاہیئے کہ اس کی زبان اور کلچر یہاں غیر محفوظ ہے۔ ہم اندازہ کرسکتے ہیں کہ حکومت، کانگرس اور ملک میں ایسے طاقتور عناصر کی فعال موجودگی میں جو اس ملک کو محض اکثریت کا ملک سمجھتے تھے، مولانا کا کام کتنا مشکل رہا ہوگا، لیکن ایسے ماحول میں بھی مولانا نے عزیمت کا ثبوت دیا اور اپنے موقف پر جمے رہے۔ ہاں، اس ملک میں ہم مسلمانوں کی ایک اقلیت ضرور ایسی تھی جس کے افراد کی ایک بڑی جماعت ایک عرصہ تک مولانا کی شخصیت اور ان کے مجاہدانہ موقف کو اپنے حقوق کے تحفظ کا سہارا سمجھنے سے انکار کرتی رہی۔ البتہ مرحوم کے اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد اسے اپنے زیاں کا احساس ہوا مگر اب تو پچھلی کج فہمیوں کا کفارہ بھی نہیں ادا ہو سکتا تھا!

ضیاء الحسن فاروقی

افکار آزاد کی معنویت

(آزاد ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے)

اکتوبر ۱۹۴۷ء میں دہلی کی مسجد شاہجہانی میں مسلمانوں کے ایک بڑے اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

> "آج بھی کہ ہم ایک دور انقلاب کو پورا کر چکے ہیں، ہمارے ملک کی تاریخ میں کچھ صفحے خالی ہیں اور ہم انھیں صفحوں میں زیب عنوان بن سکتے ہیں، مگر شرط یہ ہے کہ ہم اس کے لئے تیار بھی ہوں... عزیزو، یہ نہ کہو کہ ہم اس تغیر کے لئے تیار نہ تھے بلکہ اب تیار ہو جاؤ۔ ستارے ٹوٹ گئے لیکن سورج تو چمک رہا ہے، اس سے کرنیں مانگ لو اور ان اندھیری راہوں میں بچھا دو جہاں اُجالے کی سخت ضرورت ہے.... آؤ عہد کرو کہ یہ ملک ہمارا ہے، ہم اس کے لئے ہیں اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے رہیں گے۔"

آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد، اپنی پوری زندگی مولانا نے اسلامیان ہند کو ہندستان کی تاریخ میں زیب عنوان بن جانے کی دعوت دینے ہی میں گزار دی۔ یہ کہانی دردناک ہے کہ ان کے پیغام کا کیا انجام ہوا لیکن یہاں اس کے دہرانے کا موقع نہیں، ہمیں تو اب یہ دیکھنا ہے کہ آزاد ہندوستان میں مولانا کے افکار سے ہمیں کیا روشنی مل سکتی ہے اور ہم اپنے آپ کو ملک و ملت کے لئے کس طرح مفید بنا سکتے ہیں۔

مولانا آزاد تقلید کے مخالف اور اجتہاد کے حامی تھے۔ لیکن عجیب معاملہ ہے کہ ہم ہندی مسلمان ان کی عظمت کا اعتراف واحترام کرنے کے باوجود عملاً تقلید کے حامی ہیں اور اجتہاد کی بات سن کر صرف مسکرا کر رہ جاتے ہیں۔ تغیر نظام کائنات کا اصل اصول ہے اور اس تغیر کا اثر انسان کی زندگی اور طرز فکر پر بھی پڑتا ہے اور پڑنا چاہیئے، لیکن ایسے مذہبی معاملات میں جن کا تعلق عقائد سے نہیں بلکہ معاشرتی تقاضوں سے ہے، ہندستانی مسلمان "تغیر" کو ایک ہوّا تصور کرتے ہیں اور محض منفی رویّے اور دفاعی موقف میں اپنی بھلائی دیکھتے ہیں۔ طرز کہن پر آنکھ بند کر کے اس طرح اڑنا نہ تو اسلام کی خدمت ہے اور نہ مسلمانوں کی، مولانا آزاد اس رمز سے خوب واقف تھے اور مسلمانوں کو بار بار یاد دلاتے تھے کہ زندہ قومیں تسلسل اور تغیر میں توازن کا اصول مدنظر رکھتی ہیں اور زندگی کو ہر لحظہ رواں، دواں اور جواں رکھتی ہیں۔

مولانا آزاد کے نزدیک "قصۂ قدیم و جدید" دلیل کم نظری ہے۔ سماجی علوم اور نیچرل سائنسز کی ترقی کی دھوم دھام اور ہنگاموں میں قدیم اور جدید کی خوب بحثیں چھڑیں، مذہبی لوگ عموماً قدیم قرار پائے اور علوم جدیدہ اور سائنس کے متاثرین ومبلغین جدید، حالانکہ مذہب اور سائنس میں کبھی کوئی تضاد نہیں رہا ہے اور اسلام نے ہمیشہ علمی نقطۂ نظر کو سراہا اور اس کی ترغیب دی ہے۔ مولانا آزاد کے تصور انسان کے پس منظر میں یہی نظریہ تھا، مولانا کا تصور انسان کیا تھا، اسے انھوں نے دسمبر ۱۹۵۱ء کے یونیسکو سمپوزیم میں جس کا موضوع "مشرق ومغرب میں انسان کا تصور اور فلسفۂ تعلیم" تھا، اپنی افتتاحی تقریر میں پیش کیا تھا۔ یہاں اس تقریر کے بعض حصوں کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔ مولانا نے اس موقع پر کہا تھا:

گزشتہ چھ ہزار یا اس سے زیادہ برسوں میں انسان نے مستقل اور مسلسل ترقی کی راہیں، گوناگوں دشواریوں اور نشیب وفراز کے باوجود، طے کی ہیں اور اپنی تلاش اور جستجو سے فطرت کے چھپے چہرے پر سے یکے بعد دیگرے نہ معلوم کتنے پردے اٹھائے ہیں اور فطرت کے وہ اسرار جو معلوم نہیں ہیں اس کی سعی پیہم کے سامنے سپر ڈالنے کے لئے آمادہ ہیں، لیکن فطرت کی اس کامیاب اور مسلسل تسخیر کے ساتھ کیا ہم اتنے ہی اعتماد سے دعویٰ کر سکتے ہیں کہ انسان کو اپنی فطرت کے خدوخال کی نقاب کشائی میں بھی اتنی ہی کامیابی ہوئی ہے؟ کیا ہزاروں برس کی تلاش وجستجو کے

بعد آج وہ اپنے آپ کو ویسا ہی دیکھتا ہے جیسا کہ وہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم سب کو اس معاملہ خاص میں انسان کی شکست کا المناک اعتراف ہوگا۔ اس نے جو آئینہ بنایا اس میں سبھی کچھ دکھائی دیتا ہے سوائے اس کے اپنے اندرون کے۔ انسان کیا ہے، کہاں سے آیا ہے اور اس کو کہاں جانا ہے؟ یہ سوالات آج بھی سوالات ہی ہیں۔ تین ہزار سال سے زیادہ مدت کی فلسفیانہ کاوشوں کے بعد بھی عام طور پر ان کا جواب نہیں تلاش کیا جا سکا۔ ظاہر ہے کہ انسان فرد، سماج، قوم اور بین الاقوامی تعلقات کے مسائل کا قابل اطمینان حل نہیں ڈھونڈ سکتا جب تک اُسے خود اپنی ذات اور فطرت کا علم نہ ہو اور وہ یہ صاف صاف نہ جان سکے کہ کائنات کی وسعتوں میں اس کا اپنا مقام کہاں ہے۔

مولانا نے اپنی تقریر میں مشرق و مغرب کے فلسفیانہ فکر کی مخصوص خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے اس وحدت کا اعتراف کیا ہے جو دنیا میں انسانی فکر اور طرز استدلال میں پائی جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عقل انسانی ایک اور یکساں ہے۔ جذبات انسانی زیادہ تر ایک جیسے ہیں، دنیا میں ہر جگہ ایک ہی جیسے حالات میں ارادۂ انسانی کم و بیش ایک ہی طرح کار فرما ہوتا ہے۔ اسی طرح زندگی کے نامعلوم اسرار سے متعلق ہر جگہ کم و بیش ایک ہی جیسا طرز تصور رہا ہے۔ اولمپس کے یونانی اور وادی ہمالیہ کے ہندوستانی اپنے اپنے غور و فکر اور مراقبوں میں ایک ہی جیسے احساسات اور داخلی تجربے سے گزرے ہیں۔ لیکن اس وحدت کے باوجود دنیا کے مختلف فلسفوں نے فطرت انسانی کے مختلف پہلوؤں پر زور دیا اور وہی ان کا امتیازی نشان قرار پایا۔ ہندوستانی فلسفے نے اپنی توجہ کا مرکز انسان کے باطنی تجربے کو بنایا اور ایک گہری پوشیدہ حقیقت سے اس کے اٹوٹ رشتے پر زور دیا۔ یونان میں فلسفیوں کی دلچسپی کا خاص موضوع عالم خارجی میں انسان کے مقام اور مرتبے کی تلاش تھا۔ چینی فلسفے نے ان دونوں سے الگ انسانوں کے باہمی رشتوں کو سمجھنے پر اپنی توجہ مرکوز کی۔ فلسفوں کے مخصوص رجحانات نے دنیا کے مختلف حصوں میں بعد کے فلسفیانہ طرز فکر کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ عیسائیت اور یونانی فکر کے اس دھارے کے مابین جس کا آغاز ارسطو سے ہوا تھا، ایک عرصے تک بڑی کشمکش رہی۔ لیکن مدتوں عیسائیت اور افلاطونی فکر مغربی فکر میں ایک طاقتور عنصر بنا رہا۔ آج صورت حال یہ ہے کہ اگرچہ مغربی فلسفے میں ایک مضبوط مذہبی عینیت پرستانہ رو پائی جاتی ہے، عہد جدید کے آغاز ہی سے رفتہ رفتہ فکر کی

س روئے نے ایک ایسے فلسفیانہ نظریے کے سامنے سپر ڈال دی ہے جس پر سائنس کے نظریوں کا غلبہ ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مغرب میں مادیت پرستانہ سائنسی علمی مزاج کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ انیسویں اور بیسویں صدی اس طرز فکر کے عروج کا زمانہ ہے۔ اس دور میں ڈارون نے وجود انسانی کے بارے میں نظریۂ ارتقار کو اپنی فکر کی اساس قرار دیا۔ مارکس نے کہا کہ انسان اور اس کی تاریخ تمام تر مادی اور خارجی حالات کی پیداوار ہے۔ فرائڈ نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور بتایا کہ نہ صرف یہ کہ انسان کے آبا و اجداد حیوان تھے بلکہ اس کی ذہنیت آج بھی اُن جبلتوں کی تابع ہے جو اس کے ابتدائی حیوانی آغاز میں اس پر مسلط تھیں۔

مشرق میں انسان کا جو تصوّر رہا ہے اس کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا نے انسان سے متعلق ویدانت اور تصوف کے روحانی تصور کے اثرات کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ تصور جدید مغرب کے مادی تصور کی کلیتہً ضد ہے۔ پھر انھوں نے یہودی اور عیسائی مذہب کے حوالے سے یہ بتایا ہے کہ انسان میں الوہی صفات کا پر تو موجود ہے اور قرآن کریم میں تو اسے خلیفۃ اللہ فی الارض کہا گیا ہے اور بار بار بتایا گیا ہے کہ پوری کائنات اس کے لئے مسخر کردی گئی ہے۔ اس طرح مشرق میں انسان کا مقام اتنا بلند قرار پایا کہ اس کے علم اور قوت تسخیر کی کوئی انتہا نہیں رہی۔

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ویدانت اور تصوف نے انسان کو اس قدر بلند مرتبہ دینے کے بعد اس کے ذہن کو تقدیر پرستی سے محفوظ رکھنے کا کوئی مداوا نہیں کیا، تقدیر پرستی جو انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کو محدود کر دیتی ہے۔ جب انسان بحر حقیقت کا ایک قطرہ ہے تو وہ جو کچھ کرتا ہے یا نہیں کرتا، سب امر الٰہی ہے۔ ذرا غافل ہو کر اس خیال سے ایک قدم آگے بڑھائیے تو انسان تقدیر کے ہاتھ میں ایک بے بس کھلونا معلوم ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سیکولر اور دنیوی سطح پر یہ خیال انسان کی ترقی کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ بنتا رہا ہے۔ جب کوئی سماج اس خیال کو اپنا لیتا ہے تو اسے انسانی مصائب اور محرومیاں فریب نظر کے سوا اور کچھ نہیں معلوم ہوتیں اور وہ سماج بے حسی کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے مشرقی سماجوں کو اکثر سماجی و اقتصادی پسماندگی کے دور کرنے کے سلسلے میں غافل

اور بے حس پایا ہے۔

اور دوسری طرف مغرب میں جہاں مادیت اور تاریخ کی جبریت کے نظریے کا تقاضا یہ ہونا چاہئے تھا کہ زندگی کے بارے میں ایک جبری عقیدے کی کارفرمائی ہوتی اور انسان خارجی قوتوں کے سامنے بالکل بے بس ہو کر رہ جاتا، انسان کے ذہن نے اس جبریت کے خلاف بغاوت کی اور اپنی تخلیقی توانائیوں کا ایسا ثبوت دیا کہ اس سے پہلے کبھی ایسا دیکھنے میں نہیں آیا۔

مولانا انسان سے متعلق ان دونوں نظریوں کا جنھوں نے مشرق اور مغرب میں فلسفے اور مذہبی تصورات کو بھرپور طور پر متاثر کیا ہے، امتزاج چاہتے تھے۔ ایسا ہو جائے تو سائنس کے غلط استعمال کا کوئی خطرہ نہ ہوگا، دوسری طرف اس سے تقدیر پرستی اور جبری عقیدے سے پیدا ہونے والی بے بسی سے بھی نجات مل جائے گی۔ مولانا کے خیال میں انسان کے بلند مرتبے سے متعلق مشرق کا تصور نہ صرف مغرب میں سائنس کی ترقی سے ہم آہنگ ہے، بلکہ حقیقت میں اس امر کی قابل فہم تشریح ہے کہ کیسے عظیم الشان سائنسی ترقیاں ممکن ہیں۔ اگر انسان محض ایک ترقی یافتہ حیوان ہے تو پھر اس کی ترقی کی ایک حد ہوگی لیکن اگر اس خاک کے پتلے میں روح الٰہی کا کوئی عنصر داخل ہے تو پھر اس کی ترقیوں کی کوئی انتہا نہیں۔

مولانا آزاد کا یہ فکر جدید ہندوستان میں جہاں عہد جدید کی سیاسی و سماجی اقدار کو آئین حکومت کی اساس قرار دیا گیا ہے۔ ہماری مشترک قومی زندگی کا فلسفۂ حیات بن سکتا ہے۔ اسی طرز فکر کو پروفیسر آل احمد سرور نے اپنے ایک مضمون میں ”نئی مشرقیت“ سے تعبیر کیا ہے۔ اس میں انسان کا جو مقام ہے وہ قرآنی تعلیمات سے ہم آہنگ ہے، اس لئے اس فلسفۂ حیات کی بنیاد پر مشترک قومی زندگی کی تشکیل میں مسلمان اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ درحقیقت آج جبکہ نیوکلیائی جنگ کی تلوار ہمارے سروں پر لٹک رہی ہے اسی میں عالم انسانیت کی فلاح ہے، اسی میں ہماری بقا اور مادی و اخلاقی ترقی کے امکانات ہیں۔

مولانا آزاد نے اپنی اس تقریر میں فکر انسانی، جذبات انسانی اور عقل انسانی کی وحدت کا ذکر کیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں درحقیقت انھوں نے وحدت انسانی سے متعلق اسلامی نقطۂ نظر ہی کو بیان کیا ہے۔ اسی کے ساتھ ہمیں مولانا کے وحدت دین کے نظریے کی یاد آتی ہے جیسے

نے ترجمان القرآن میں بڑی بلند آہنگی اور پوری قوت استدلال سے بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ
عظیم قرآن کی دعوت کی سب سے پہلی بنیاد ہے۔" لیکن اسی اصل عظیم سے سب سے زیادہ
کیا گیا ہے۔ یعنی ایک ہی جامۂ انسانیت اور ایک ہی خدا کی عبودیت و نیاز کی راہ میں تمام
کو ایک اور متحد ہو جانے کی تعلیم۔ مولانا نے اس بات کو بھی نمایاں اور واضح کیا ہے کہ "قرآن
نسان کے لئے دینی عقائد و اعمال کا جو تصور قائم کیا ہے اس کی بنیاد بھی (تمام کارخانۂ ہستی
) تمام تر رحمت و محبت ہی پر رکھی ہے۔" پھر قرآن نے یہ حقیقت بھی واضح کر دی ہے کہ "خدا
کے بندوں کا رشتہ محبت کا رشتہ ہے اور سچی عبودیت اسی کی عبودیت ہے جس کے لئے
صرف معبود ہی نہ ہو، بلکہ محبوب بھی ہو۔" لیکن بندے کے لئے خدا کی محبت کی عملی راہ
؟ (قرآن) کہتا ہے: خدا کی محبت کی راہ اس کے بندوں کی محبت میں سے گذری ہے۔
ن چاہتا ہے خدا سے محبت کرے، اسے چاہئے کہ خدا کے بندوں سے محبت کرنا سیکھے۔"

۲۵: ۱۷۷، سورہ ۷۶: ۸-۹ اور حدیث قدسی یا ابن آدم! مرضت فلم تعدنی...؟
القرآن۔ تفسیر سورہ فاتحہ)

اسی کے ساتھ اس کارخانۂ ہستی میں عدل و توازن کا جو اصول کارفرما ہے وہی اصل عظیم
و تحسین کے تمام حقائق کی۔ یہاں "بناؤ، سلجھاؤ، خوبی اور جمال میں سے جو کچھ بھی ہے اس
کچھ نہیں ہے کہ عدل و توازن کی حقیقت کا ظہور ہے۔ مولانا نے قرآن کی اس تعلیم کی وضاحت
ہے: "جب عدالت کا یہ قانون کائنات خلقت کے ہر گوشے میں نافذ ہے تو کیونکر ممکن
انسان کے افکار و اعمال کے لئے بے اثر ہو جائے! پس اس گوشے میں بھی وہی عمل مقبول ہوتا
افراط و تفریط اور میل و انحراف کی جگہ فطرت کے عدل و قسط پر مبنی ہوتا ہے اور اسی کو وحی الٰہی
صالح' سے تعبیر کرتی ہے۔"

یہ ہم جو جدید کاری کی بات کرتے ہیں وہ محض ایک خاص سیاق و سباق میں کرتے ہیں اور
بحث میں قدیم و جدید کے قضیے چھیڑ دیتے ہیں۔ اب تک اوپر جو کہا گیا ہے وہ ہر لحاظ سے
ہے اگر ذہن پر پہلے ہی سے اس غیر متوازن خیال کا قبضہ نہ ہو کہ جہاں قرآن و رسولؐ
کے حوالے سے کوئی بات کہی گئی، وہ فوراً قدیم، رجعت پرستانہ یا ظلمت پسندانہ ہو گئی،

اور یوں بھی یہ خیال انتہا پسندانہ اور گمراہ کن ہے کہ جو چیز قدیم ہوگی وہ بہر صورت بُری اور قبیح ہوگی۔ مولانا آزاد فکر و فلسفے اور مذہب و عقیدے کی سطحوں پر کتنے ہی جدید وسیع النظر اور انسان دوست کیوں نہ ہوں لیکن چونکہ وہ مادیت، خدا بیزاری، تاریخی عوامل کی جبریت اور مغرب کے سماجی اور عمرانی اداروں اور اصطلاحوں کے حوالے سے اپنی بات نہیں کہتے اور ان کی کمزوریوں کا ذکر بھی کر دیتے ہیں، اس لئے نہ تو وہ جدید ہیں، نہ وسیع النظر اور نہ انسان دوست۔ اب اس مغرب زدہ ذہنیت کی علامیت کو کیا کہیئے!

مولانا آزاد کے نزدیک اسلام قومیت، جمہوریت اور سیکولرزم کی راہ میں حائل نہیں۔ ایک مسلمان سچا محب وطن ہو کر بھی سچا مسلمان رہ سکتا اور اسلام کی عظیم بالشان خدمت کر سکتا ہے۔ جمہوری نظام حکومت میں ہر شہری کو فکر و خیال، اظہار خیال، ضمیر اور عقیدہ و مذہب کی آزادی کا بنیادی حق حاصل ہوتا ہے۔ آزاد ہندوستان میں سیکولرزم کا جو تصوّر اپنایا گیا ہے اس کی بنیاد الحاد و خدا بیزاری پر نہیں ہے اور تاریخی و تہذیبی اعتبار سے ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مختلف مذاہب کے ماننے والے ہوں، جہاں نوع بہ نوع تہذیبی مظاہر ہوں اور جہاں روحانی اقدار صدیوں کے تہذیبی سرمایے میں ایک بنیادی عنصر بن کر رہی ہوں، سیکولرزم کا یہی تصوّر مفید اور نتیجہ خیز ہو سکتا تھا۔ اسی طرح مولانا نے "قرآن اور سوشلزم" کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے اُس سے بھی بہت کچھ سوشلزم سے متعلق اسلامی موقف کی تشریح ہوتی ہے۔ (ترجمان القرآن سورہ توبہ کے تشریحی نوٹ)۔ اس طرح آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے مولانا آزاد کے افکار کی بڑی گہری معنویت ہے اور ان افکار سے فیض حاصل کر کے ہندی مسلمان آج بھی اپنے ملک کی تاریخ کے صفحات میں زیب عنوان بن سکتے ہیں۔

مسعود انور علوی کاکوروی

ادب عربی کا مفہوم اور اس کے معانی کا ارتقا

قبل اس کے کہ ادب عربی کے مفہوم ومعنی میں مختلف ادوار میں ہونے والی تبدیلیوں پر اجمالاً روشنی ڈالی جائے، مختصراً لفظ 'ادب' کو سمجھ لیا جائے کہ اس کے کیا معنی ہیں۔ سید شریف جرجانی نے تعریفات میں لکھا ہے "الادب عبارۃ عن معرفۃ ما یحترز بہ عن جمیع انواع الخطاء"۔ ادب ان تمام معلومات پر بولا جاتا ہے جن کے ذریعہ ہر قسم کی غلطی سے محفوظ رہا جا سکے۔ کشف الظنون میں ہے کہ ادب وہ علم ہے جس کے ذریعہ عربی زبان بولنے اور لکھنے میں غلطیوں سے محفوظ رہا جائے۔ بطلیوسی کا کہنا ہے کہ ادب دو قسم کا ہے ایک کا تعلق نفس انسانی سے ہے اور دوسرے کا علم سے۔ صاحب قاموس لکھتے ہیں "الادب محرک الذی یتادب بہ الادیب من الناس سمی بہ لانہ یودب الناس الی المحامد وینہاھم عن المقابح واصل الادب الدعا" ادب ایسا محرک ہے جس کے ذریعہ ادیب لوگوں کو اچھے اخلاق سکھاتا ہے اسی وجہ سے اس کا نام ادیب پڑ گیا کہ وہ لوگوں کو محامد کی سمت بلاتا اور مقابح (برائیوں) سے روکتا ہے۔ ادب کی اصل بلانا ہے۔

علما کا ایک بڑا طبقہ کہتا ہے کہ یہ ان تمام علوم ومعارف اور جملہ معلومات پر حاوی ہے جو

جناب مسعود انور علوی کاکوروی صاحب، ۶۰ کویت ہاؤس سلیمان ہال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

انسان تعلیم وتدریس کے ذریعہ حاصل کرتا ہے ۔ اس میں صرف ونحو، بلاغت ، شعر ونثر، امثال وحکم وغیرہ سب شامل ہیں ۔

ابن قتیبہ نے ادب الکاتب میں لکھا ہے کہ ایک ادیب کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ریاضیات اور صنائع سے روشناس ہو ۔ علما و ماہرین لغت نے لکھا ہے کہ ادب کا اطلاق ہر اس لفظ پر ہوسکتا ہے جس کے ذریعہ انسان اخلاق و آداب سیکھے، تعلیم وتربیت حاصل کرے اور نفس کو مہذب اور شائستہ بنا کر کردار کی بلندی پیدا کرے ۔

ادب کوئی نظریاتی چیز نہیں بلکہ فطری ہے ، وہ فطرت کی عکاسی کرتا ہے ۔ ایک خارجی اور داخلی حقیقت ہے وہ معاشرے میں پژمردگی کو دور کرتا ہے ۔ عظیم ادب اپنے خالق کی شخصیت کا مکمل آئینہ دار ہوتا ہے وہ زندگی کی ترجمانی کرتا ہے اور بیک وقت ماضی کی یادگار ، حال کا آئینہ دار اور مستقبل کا نقیب ہوتا ہے ۔ نفس انسان میں شائستگی ، افکار وخیالات میں روشنی ، احساسات میں نزاکت اور زبان میں سلاست و زور پیدا کرتا ہے ۔ وہ افکار و جذبات کا خلاصہ اور انسانی عقول ونفوس اور عقول و اجسام پر حکمرانی کرنے کا ایک موثر ذریعہ بھی ہے ۔ وہ ایسی موثر حقیقت ہے جو انسانوں کے احساسات پر قابو پاکر ان کو اپنا مطیع اور تابع کرلیتی ہے ۔ اس کے ذریعہ قوموں کے دلوں کو صیقل کیا جاتا ہے اور ان کے اخلاق و کردار میں نکھار پیدا کیا جاتا ہے ۔

اب مختصراً مختلف ادوار میں اس کے معانی ومفاہیم میں تغیر اور ارتقاء پر روشنی ڈالی جائے ۔

جاہلی دور : ایک عام خیال عرصہ تک رہا ہے کہ زمانہ جاہلیت ، قبل اسلام اور صدر اسلام میں یہ لفظ نہیں پایا جاتا لیکن ایسے بکثرت اقوال ملتے ہیں جن میں لفظ ادب مستعمل ہوا ہے اس بنا پر ان سے صرف نظر ممکن نہیں ۔ لفظ ادب مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ لفظ دفعتاً معرض وجود میں نہیں آیا بلکہ عرصے سے موجود تھا اور بعد میں کچھ وسعت کے ساتھ ان ہی معنی میں ادا کیا جانے لگا جن میں ابتدائے اسلام میں مروّج تھا ۔ اس سے یہ بھی توثیق ہوتی ہے کہ یہ لفظ عہد نبویؐ، دور صحابہؓ اور زمانہ جاہلیت میں معروف تھا ۔

چند مثالوں سے اس کا تجزیہ کیا جائے کہ جاہلی دور میں لفظ ادب کن معانی میں مستعمل و مروّج تھا۔ ان کے نزدیک ادب سے مراد سنت تھی یعنی وہ طریقہ کار جو متقدمین اپنائیں اور ان کے بعد وہ متاخرین کے لئے لائحہ عمل اور ان کا مسلک بن جائے۔ ان کے یہاں اخلاق سے مراد اپنے اسلاف کی پیروی اور ان کے طرزِ عمل کی تقلید کرنا تھی۔ اس پر وہ فخر کرتے تھے۔

اسی سنت و سیرت کے معنی میں لفظ ادب کو سہم بن حنظلۃ الغنوی نے یوں ادا کیا ہے:

قد یعلم الناس انی من خیارھم   فی الدین دینا و فی احسابھم حسبا
لا یمنع الناس منی ما اارادت ولا   اعطیھم ما ارادوا حسن ذا ادبا

لوگ خوب جانتے ہیں کہ میں دین میں دین کے اعتبار سے اور حسب میں حسب کے اعتبار سے ان کے پسندیدہ لوگوں میں سے ہوں۔ وہ مجھے نہ میرے مقصود سے روکیں گے اور نہ میں انھیں وہ چیز دوں گا جو وہ چاہیں (اچھی سیرت)۔"

ادب دأب سے مشتق ہے جس کے معنی عادت و سیرت کے ہیں امرؤالقیس ایک شعر میں کہتا ہے۔

کدأبک من ام الحویرث قبلھا
وجارتھا ام الرباب بماسل

"اس کے ساتھ تیرا وہی حال (عادت) ہے جو اس سے قبل ام حویرث اور ام رباب (اس کی پڑوسن) کے ساتھ ماسل مقام پر تھا۔"

نعمان بن منذر نے شہنشاہ ایران کے پاس ایک وفد بھیجا جس کا ذکر اپنے خط میں یوں کیا:

"وقد اوفدت ایھا الملک رھطا من العرب لھم فضل فی احسابھم
وانسابھم وعقولھم وآدابھم" الخ

"اے بادشاہ میں آپ کے پاس عربوں کا ایک ایسا گروہ بھیج رہا ہوں جن کے حسب ونسب، عقلوں اور سیرتوں میں بزرگی ہے۔"

یا علقمہ بن علاثہ کی کسریٰ کے روبرو گفتگو۔ "۔۔۔ کلھم الی الفضل منسوب وبالشرف وبالسودد موصوف وبالرای الفاضل والادب معروف" الخ

"وہ تمام کے تمام فضل سے منسوب، شرف وسیادت سے متصف اور اصابت رائے اور اچھی سیرت کے حامل ہیں۔"

عہد اسلام: جب ہم عہد رسالت کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہمیں لفظ "ادب" اس صورت میں نہیں ملتا بلکہ اس کے مشتقات ملتے ہیں۔ حضرت علیؓ سے رسولؐ نے ان کے استفسار پر جواباً ارشاد فرمایا کہ "ادبنی ربی فاحسن تادیبی" میرے پروردگار نے مجھے ادب سکھایا اور اچھا ادب سکھایا۔ یہاں ادبنی سے مراد علمنی ہے کہ مجھے تعلیم دی۔ کیوں کہ اس کے وہ معنی نہیں یعنی ادب و تہذیب سکھانا بلکہ اس کا مطلب ہے فصاحت و بلاغت کیوں کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ انک لعلی خلق عظیم۔ اے محمدؐ آپ بہترین خُلق ہیں۔

دوسرا قول حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا "ان ھذا القرآن مادبۃ اللہ فی الارض فتعلموا من مادبتہ" قرآن زمین میں اللہ تعالیٰ کا دسترخوان ہے اس کے دسترخوان سے (جتنا جی چاہے) سیکھو۔

اس قول گرامی میں مادبۃ کا لفظ آیا ہے جو اسم ظرف ہے اور جس کا مادہ ادب ہے۔ یہاں بہ طور تشبیہ استعمال ہوا ہے کیوں کہ قرآن کریم اخلاق و حکمت اور پند و نصائح سے بھرا ہوا ہے۔ یہ تمام کے تمام تزکیہ نفس، جلاء باطن اور اصلاح سے متعلق ہیں۔

عہد رسالت میں اس سے عمدہ اخلاق اور وہ آثار مراد لئے جاتے تھے جو ان کے نتیجے میں معرض وجود میں آتے ہیں۔

اموی عہد: خلفائے راشدین کے بعد جب اموی دور کا آغاز ہوتا ہے تو یہ لفظ صحیح معتبر اور ناقابل تردید تاریخ میں داخل ہوجاتا ہے۔ اس دور میں اس کا استعمال عام ہوگیا تھا۔ اس لفظ سے متعدد الفاظ مشتق ہوتے ہیں۔ ان کے معانی ایک دوسرے سے ممتاز ہوجاتے ہیں۔ اس دور میں یہ لفظ تعلیم و تربیت کے ایک منفرد ذریعہ کے لئے بطور اصطلاح استعمال ہونے لگا۔ اس کی وجہ سے ممتاز اساتذہ کے لئے ایک پیشہ وجود میں آیا جس کے ذریعہ وہ امراء و خلفاء اور اعیان سلطنت

کی اولاد کی تعلیم و تربیت اور نگہداشت میں مصروف نظر آتے ہیں۔ یہ اساتذہ مؤدبین کہلاتے تھے۔ مثلاً ابو معبد الجہنی اور عامر شعبی عبدالملک بن مروان خلیفۂ وقت کے بچوں کو تعلیم دیتے تھے۔ صالح بن کیسان حضرت عمر بن عبدالعزیز کے بیٹوں کے مودب تھے۔ جعد بن درہم مروان بن محمد کے واسطے مودب کے فرائض انجام دیتے تھے۔ وہ لوگ ادب کا اطلاق تربیت اور عقل انسانی کو مہذب بنانے کے معانی پر کرتے تھے۔ قبیلہ فزارہ کا ایک شاعر کہہ اٹھتا ہے:

اکنیہ حین اناد یہ لاکرمہ ولا القبہ والسوءۃ اللقب

کذلک ادبت حتی صار من خلقی انی وجدت ملاک الشیمۃ الادب

جب میں اسے پکارتا ہوں تو اس کی عزت و تعظیم کی وجہ سے لقب سے نہیں کنیت سے پکارتا ہوں اس لئے کہ اس کا لقب بُرا ہے۔ مجھے (اچھی طرح) ایسے ادب سکھایا گیا کہ وہ میرے خلق کا ایک حصہ بن گیا تمام عادتوں کی جڑ میں ادب سمایا ہوا ہے۔

ام ثواب ہزانی کا شعر ہے ؎

انشا یمزق اثوابی یودبنی العبد شیبی عندی یبتغی الادبا

وہ مجھے مہذب بنانے کے لئے میرے کپڑے چاک کرنے لگا کیا بڑھاپے کے بعد وہ میرے لئے ادب و تہذیب کا چاہنے والا ہے یعنی ادب و تہذیب تو بچپن ہی سے سکھائی جاتی ہے نہ کہ بڑھاپے میں۔

شاید اسی وجہ سے بنو امیہ کے شاعر عبداللہ بن المخارق نے کہا:

ان الغلام مطیع من یودبہ ولا یطیعک ذوسن لتادیب

یقیناً لڑکا اپنے ادب سکھانے والے کا مطیع ہوگا لیکن بوڑھا ادب سیکھنے میں تمہارا کہا نہ مانے گا۔

عرفت اللیالی بوسہا ونعیمہا وحنکنی صرف الزمان وادبا

میں نے راتوں کی سختیاں و نعمتیں جان لی ہیں۔ زمانہ کی گردش نے مجھے مہذب و باعزت بنا دیا۔

ابو زکریا التبریزی کا قول ہے کہ

"الادب اسم لما یفعلہ الانسان فیتزین بہ فی الناس"

ادب اس چیز کا نام ہے جسے انسان اپنائے اور لوگوں میں اس کی وجہ سے ممتاز ہو۔

عبدالملک بن مروان نے اپنے بچوں کے استاد سے کہا "علمھم الشعر یمجد وا وینجدوا"۔ انھیں شاعری سکھاؤ تاکہ یہ شریف، بزرگ اور بہادر ہو جائیں۔

زیاد نے اپنے مشہور خطبہ تبرا میں کہا "فادعوا اللہ بالصلاح لائمتکم فانھم ساستکم المودبون لکم.... اما واللہ لاودبنکم غیر ھذا الادب اوتستقیمن" الخ

تم لوگ اللہ تعالیٰ سے اپنے اماموں کی اصلاح کے لئے دعا کرو کیوں کہ وہی تمھارے سردار اور بہترین مودب ہیں۔ میں تمھیں اس ادب کے علاوہ دوسرا ادب سکھاؤں گا تاکہ تم راہ راست پر رہ سکو۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے استاد سے پوچھا "کیف کانت طاعتی ایاك وانت تودبنی"۔ جب آپ مجھے ادب و تہذیب سکھاتے تھے تو آپ کے لئے میری فرماں برداری کیسی تھی؟ انھوں نے کہا بہت اچھی۔ تو آپ نے فرمایا کہ اب آپ بھی میری ویسی ہی اطاعت کریں جیسی میں کرتا تھا۔

اس زمانہ میں یہ مودبین نوجوانوں اور بچوں کو شاعری، علم الانساب، اخبار و امثال کی تعلیم دیتے تھے۔ پہلی صدی ہجری کے صدر ہی سے اس لفظ کے دو معنی ہو گئے تھے۔

(۱) ادب النفس (۲) ادب الدرس

ادب النفس کا تعلق تہذیب و اخلاق اور شائستگی سے تھا۔ وہ اس بات کا متقاضی تھا کہ حلم و کرم، صداقت و سچائی اور شجاعت و جواں مردی جیسے فضائل سے نفس کی تربیت کرے اور خصائل حمیدہ پیدا کرے۔ ابن المقفع نے اپنی کتابوں کا نام الادب الصغیر اور الادب الکبیر رکھا اور ایسے اصول و قوانین منضبط کئے جن پر عمل پیرا ہو کر قاری، ادیب، خوش اخلاق صاحب کردار اور نیک سیرت کا حامل ہو سکتا ہے۔

الادب الکبیر میں لکھا ہے: "اما ذوالادب فطالب و امامن لا ادب لہ فمختلس" یعنی صاحب ادب و تہذیب پسندیدہ اور بے ادب لوگوں میں ناقابل قبول و

ناپسند ہوتا ہے۔

با ادب با نصیب بے ادب بے نصیب

ادب کے دوسرے تعلیمی معنی ہیں یعنی شاعری و نثر کی تعلیم دینا اور انساب و اخبار اور امثال سے لوگوں کو روشناس کرانا تاکہ عقل انسانی میں جلا پیدا ہو اور نفس کی ثقافت اور عرفان میں اضافہ ہو۔ اس زمانہ میں ادیب یا مودب اور شاعر و کاتب میں فرق کیا جانے لگا۔ جو شخص ادب و تہذیب کے کام میں مشغول ہوتا اسے ادیب یا مودب اور جو شعر گوئی میں منہمک ہوتا اسے شاعر نیز جس کا رجحان نثر نگاری کی سمت زیادہ ہوتا اسے کاتب کہا جاتا جیسے عبدالحمید کاتب وغیرہ۔ اکثر ایک ہی شخص ان تینوں خصائص کا حامل ہوتا تھا۔

ابن المقفع نے لکھا ہے: "کلام اللبیب وان کان نزرا ادب عظیم" عقل مند کی گفتگو اگرچہ مختصر ہی کیوں نہ ہو عظیم ادب ہے۔

اس وقت سے اب تک ادب کم و بیش انھیں دونوں مندرجہ بالا معانی میں استعمال ہوتا رہا۔

عباسی عہد: عباسی حکومت کے قیام کے بعد مختلف قسم کے علوم و فنون وجود میں آئے۔ صرف و نحو، لغت وغیرہ سے لوگ پوری طرح روشناس ہوئے اور یہ سب ادب کے تعلیمی معنوں میں شامل ہو گئے جس کی وجہ سے اس کے معانی میں وسعت پیدا ہوئی۔ اس سے قبل انساب و اخبار وغیرہ مراد لئے جاتے تھے لیکن اس کے بعد صرف و نحو اور نقد و بیان وغیرہ بھی اس میں شامل ہو گئے۔ ثقافتی اور سماجی پہلوؤں میں تغیر و تنوع کی وجہ سے تیسری صدی ہجری کے اواخر تک لفظ ادب کا اطلاق مندرجہ ذیل چار معانی میں ہونے لگا۔

۱۔ خاص معنی جس میں شاعری و نثر کے ساتھ اخبار و انساب بھی شامل تھے۔ پہلی صدی میں یہی معنی مراد تھے اس میں نقد اور فنی نثر کا مزید اضافہ ہوا۔

۲۔ عام معنی جس میں تمام انسانی علوم و علمی آثار، فنون لطیفہ و ریاضیہ وغیرہ سب آ جاتے ہیں۔ رسائل اخوان الصفا میں ہے کہ علوم انسانی کی تین قسمیں ہیں۔ ۱۔ ریاضیہ، ۲۔ شرعیہ وضعیہ، ۳۔ فلسفیہ حقیقیہ۔

ریاضیہ وہ آداب علم ہیں جو طلب معاش اور دنیاوی زندگی کی اصلاح کے امور میں کام آئیں وہ نو قسم کے ہیں۔ (۱) علم قرأت (۲) کتابت (۳) لغت (۴) نحو (۵) علم حساب (۶) معاملات (۷) شعر (۸) عروض (۹) فال۔

حسن بن سہیل وزیر کا قول ہے ادب دس قسموں کے ہیں۔ تین شہر جانیہ، تین نوشیروانیہ، تین عربیہ اور ایک ان سب کا نچوڑ۔

شہر جانیہ موسیقی اور شطرنج وغیرہ، نوشیروانیہ میں طب، شہسواری، ریاضی وغیرہ، عربیہ سے مراد شعر، نسب، ایام و اخبار وغیرہ ہیں۔

جاحظ کی روایت سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم فلسفیوں کے نزدیک نجوم، ہندسہ، مساحت، طب و کیمیا موسیقی وغیرہ سب اصول و آداب میں شامل تھے۔

۳۔ وہ ادبی علوم جو ایک مستقل صورت اختیار کر چکے تھے اور ان میں جدت و ندرت پیدا ہو گئی تھی۔ ادیب میں ادبی صلاحیت اُجاگر کرنے کے لئے لغت، نحو، صرف اور اخبار لازم سمجھے گئے تھے۔ ان مذکورہ علوم کے ساتھ دینی ثقافت بھی تھی جس میں مختلف قسم کے علوم و مباحث تھے جیسے تفسیر قرآن، علم حدیث، فقہ، اصول فقہ اور علم کلام وغیرہ۔

۴۔ ادب النفس ۔ اس کے معنی اس درجہ اور اس قدر وسیع ہوئے کہ علم و عمل، اچھے اخلاق، عمدہ سیرت اور عفت و پاکیزگی وغیرہ تمام چیزوں پر محیط ہو گئے۔ گویا ہر پسندیدہ اسلوب پر اس کا اطلاق ہونے لگا۔

ابو تمام نے حماسہ میں اس باب کا نام 'باب الادب' رکھا جس میں حکمت و دانائی، اچھے و پسندیدہ اخلاق، شرم و حیاء، پاکیزگی اور عفت نیز حسن معاملت وغیرہ پر مبنی اشعار ہیں۔

امام بخاری نے الجامع الصحیح میں 'کتاب الادب' ایک حصہ رکھا جس میں اولاد پر والدین کے حقوق اور ذمہ داری، بیواؤں اور یتیموں کے ساتھ حسنِ سلوک، پڑوسیوں کے حقوق، معاملات میں ایک دوسرے سے خوش کلامی و نرمی سے پیش آنا، حسن اخلاق اور سخاوت کو اپنا شعار بنانا اور مصائب و تکالیف پر صابر و ثابت قدم رہنے وغیرہ سے متعلق احادیث متبرکہ جمع کی ہیں۔

اس دور میں ادب کے اصل معنی سے نئے نئے معنی نکلنے شروع ہوئے۔ مختلف کتابیں لکھی گئیں۔ ابن قتیبہ نے الشعر والشعراء، ادب الکاتب لکھیں۔ ابن کشاجم نے ادب القدیم لکھی جو اشعار و نوادر پر مبنی ہے۔ ادب الوزراء لکھی گئی جس میں وزیروں کے واسطے مفید نصائح و مواعظ، ان کی عملی سیاسی زندگی سے متعلق درج کیے گئے۔ ابن عبدربہ نے العقد الفرید میں آداب الحکماء والعلماء کے نام سے باب مرتب کیا۔

ابن المقفع نے لکھا ہے جس طرح بیج زمین کے اندر بے جان پڑا رہتا ہے اور تاوقتیکہ اسے دھوپ اور پانی وغیرہ نہ ملے زمین سے ابھرتا نہیں اسی طرح عقل انسانی دماغ میں پوشیدہ رہتی ہے تاوقتیکہ ادب اس کو نمو اور حیات نہ بخشے۔ یہاں ادب سے مراد ان معارف کا علم ہے۔

مبرد نے کامل میں لکھا ہے "ھٰذا کتاب الفناہ یجمع ضروباً من الآداب ما بین کلام منثور و شعر مرصوف و مثل سائر و موعظۃ بالغۃ و اختیار من خطبۃ شریفۃ و رسالۃ بدیعۃ" ہم نے یہ کتاب مرتب کی، اس میں ادبی شہ پاروں مثلاً نثر، عمدہ شعر، کہاوتیں موثر نصائح، عمدہ خطبات کے نمونے اور بلیغ خطوط وغیرہ کے نمونے درج ہیں۔

زہر الآداب و ثمر الالباب میں شاعری وغیرہ سے بحث کی گئی ہے اور ارشاد الاریب الی معرفۃ الادیب میں ادبا کے تذکرے ہیں۔ ادیب کا اطلاق اس شخص پر کیا ہے جو عربی زبان سے کماحقہ واقف اور نظم و نثر کی صنعتوں سے پوری طرح روشناس ہو۔

چوتھی صدی ہجری: جب اس صدی کا آغاز ہوا تو علوم لغویہ یعنی لغت، نحو و صرف وغیرہ ادب کے معنی سے نکل گئے اور ایک الگ مستقل فن بن گئے۔ اب تک ان کا شمار ادب میں ہی ہوتا تھا اب علم تنقید و بیان ادب سے متعلق رہے۔ یہ صورت حال زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکی اور علم تنقید بھی ایک الگ فن ہو گیا۔ اس کی وجہ سے بلاغت وجود میں آیا جو بعد میں معانی و بیان اور بدیع میں منقسم ہو گیا۔ تنقید سے متعلق اس صدی میں بہت سی کتابیں وجود میں آئیں۔ ان میں کتاب الصناعتین لابی ہلال العسکری کافی مشہور ہوئی۔ اس کے مولف نے نثر و شعر دونوں کے فنی محاسن اور بلاغت و ادبی تنقید کے مسائل بیان کئے۔ اس کے بعد دیوان المعانی لکھی گئی۔ اسی صدی میں ابوتمام و بحتری کے حامیوں میں آپس میں اختلافات رونما ہوئے اور کچھ ہی

یعے کے بعد متنبی اور اس کے حریفوں میں شدید اختلافات شروع ہوئے جن کی وجہ سے تنقید کو بڑی ترقی ملی۔ آمدی نے الموازنہ بین الطائیین اور عبدالقاہر جرجانی نے الوساطۃ بین المتنبی وخصومہ نسیف لکیں۔ تنقید کے ساتھ ہی بلاغت کو بھی فروغ ہوا۔ جرجانی نے دلائل الاعجاز اور اسرار البلاغت لکھیں۔

لیکن جہاں تک ادب کے عام معنی کا تعلق ہے اس کی وسعت اس دور میں بھی باقی رہی۔ تمام شرعی علوم اور فلسفہ کے علاوہ جملہ آثار اس میں شامل رہے۔ رسائل اخوان الصفا کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ علم الآداب کے اقسام میں تمام علوم شامل تھے مثلاً کتابت، قرأت، لغت، نحو، حساب، شعر، کیمیا، صنعت وحرفت اور سیرت و اخبار وغیرہ۔

متنبی کے دو اشعار ملاحظہ ہوں:

یا ذا المعالی ومعدن الادب   سیدنا وابن سید العرب

اے بلند مراتب کے مالک اور ادب کی کان، اے ہمارے سردار اور عرب کے سردار کے بیٹے۔

یہاں ادب کا یہ مفہوم سمجھ میں آتا ہے کہ معدن الادب سے مراد تمام فضائل و کمالات کا منبع ہے۔

فسرت نحوك لا الوي على احد   احث راحلتي الفقر والادبا

آپ کی بخششوں کی خبر سن کریں آپ کی طرف اس حالت میں چل پڑا کہ کسی کی طرف توجہ نہ کرتا تھا اور اپنی دونوں سواریوں فقر اور ادب کو برانگیختہ کرتا تھا یعنی میں ادیب و فنکار ہوں اور آپ ادب کے قدردان

پانچویں صدی: اس صدی کے اختتام تک تمام اہم ادبی علوم ایک مستقل حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ دراصل ادب اعلیٰ نثر اور شاعری کے اندر مقید ہوگیا۔ غرض کہ اس لفظ کے عام معنی تنگ ہونے لگے اور دائرہ مختصر ہونے لگا یہاں تک کہ اس میں صرف لغوی علوم رہ گئے۔ خاص معنی سے وہ ادبی علوم نکل گئے جو دوسری صدی میں اس میں داخل ہوگئے تھے۔ اس میں فنی نثر اور شعر باقی رہے۔ یہی وہ معنی ہیں جن کے اندر ادب محدود ہوکر رہ گیا تھا۔ بہت سے علماء نے ان ادبی علوم کی طرف پہلے سے زیادہ دلچسپی دکھائی اور اپنی توجہات مبذول کیں۔ ادب کے معانی کے اطلاق پر

اختلافات پیدا ہوئے۔ ان اختلافات کے باوجود بھی بعض لوگوں نے اس کے وہی پرانے معنی مراد لئے۔ چنانچہ امام غزالیؒ نے احیاء علوم الدین میں آداب الاکل، آداب النکاح، آداب الکسب اور آداب الالفۃ والاخوۃ والصحبۃ والمعاشرۃ نیز آداب السماع والوجد وغیرہ بیان کئے آداب المریدین میں حضرات صوفیہ کے سلوک باطن اور مختلف مدارج ہائے ترقی نیز سیر عروج کا بیان ہے۔

محمد بن علی طباطبا نے اپنی کتاب کا نام کتاب الفخری فی آداب السلطانیۃ والدول الاسلامیۃ رکھا اس میں سیاسیات وغیرہ کا بیان ہے اس سے لوگ حوادث وواقعات، رعایا کی سیاست، مملکت کی مضبوطی اور اخلاق وسیرت کی درستی واصلاح کے بارے میں روشناس ہوں۔

ابن خلکان نے ابوزکریا تبریزی کے حال میں لکھا ہے:

"کانت لہ معرفۃ تامۃ بالادب من النحو واللغۃ وغیرہما وصنف فی الادب کتباکثیرۃ مفیدۃ منہا شرح الحماسۃ وکتاب شرح دیوان المتنبی وکتاب شرح سقط الزند و شرح المعلقات وشرح المفضلیات۔"

"اسے ادب خصوصاً نحو ولغت میں بڑی معلومات تھیں۔ ادب میں اس نے بہت سی مفید کتابیں تالیف کیں جن میں شرح حماسہ، شرح دیوان متنبی، شرح سقط الزند، نیز شرح معلقات ومفضلیات ہیں۔"

البوالبرکات محمد انباری نے نزہت الالباء فی طبقات الادباء لکھی جس میں ماہرین لغت نحو کا تذکرہ کیا۔

عصر جدید: عصر جدید مصر میں محمد علی پاشا کے دور حکومت ۱۸۰۵ء سے شروع ہو کر موجودہ دور تک ہے۔ مشرقی ممالک میں مغربی علوم وفنون کی ترویج شروع ہوئی تو اہل مشرق نے مغرب کی اقتدا کرتے ہوئے ادب کے دو معنی وضع کئے۔ ایک عام معنی دوسرے خاص معنی۔ عام معنوں میں وہ تمام علوم شعر ونثر بلیغ آ گئے اور ادب کا اطلاق ان تمام جملوں پر ہونے لگا جو مختلف کتابوں میں علما وادبا کے افکار کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوئے۔ خاص معنوں میں وہ تمام عبارتیں بھی آ گئیں،

عمدہ قالب میں ڈھال کر اچھے انشائی اسلوب سے مزین کرکے پیش کی جائیں چنانچہ اس میں شاعری، حکایات، روایات، عمدہ قصے، امثال وحکم، مقالات وخطبات، فصیح عبارتیں، اعلیٰ پیمانہ کی تاریخی نثر اور سفرنامے وغیرہ داخل ہوگئے۔

جب ادب اپنے خاص معنی میں استعمال ہونے لگا تو حفنی ناصف بک نے اپنے ایک لکچر میں صاف صاف کہا کہ "ادب میں شاعری ونثر کے ہر دور میں اوصاف، شعرا، خطبا، کاتبین ومولفین کے تذکرے ان کی تحریروں وغیرہ کے اثرات اور ان متقدمین کے تذکرے جن کی شخصیتیں ان پر اثرانداز ہوئیں اور تصنیفات وتالیفات کے درمیان موازنے وغیرہ تمام چیزوں کو داخل کیا جائے گا" اسی کا نام انھوں نے تاریخ الآداب رکھا۔ چنانچہ احمد حسن زیات نے تاریخ الادب العربی تالیف کی۔ جرجی زیدان نے تاریخ آداب اللغۃ العربیہ، کارلونالینو نے تاریخ الآداب العربیۃ اور اسی طرح بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ مندرجہ بالا قول درست ہے۔ اب ادب میں تمام چیزیں داخل ہوگئی ہیں۔

فارسی: مصطفیٰ احمد زادہ
اردو: شعیب اعظمی

مولانا جلال الدین[1]

مولانا جلال الدین رومی کا عہد تاریخی حیثیت سے ایک پُر آشوب دور ہے۔ اُن کا بچپن علاؤ الدین محمد خوارزم شاہ کے عہد حکومت سے شروع ہوتا ہے جس نے مغربی ایران سے لے کر مشرقی ایران تک کی ایک وسیع و عریض مملکت اپنے سیاسی تسلط کے تحت قائم کر رکھی تھی اور اس حد تک طاقتور حکومت کہ مملکت کے تمام پڑوسی ممالک خوارزم شاہی فوجی طاقت سے ہراساں رہتے تھے۔ اور بغداد کے خلیفہ کا حال سب کو معلوم ہے۔

یہ حکومت بظاہر فولادی مگر عمالوں کی سازش اور والیان ریاست کی خودسری کی بنا پر حضرت سلیمان کے عصا کی مانند اندر سے ٹوٹتی جا رہی تھی۔ اور آخر کار یہ ناگفتہ حالت تک وہاں پہونچ گئی کہ صحرا گرد قبائل اور نیم وحشی خاندانوں نے، متمدن شہروں کو اور ہزار ہا ہزار مہذب اور دانشمند افراد کو گھوڑوں کی ٹھڑوں تلے روند ڈالا اور خون آشام تلواروں سے آشنا کرایا۔

لیکن یہ زمانہ علم و تمدن کی حیثیت سے امیر ترین اور شاندار ادوار میں سے ایک ہے۔ شاید کم ادوار ایسے ہوں گے جو اس قدر اور اس حد تک فرہنگ اور علوم سے آراستہ ہوں۔ اس عہد کی تاریخ درخشاں ترین علمی، ادبی اور عرفانی شخصیات کی حامل رہی ہے اور یہ وہی دور ہے کہ قسم قسم کے علوم و فنون

---

[1] اصل کتاب مولانا جلال الدین ترکی زبان میں عبدالباقی گولپینارلی نے لکھی ہے اور ڈاکٹر توفیق سبحانی نے اس کا ترجمہ فارسی میں کیا ہے اور مصطفیٰ احمد زادہ نے مجلہ کیہان فرہنگی سال دوم، خرداد ماہ ۶۴، شمارہ ۳، اسلام آباد میں تبصرہ کیا ہے۔

اپنی معراج کو پہونچے اور بے شمار اور بکثرت علمی اور تہذیبی آثار وجود میں آئے۔

سمرقند، بخارا، بلخ، نیشاپور اور عراق کے دوسرے شہری مراکز جو کہ معنوی زندگی اور علمی درخشندگی کے جگمگاتے ہوئے ستون اور روشن مینار تھے، یکایک مٹی میں مل گئے اور ہزارہا دانشمند و متمدن و متعلم، یا تو مسلح ہو کر جام شہادت نوش کر گئے، یا جلا وطنی اختیار کر بیٹھے اور اپنے علمی و تمدنی ذخیروں کو سینے سے لگائے ہوئے دور دراز مرکزوں کی طرف ہجرت کر گئے۔

بلخ علمی اور تمدنی شہروں میں سے ایک شہر ہے جو ہزارہا علمائے شریعت اور طریقت کا ملجا اور مرکز تھا۔ ساتویں صدی ہجری کے اولیں برسوں تک جو کہ مولانا رومی کی پیدائش کا سال ہے۔ دو شخصیتوں کی شہرت بام عروج پر تھی۔ ان میں سے ہر ایک اپنی خاص فکر کے ابلاغ میں اپنی اپنی جداگانہ روش سے مالا مال تھا۔ ایک متکلم اور فلسفی امام فخر رازی جو کم وبیش یونانی نظریہ رکھتے تھے اور دوسرے سلطان العلماء بہا ولد، طریقت ایمانی سے سرشار تھے

المعارف[1] کے مصنف کی تیکھی تنقیدیں اور طنز و تعریض کے نشتر، امام فخر رازی کے بارے میں بحث کرتے وقت جگہ جگہ آشکارا ہیں۔ اس عہد میں فلسفے کی مخالفت کی فضا ادر بہا۔ ولد کا فکری مشرب و عقیدہ، ان کو اس عہد کے فلسفی کی مخالفت میں زبان کشائی پر آمادہ کرتے نظر آتے ہیں اور دوسری طرف جو کچھ کہ موضوع کو بہت زیادہ مخالفت پر آمادہ کرتی ہے وہ امام فخر رازی کا

---

[1] المعارف فارسی زبان میں صوفیا کی اہم ترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ بہاؤالدین محمد حسین خطیب معروف بہ بہاؤالدین ولد ملقب بہ سلطان العلماء (ف: ۶۳۱) چھٹی صدی ہجری کے بزرگ صوفیہ میں تھے۔ انھوں نے امام فخر رازی سے مخالفت کی بنا پر خراسان سے ہجرت کی۔ نیشاپور میں فریدالدین عطار سے ملاقات کی جنھوں نے ان کے صاحبزادہ جلال الدین رومی کو اپنی کتاب اسرار نامہ ہدیہ کی۔ بہا ولد بغداد اور مکہ اور ملطیہ ہوتے ہوئے قونیہ آ گئے اور وعظ و ارشاد میں مشغول ہوئے۔ ان کی تصنیفات میں المعارف معروف بہ المعارف بہاولد مشہور ہے۔

سلطان وقت کے یہاں پناہ لینا ہے کیونکہ خوارزم شاہ نے امام رازی کے فلسفہ اور خود اُن کی طرف اپنی خاص توجہ کی نشاندہی کی ہے۔

سلسلہ کبراویہ کے صاحب طریقت بزرگ مجدالدین بغدادی، خلیفہ نجم الدین کبریٰ کی شہادت، جن کے طریقہ سے سلطان العلماء خود منسلک تھے، امام فخر کے شاگردوں کی مدد کی بنا پر تھی اور اسی چیز نے اختلاف کے زیادہ اسباب پیدا کئے۔ چنانچہ بہاولد اپنے مواعظ میں محمد خوارزم شاہ اور فخر رازی کو ایک ساتھ اپنی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں جس میں اول الذکر کی دنیا پرستی اور موخرالذکر کی حکمت دوستی پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔

فخر رازی سے مخالفت کرنے والوں میں تنہا بہاولد نہیں ہیں بلکہ نجم الدین کبریٰ، مجدالدین بغدادی اور سرداروں کے امیر، محقق ترمذی اور شمس تبریزی اور نجم الدین دایہ شامل ہیں۔ ترکی مصنف عبدالباقی گولپینارلی اپنی عارفانہ تصنیف مولانا جلال الدین میں (جو اس گفتگو کا موضوع ہے) شہر بلخ سے بہاؤالدین ولد کی مہاجرت کے اسباب کو درست بتانے میں ناکام ہیں اور سپہ سالار اور افلاکی جیسے تذکرہ نگاروں کی مانند حق پر نہیں ہیں اور وہ مولانا کے فرزند سلطان ولد کی تصنیف مثنوی ولد سے استفادہ کرتے ہوئے مرحوم بدیع الزماں فروزانفر کے ہم خیال ہو گئے ہیں۔

استاد موصوف فروزانفر نے جو مولانا کی تصنیفات کے ماہر ہیں، بہاولد اور اُن کے فرزند مولانا کی ہجرت کے سال کو ۶۱۷ھ بتایا ہے، اور یہ حقیقت سے قریب تر ہے۔ پس کہا جا سکتا ہے کہ ہجرت کے اسباب میں ایک تو بلخ میں عرفانی اور روحانی اداروں کی مخالف فضا جو زیادہ تر امام فخر رازی اور آن کے شاگردوں کی پیدا کردہ تھی، رہی ہے اور دوسری اور بہتر وجہ وسطی ایشیا کے وحشی قبائل کا ایران کی سرزمین پر حملہ ہے لیکن بہاولد کی ہجرت کے اسباب میں افلاکی کے اقوال میں صرف امام فخر رازی کی مخالفت کا یقین کرنا صحیح نہیں ہے جیسا کہ استاد فروزانفر نے تحقیق کی ہے۔

ان لوگوں میں صرف بہاولد ہی دل گرفتہ ہو کر جلاوطن نہیں ہوئے بلکہ نجم الدین رازی، سید برہان الدین محقق ترمذی معروف بہ سید سردان جیسے نامور بھی تھے۔ بہاولد کے بعد مولانا کے مربی و مشوق شمس الدین تبریزی، شیخ الاسلام ترمذی، سیف الدین محمود فرغانی اور دوسرے علماء بھی مغرب کی طرف چل پڑے۔ سلطان العلماء کے افرادِ خاندان اور آن کے مریدوں کا کارواں بلخ سے مغرب کی

طرف روانہ ہوا۔ یہ ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک مقام سے دوسرے مقام پر ٹھہرتے اور آگے بڑھتے رہے۔ ہر شہر و دیار میں علماء اور شیوخ ان لوگوں سے ملاقات کے لئے ٹوٹے پڑتے تھے یہاں تک کہ یہ قافلہ شہر بغداد میں خیمہ زن ہوا۔ اور کچھ روز کے قیام کے بعد خانۂ خدا کی زیارت کو روانہ ہوا۔ اور پھر وہاں سے شام، حلب، دمشق اور دیار روم گیا جو سفر کی آخری منزل تھی۔

بلاد روم مغلوں کی تسخیر کے لئے بہت دور تھا اور یہ قبائلی سطوت اندیش لوگ تاتاریوں کے مقابلہ میں کسی جگہ کو امن کا گہوارہ نہیں بنا سکتے تھے۔ روم کے سلجوقی بادشاہوں میں علاؤالدین کیقباد جو بذات خود علماء اور دانشمندوں سے دلچسپی رکھتا تھا۔ سلطان العلماء بہاء ولد اور اُن کے ہم قافلہ لوگوں سے قونیہ میں اقامت پذیر ہونے کا خواستگار ہوا۔ گولپینارلی کی تحقیق کے مطابق بظاہر ۶۲۶ھ میں تاتاریوں کے حملہ سے بھاگے ہوئے لوگ خراسان اور ماوراء النہر کے علاقوں کو چھوڑ کر دیار روم کی سمت چل پڑے، اور نتیجہ کے طور پر بلاد روم فارسی زبان کے گراں قدر علوم و تمدن کی پناہ گاہ بن گیا جیسا کہ ترک استاد گولپینارلی نے کہا ہے:

> "مولانا نے اپنی ابتدائی تعلیمات سفر حج سے لوٹنے کے بعد حلب اور شام کی مسافرت (۶۱۸ - ۶۲۲) کے دوران ختم کی ہے، اور اجازت نامہ حاصل کیا ہے۔
>
> "شاید والد کی وفات کے بعد بھی مذکورہ بالا شہروں کا سفر اور شخصی مطالعہ کی بنا پر کسب کمال کیا ہو اور تھوڑی ہی مدت میں اجازت نامہ کے حصول میں کامیاب ہو گئے ہوں"

۶۱۸ - ۶۲۲ھ کی درمیانی مدت میں مکہ کے سفر سے لے کر قونیہ کی اقامت تک نہ تو فریدوں سپہ سالار اپنے رسالہ میں اس کا ذکر کرتے ہیں اور نہ افلاکی اپنی مناقب میں، اور یہاں تک کہ مولانا کے فرزند سلطان ولد اپنی مثنوی میں کچھ نہیں کہتے۔

ترک استاد گولپینارلی اور ایرانی محقق فروزانفر نے مذکورہ چار برسوں کی مدت میں مولانا کی تحصیلات کا ذکر کیا ہے۔ ۶۲۸ھ میں بہاولد کی وفات کے بعد ۶۲۹ھ میں مولانا روم سے برہان الدین محقق ترمذی متعلق ہوئے۔ انھوں نے مولانا میں تحصیل علوم و معارف کا

شوق تیز تر کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ۶۳۸ھ میں مولانا نے آٹھ نو سال دمشق اور حلب کے علاقے میں گذارے تاکہ وہ اپنے علوم کو کمال تک پہونچا لیں۔ اس زمانے میں دمشق بھی ایک دوسری پناہ گاہ تھی جہاں مغلوں کے فتنہ و فساد سے تنگ آئے ہوئے لوگ پناہ گزیں ہو رہے تھے۔

دمشق میں مولانا کی اقامت کے سال، شیخ محی الدین اکبر بن العربی کی زندگی کے آخری سالوں سے متصادف ہیں۔ تصوف و عرفان میں ابن عربی کی شہرت کے پیش نظر کیا ان دونوں کے درمیان کوئی ملاقات واقع نہیں ہوئی ہے؟

منقبت نویسوں نے اس بارے میں کسی قول کا اظہار نہیں کیا ہے۔ گولپینارلی نے ابن عربی اور مولانا کے درمیان کسی بھی ملاقات سے انکار کیا ہے:

"ہم یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مولانا اور شمس نے اور ان لوگوں نے جو ان کے ہم صحبت رہے ہیں کبھی بھی محی الدین سے کوئی تعلق نہیں رکھا ہے"

لیکن اس بارے میں استاد فروز انفر کی رائے اس سے مختلف ہے اور اُن ماخذوں کے مطابق جن کا وہ ذکر کرتے ہیں ان دو دیو قامت روحانی شخصیتوں کے درمیان ملاقات رہی ہے۔

"مولانا کا قیام دمشق میں بظاہر چار سال سے زیادہ، جیسا کہ روایت ہے، نہیں رہا ہے اور یہ بات مسلّم ہے کہ مولانا نے فقہ کی کتاب ہدایہ کو اسی شہر میں پڑھا ہے اور محی الدین کی صحبت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔"

مرحوم فروزانفر اپنی گفتگو کے ماخذ یوں پیش کرتے ہیں:

"اس بات کی سند یہ ہے کہ کمال الدین حسین خوارزمی اپنی مثنوی جواہر الاسرار کی شرح میں کہتے ہیں، دوسرے یہ کہ جس وقت حضرت خداوندگار دمشق کے علاقہ میں تھے تو کچھ دنوں تک حضرت ملک العارفین موحد محقق کامل الحال و القال شیخ محی الدین ابن العربی اور سید المشائخ والمحققین شیخ سعد الدین الحموی اور زبدۃ السالکین و عمدۃ المشائخ

عثمان الرومی اور موحد محقق، عارف کامل، فقیر ربانی اوحدالدین کرمانی اور ملک المشائخ والمحدثین شیخ صدرالدین القونوی کے ساتھ رہے ہیں اور حقائق و اسرار جس کی شرح طویل ہے، ایک دوسرے کے زیر بحث آئے ہیں: اور یہ بات واقعتاً حقیقت سے قریب ہے کیونکہ مولانا سے جو کہ ایک متفحص، طالب اور مردان خدا کے جویا رہے ہیں، یہ امید نہیں کی جا سکتی ہے کہ وہ دمشق میں اقامت اختیار کریں اور باوجود تمام شہرت کے محی الدین سے ملاقات نہ کریں۔ ولد چلپی کے حاکمیت اخبار (۱۳۴۵ ق) اور مجموعہ یادداشتہا و مقالات آقای کاظم زادہ وغیرہ میں شائع شدہ مقالات سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت مولانا اپنے والد کے ساتھ ملک شام میں وارد ہوئے تو انھوں نے محی الدین کی زیارت کی ہے۔

"اور جب لوٹتے وقت مولانا جلال الدین اپنے والد کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے تو محی الدین نے کہا "سبحان اللہ، اُقیانوسی از پی یک دریا چہ می رود" یعنی خدا کی شان بحر بیکراں ایک دریا کے پیچھے رواں ہے۔"

گو لپینارلی ولد چلپی کی بات کو مستند نہیں سمجھتے ہیں اور اپنی کتاب میں مختلف مقامات پر ولد چلپی پر تنقید کرتے ہیں۔ لیکن نہ تو کمال الدین خوارزمی کا ذکر کرتے ہیں اور نہ ان کی مثنوی کی شرح کا نام لیتے ہیں۔ شیخ اکبر محی الدین اپنے عہد کے بزرگ ترین عارفوں اور صوفیوں میں سے ہیں۔ ان کے دور میں تصوف استدلال اور بحث کا موضوع بنا اور فلسفہ سے نزدیک ہوگیا۔

ابن عربی کا علم و عرفان اُن کے شاگرد اور مُنہ بولے بیٹے شیخ صدرالدین قونوی کے وسیلے سے جو کہ اُن کی تصانیف کے مفسّر تھے پھیلا اور اس حلقے میں بہت سے لوگ شامل ہو گئے۔ فخرالدین عراقی، عبدالغنی نابلسی، عبدالرزاق کاشانی، داؤد قیصری، محمود شبستری اور عبدالرحمان جامی کے علاوہ دیگر نامور علما، اس گروہ میں شامل تھے۔

ابن عربی کے استدلالی اور علمی تصوف کے مقابلہ میں، مولانا کا تصوف جذب، حال اور عشق سے بھرپور ہے کہ جس میں استدلال اور فلسفہ کی کوئی خبر نہیں ہے اور جو کچھ بھی ہے وہ

شور اور جذبہ ہے۔ یہ طریقہ برہان الدین محقق ترمذی تک اور ان سے سلطان العلماء بہا ولد اور مجد الدین بغدادی اور پھر نجم الدین کبریٰ تک پہونچتا ہے۔

سلطان العلماء کے بعد سید سردان مولانا کے شیخ، سرپرست اور شوق پیدا کرنے والے بنے اور اپنی موت کے دن تک علوم و معارف سے مولانا کو فیض پہونچاتے رہے۔ چونکہ محقق ترمذی نجم الدین کبریٰ کے بارہویں خلیفہ اور شیخ تھے اس لئے اس سلسلے کے دوسرے خلیفہ کی طرح، مولانا کے والد تصوف کے فلسفیانہ اور استدلالی رنگ سے پرہیز کرتے تھے اور مولانا خود بھی اسی عقیدہ پر تھے یہاں تک کہ برہان الدین کی وفات کے بعد شمس تبریز مولانا کی شخصیت کو منور کرنا شروع کر دیتا ہے۔

شمس بھی، جیسا کہ معلوم ہے اسی راستے پر تھے۔ جیسا کہ کہا گیا کہ اُستاد فروزانفر محی الدین ابن عربی کے ساتھ مولانا کی ملاقات کو بعید از قیاس نہیں جانتے ہیں لیکن ترک محقق (گولپینارلی) ہر قسم کی ملاقات کے منکر ہیں اس لئے یہ کہنا چاہیئے کہ مولانا ابن عربی کے عقائد سے آشنا تھے چنانچہ اُن کے بزرگ ترین شاگرد اور کتابوں کے مفسر یعنی صدرالدین قونوی سے تعلق خاطر رکھتے تھے، وہ ایک دوسرے کی مجالس میں شریک ہوا کرتے تھے۔ اور جیسا کہ منقبت نویسوں نے بیان کیا ہے اور استاد عبدالباقی گولپینارلی کا بھی بیان ہے کہ مولانا کی وصیت کی بنا پر صدرالدین نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی تھی۔ شمس بھی ابن العربی کے استدلالی نظریات و عقائد سے واقف تھے اور ان کے دلائل اور ذکر بھی جو کہ ان کے مقالات میں ہیں، انتقاد آمیز ہیں۔ اور گولپینارلی بھی اس مسئلہ پر مولانا اور شمس کے باب میں اشارہ کرتے ہیں

بنیادی طور پر مولانا کی بے قرار روح اور فکر ان استدلالی مباحث سے کوئی سروکار نہیں رکھتی، یہ ایسا سمندر ہے کہ جس کی جانب شور مچاتے دریا رواں دواں ہیں۔

کرانی ندارد بیابان ما
قراری ندارد دل و جان ما
جہان در جہان نقش و صورت گرفت
کدام است ازین نقش ہا آن ما
چو در رہ ببینی بریدہ سری
کہ غلتان رود سوئی میدان ما
ازو پرس ازو پرس اسرار ما
کزو بشنوی سر پنہان ما

مولانا بھی وہی "خط سوم" ہیں جن کا ذکر شمس اپنے مقالات میں کرتے ہیں:

"آن نقاش سہ خط کشید. یکی را خود خواندی و غیر، دیگری را خود خواندی نہ غیر، سوم را نہ خود خواندی و نہ غیر، آن خط سوم منم۔"

یہی سبب ہے کہ ان کو بحوز اور لابحوز سے کوئی واسطہ نہیں ہے اور اس درس سے جس میں چار سو طالب علم روزانہ ان کے حضور میں زانوئے تلمذ تہ کر کے معرفت حاصل کرتے تھے، اپنے آپ کو آزاد کر لیتے ہیں:

"ایک روز مولانا کے حضور میں فتوحات مکیہ کا ذکر ہو رہا تھا کہ عجیب کتاب ہے، چنانچہ کہنے والے کا مدعا معلوم نہیں ہوتا ہے اور اس کی حکمت کے اسرار نامفہوم ہیں۔ اچانک ذکی قوال داخل ہوا۔ مولانا نے فرمایا: فی الحال فتوحات ذکی فتوحات مکیہ سے بہتر ہے، اور پھر سماع شروع کر دیا۔"

آخری کتاب جو مولانا کے حالات کے بارے میں فارسی زبان میں موجود ہے وہ ترک محقق گولپینارلی کی دلچسپ تصنیف ہے۔ اگرچہ گولپینارلی بہت ساری تحقیقات اور تصنیفات کے مالک ہیں لیکن وہ بظاہر ایران میں اجنبی ہیں۔ اُن کی تصنیفات میں جو کچھ مولانا سے متعلق ہے وہ حسب ذیل ہے:

۱۔ ترجمہ مثنوی ۔ مولانا کی منتخب رباعیات ۔

۲۔ مولانا مولویہ بعد از مولانا ۔

۳۔ گلدستہ ۔ دیوان کبیر کے منتخب اشعار کا ترجمہ ۔

۴۔ ترجمہ دیوان کبیر ۔

۵۔ آداب و ارکان طریقت مولوی ۔

۶۔ رباعیات مولانا جلال الدین ۔

استاد عبد الباقی گوبپینارلی اہل علم کے خاندان میں پرورش و پرداخت چڑھے ۔ انقرہ یونیورسٹی اور جامع فاتح کے حوزۂ علمیہ میں درس حاصل کیا اور اسی یونیورسٹی کے ادبیات کے کالج میں پروفیسر ہو گئے ۔ ان کے آثار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ترکی فارسی اور اناطولی ادبیات میں صاحب اہلیت و صلاحیت ہیں ۔ غالباً مولانا جلال الدین نامی کتاب ترک محقق کی پہلی تصنیف ہے جو فارسی میں ترجمہ ہوئی ہے ۔

یہ کتاب ترکی میں بار بار چھپ چکی ہے اور اس نے علمی حلقوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کی ہے ۔ اگرچہ کتاب کے مصنف نے اپنی تصنیف کو مستند مآخذ سے معتبر بنایا ہے لیکن اپنے شخصی ذوق کو بھی داخل کتاب کیا ہے اور گویا وہ ذوق حاصل کتاب معلوم ہوتا ہے جس میں ذوق جستجو تحقیق و جذب کی فراوانی ہے اور جو نہ صرف خواص کے لئے بلکہ دوسرے تمام لوگوں کے لئے استفادہ کا باعث ہے ۔

کبھی کبھی ان کی تحریر ایک مخصوص اخلاص اور عقیدت سے بھری ہوتی ہے کہ پڑھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ مولانا کے زمانہ کے مناقب نویسوں میں سے کسی ایک کی تصنیف پڑھ رہا ہے ۔ مثال کے طور پر جب وہ مولانا کی تدفین کے مراسم کا ذکر تے ہیں تو اس قدر موثر انداز بیان ہوتا ہے کہ ہر پڑھنے والا بے چین ہو اٹھتا ہے :

"اس رات یار لوگ آخری خدمت بجا لائے ۔ دوسرے روز تابوت پر مولانا کی فرجی ڈال کر گھر سے باہر لے آئے ۔ عجیب ازدحام تھا ۔ لوگ کاندھا دینے کو ٹوٹ پڑے اور مجبور ہو کر محافظوں نے لوگوں کو ہٹانے

کے لئے ہاتھوں میں تلوار اور کوڑے لے لئے۔ شہری، دیہاتی، ننگے سر ننگے پیر تابوت کو چھو لینے کو دوڑے پڑتے تھے۔ تمام لوگ تابوت کے گرداگرد چکر لگا رہے تھے۔ ہجوم کو چلنے کا راستہ نہ تھا۔ لوگوں کا جم غفیر تابوت کو چھونے کے لئے ادھر ادھر کے کوچوں سے سیلاب کی مانند سڑک پر اُمڈا آ رہا تھا۔ صوفی، علماء، اخیاں، فتیان، رندان، حکومت کے افسران، مسیحی، راہب لوگ، یہودی اور تمام مذہب، خلاصہ سارے انسان، مولانا کو اپنے سروں پر رکھے ہوئے تھے اور راہب، پادری، اُسقف اپنی اپنی جگہ مذہبی مراسم ادا کرتے جاتے تھے۔ تورات پڑھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک مسلمان نے چاہا کہ عیسائیوں اور یہودیوں کو منع کرے وہ چلّا اٹھے، وہ ہمارا مسیح تھا، وہ ہمارا عیسیٰ تھا۔ ہم موسیٰ اور عیسیٰ کے اسرار ان میں دیکھتے تھے اور پاتے تھے۔ وہ آفتاب تھے اور آفتاب ہر گوشہ کو روشن کرتا ہے۔

"دوسرے راہب نے اپنی آستین سے آنکھوں کے آنسو پونچھتے ہوئے زور زور سے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا: مولانا روٹی تھے۔

کیا تم نے کوئی ایسا بھوکا دیکھا ہے کہ وہ روٹی سے بھاگے؟

نفیریاں، تاشے اور رباب بجائے جا رہے تھے اور بانسریوں اور ڈھولوں کی صدا گونج رہی تھی۔ نقاروں اور طبل کے شور کے ساتھ قسم قسم کے سازوں اور نعروں کی آواز آسمان کے کان بہرے کر رہی تھی۔

"ایک گروہ نعرہ لگا کر سماع کر رہا تھا اور کوئی دوسرا فریاد کرتا ہوا بیہوش پڑا تھا۔

تابوت آگے نہیں بڑھ رہا تھا۔ مولانا چل نہیں رہے تھے۔ لوگ انھیں اپنے سروں کا تاج بنائے ہوئے تھے، انھیں جدا نہیں کر سکتے تھے۔

تابوت جو فجر کے وقت گھر سے اٹھایا گیا تھا، مغرب کے وقت مصلی کے مقام
پر جو بہت نزدیک تھا، پہونچا۔"

افلاکی اور سپہ سالار جیسے منقبت نویس جو زیادہ تر مریدی اور مراد سے متعلق حالات سے متاثر ہیں، ان کے آثار زیادہ تر داستان طرازی اور مبالغہ آمیزی کا رجحان رکھتے ہیں۔ اس قسم کی سوانح نگاریاں سابق میں قدیم سے رائج رہی ہیں۔ دوسرے لوگ بھی جیسے عبدالرحمان جامی نفحات الانس میں اور دولتشاہ تذکرۃ الشعراء میں مولانا کا حال بیان کرنے میں اپنے پیشرو مصنفین سے کہیں زیادہ متاثر رہے ہیں اور کہیں کہیں مولانا کی زندگی کے متعدد گوشوں کو اتنا تاریک اور دھندلا چھوڑ گئے ہیں کہ جن کا معلوم کرنا آسان نہیں ہے۔ محقق کو چاہیئے کہ وہ اس قسم کی تصنیفات کو احتیاط اور توجہ سے دیکھے۔

مثال کے طور پر مناقب العارفین میں جو کہ استاد گولپینارلی اور فروزانفر مرحوم کے استناد کا سبب ہے، یہ شعر قابل ذکر ہے:

رو سر بنہ ببالین تنہا مرا رہا کن
ترک من خراب، شبگرد مبتلا کن

مشہور رہے کہ یہ شعر مولانا کی زندگی کے دم واپسیں سے متعلق ہے جسے مولانا سلطان ولد کو مخاطب کرتے ہوئے ایک غزل کے مطلع کے طور پر پڑھتے ہیں، لیکن یہ بات حقیقت کے قرین قیاس نہیں ہے کیونکہ نزع کے عالم میں پوری غزل کہہ دینا ناممکنات میں سے ہے۔ اس قسم کی بات بھی غالباً منقبت نویسی کا ہی حصہ ہے۔

پروفیسر شعیب اعظمی، ہیڈ ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک اینڈ عرب ایرانین اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

سید شہاب الدین دسنوی

دلیسنہ لائبریری مرحوم

دسمبر کے وسط میں ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی سوانح حیات کی ترتیب کے سلسلے میں مواد کی فراہمی کے لیے خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری سے استفادہ کا موقع ملا۔ وہاں جناب ڈاکٹر عابد رضا بیدار کے تعاون سے جن کا ہمہ تن شکر گزار ہوں، کافی چیزیں دیکھنے کو ملیں انہی چیزوں میں دلیسنہ کے کتب خانے 'الاصلاح' کے ناظم عبدالحفیظ ندوی صاحب کے نام ایک خط اور اس کے ساتھ کتب خانہ مذکور کے معائنے کے سلسلے میں ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے جو اس وقت بہار کے گورنر تھے، تاثرات کے مطالعے کا موقع بھی ملا۔ ذاکر صاحب نے ۲۳ر جنوری کے ایک خط میں کتب خانے کے سلسلے میں عبدالحفیظ صاحب کو یہ لکھا تھا:

"ایک مدت سے خواہش تھی کہ دسنہ جا سکوں، بہت سے عزیز دوستوں کا وطن ہے اور پھر یہ کہ سید سلیمان ندوی جیسا جلیل القدر بزرگ اسی خاک سے اٹھا تھا۔ افسوس کہ سید صاحب مرحوم کے سامنے حاضری کا موقع نہ ملا... بہت سے احباب دیرینہ سے ملاقات ہوئی اور کتب خانہ الاصلاح کو دیکھنے کا بھی موقع مل گیا۔ بہت سے کتب خانے خالی روپے کے زور پر بنتے ہیں یہ شوقِ دانش اور ذوقِ علم کے زور پر بنا ہے... کتابوں اور رسالوں کا ایسا اچھا ذخیرہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ مکان ناکافی ہے، اس کی توسیع کے منصوبے ہیں۔ دعا کرتا ہوں کہ کامیاب ہو

جناب سید شہاب الدین دسنوی صاحب، تاج منزل ٹی۔این بنرجی روڈ۔ پٹنہ۔ ۸۰۰۰۰۱

اور سعادت جانوں گا اگر اس کو آگے بڑھانے میں کچھ سہارا دے سکوں۔"

ذیل کا مضمون اسی کتب خانے سے متعلق ہے، اس کے مصنف جناب شہاب الدین صاحب دسنوی ہیں، یہ ہماری زبان علی گڑھ کی ۲۲ اپریل ۱۹۶۱ء کی اشاعت میں چھپا تھا۔ دسنوی صاحب سے یہ شمارہ میں نے پٹنہ میں حاصل کیا اور چونکہ دسنہ کے اس تاریخی کتب خانے کی تعمیر و تشکیل کی روداد بڑی دلچسپ اور حوصلہ بخش ہے اس لیے اس خیال سے کہ ایک طرف تو قارئین جامعہ اس سے واقف ہو جائیں اور دوسری طرف یہ مضمون ایک رسالے میں محفوظ ہو جائے، ہم اسے رسالہ جامعہ کے اس شمارے میں مصنف اور ہماری زبان کے شکریے کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔

——— مدیر

۱۷ جولائی ۱۹۶۰ء کی تاریخ تھی اور اتوار کا دن۔ دس بجے کے قریب یکایک گڑگڑاہٹ کی آواز آئی، تھوڑی دیر میں دیسنہ لائبریری کی عمارت کے سامنے قبرستان کی زمین پر چند بیل گاڑیاں آکر کھڑی ہو گئیں۔ آس پاس کے بچے، بوڑھے جمع ہو گئے، ہر شخص پوچھ رہا تھا، کیا بات ہے؟ گاڑیاں کہاں سے آئی ہیں؟ کیوں آئی ہیں؟ اتنے میں کتب خانے کے ناظم مولوی سید عبدالحفیظ صاحب آگئے۔ انھوں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کتب خانے کا قفل کھولا۔ الماریوں سے کتابیں نکالی جانے لگیں۔ سات ہزار ایک سو چودہ کتابیں چن کر صندوقوں میں بھری گئیں اور صندوق گاڑیوں پر لادے گئے۔ گڑگڑاہٹ کی آواز ایک بار پھر سنائی دی اور گاڑیاں روانہ ہو گئیں۔ لوگوں نے سنا کہ ریاست بہار کے گورنر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے ایما سے کچھ لاریاں دیسنہ لائبریری کی کتابیں پٹنہ منتقل کرنے کے لئے آئی تھیں لیکن بارش کی وجہ سے راستہ خراب ہو گیا اس لئے لاریاں ایک میل کے فاصلے پر، استھانواں ہی میں روک دی گئی تھیں اور بیل گاڑیوں کے ذریعہ دیسنہ سے استھانواں تک کتابیں پہنچائی جا رہی تھیں۔ لوگوں نے یہ بھی سنا کہ اب یہ کتابیں پٹنہ کی خدا بخش خاں لائبریری (اورینٹل پبلک لائبریری) میں بڑی خوبصورت شیشے والی آہنی الماریوں میں رکھی جائیں گی۔ ان کی دیکھ بھال باقاعدہ سرکاری اخراجات سے ہوا کرے گی۔ اس حصے کا نام "دیسنہ لائبریری سیکشن" ہوگا۔ اور اس طرح جس کتب خانے کا فیض، دوری اور رسل و رسائل کی بعض دقتوں کی وجہ

سے بڑی حد تک محدود تھا، اب عام ہو جائے گا۔ تقسیم ہند سے پیدا شدہ حالات کے تحت جس ذخیرے کو سنبھالنا دشوار ہو رہا تھا اور خطرہ تھا کہ کہیں ضائع نہ ہو جائے، اب حکومت کی نگرانی میں محفوظ ہو جائے گا۔ یہ سب باتیں معقول بھی تھیں اور خوش کن بھی لیکن اس واقعہ کا جو اثر اہل دیسنہ کے دلوں پر ہوا اسے دائرۂ تحریر میں لانا آسان کام نہیں ہے۔ جن مٹھی بھر باشندگان دیسنہ نے بیل گاڑیوں کو رخصت کیا وہ سینوں میں جذبات کا کیسا بے پناہ طوفان دبائے، لبوں پر مہر سکوت لگائے حیران و ششدر دیکھ رہے تھے اور آنسو بہا رہے تھے۔ آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی تھیں اس پر یقین کرنے کو دل راضی نہ ہوتا تھا۔ ان کے سامنے ہی پُر وقار اور پُر سکون قبریں تھیں جن میں اُن کے اسلاف دفن تھے۔ ان قبروں میں کیسا نالۂ خاموش اُٹھا ہوگا! روحیں کس طرح تڑپی ہوں گی! —— کون بتا سکتا ہے:

اہل دیسنہ کو اپنے کتب خانے کے گنج گرانمایہ کو جُدا کرنے کا جتنا صدمہ ہوا اس کا اندازہ لگانا آسان نہیں۔ ان کے لئے یہ کتب خانہ کہاں تھا اسے تو وہ اپنے خون جگر سے سینچی ہوئی کشت آرزو سمجھتے تھے۔ یہ تو ان کی تمناؤں کا شجر بار آور، ان کی محنتوں کا ثمرہ، اُن کی روایات کا سرچشمہ، ان کی ثقافت کا مرکز، ایک گراں قدر ورثہ اور نہ جانے کیا کیا تھا۔

ایک چھوٹے سے قریہ میں، جس کی مجموعی آبادی ہزار بارہ سو نفوس پر مشتمل رہی ہو، جہاں سے قریب ترین ریلوے اسٹیشن بھی سات میل کی دوری پر ہو، اتنے بڑے ادبی خزانے کا اکٹھا ہو جانا یقیناً باعث استعجاب ہے۔ مولوی عبدالحق کی جہاندیدہ آنکھوں نے جب اسے دیکھا تو انھیں "حقیقی مسرت" ہوئی ان کے خیال میں اردو کتب اور رسالوں کا ایسا اچھا اور جامع مجموعہ شاید کہیں اور ہو۔" مولانا عبدالسلام ندوی نے اسے "نادر مجموعہ علم" کہا۔ آچاریہ کرپلانی کو "دیکھ کر اچنبھا ہوا کہ دیہات میں اتنی بڑی ورنیکلر لائبریری کیسے اکٹھی ہوگئی"۔ مولانا حفظ الرحمٰن نے اس کے علمی مخطوطات اور منتخب کتابوں کے مجموعے کے پیش نظر ارشاد فرمایا "یہ ہندوستان کی مایۂ ناز لائبریری ہے"۔ ڈاکٹر سید محمود نے اعتراف کیا "غالباً اردو کا یہ بہترین کتب خانہ ہے۔ میں نے اردو کتابوں کا اتنا بڑا ذخیرہ کہیں اور نہیں دیکھا[1]۔"

جن دوسرے اکابر نے کتب خانہ کا معائنہ کر کے اس سے ملتے جلتے خیال کا اظہار فرمایا

---

[1] واوین میں درج شدہ الفاظ کتب خانے کی وزیٹر بک (کتاب المعائنہ) سے ماخوذ ہیں۔

ان میں مولانا شفیع داؤدی، مولانا شوکت علی، مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی، مولانا مسعود عالم ندوی، ڈاکٹر ذاکر حسین، بابو راجندر پرشاد وغیرہ کے نام لائق ذکر ہیں۔

کتب خانے میں وقتاً فوقتاً ترقی اور توسیع ہوتی رہی۔ ایک بار لوگوں نے آپس میں چندہ کرکے اس کی عمارت بنوانے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ امام باڑے کی زمین پر دیواریں چھت کے لئے اونچی ہو چکی تھیں کہ غیر معمولی بارش نے ان کو منہدم کر دیا۔ مگر کچھ برسوں کے بعد ہی ۱۹۲۶ء میں ایک نئی، پختہ اور خوبصورت عمارت تیار ہوگئی جس میں تقریباً دس ہزار کتابیں جمع ہوگئیں۔ یہاں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اس کتب خانے کو نہ کبھی کسی رئیس کی سرپرستی حاصل ہوئی، نہ نواب کی، نہ تاجر کی، نہ کسی جاگیردار کی۔ فنڈ جمع کرنے کے لئے نہ کبھی باہر والوں کے سامنے دست سوال دراز کیا گیا اور نہ وہ صورتیں اختیار کی گئیں جو عام طور سے ایسے کاموں کے لئے کی جاتی ہیں۔ حکومت کی طرف سے مدد ملی بھی تو معمولی سی۔ جہاں تک کتابوں کی فراہمی اور ان کے تحفظ کے طریقۂ کار کا تعلق ہے، یہ ایک بڑی دلچسپ داستان ہے۔ اس داستان کے اکثر کردار اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں لیکن ابھی چند بہ قید حیات ہیں (اللہ ان کی عمریں دراز کرے!) اصلی داستان تو آن کی زبانی ہی سننے کے قابل ہوتی لیکن اب ان کے دلوں میں اتنی قوت کہاں سے ہوگی کہ وہ یہ غمناک نسانہ سنا سکیں۔ انھیں کرداروں میں ایک مولوی بشیر الحق بیدل ہیں۔

مولوی بشیر الحق بیدل دسنوی عظیم آبادی نے انٹرنس پاس کرنے کے بعد ملازمت کی تو محکمہ پولیس میں داروغائی کی۔ اس غیر شاعرانہ پیشے کی بدولت انھیں شہروں سے دور اکثر ایسے گاؤں اور علاقوں میں رہنا پڑا جہاں لوگ غالب اور شبلی کے نام تک سے بھی واقف نہ تھے۔ مگر ان کے شوق مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ اردو کی کوئی ایسی قابل لحاظ کتاب نہ ہوتی جو ان کی نظروں سے نہ گزرتی ہو۔ نتیجے کے طور پر ان کی نگاہ اتنی عمیق ہوگئی کہ اچھے خاصے محقق بھی ان کے سامنے کتابوں کی باتیں کرتے ہوئے گھبراتے۔ دسنہ لائبریری کے بہت سے گوشے اسی جوہر شناس کی نگاہِ انتخاب کے رہین منت تھے۔ ساری عمر پڑھنے گذری۔ وظیفہ ہوا تو پٹنہ پہنچے اور یہیں اپنے کلبۂ احزان میں مطالعہ کے سرمائے کو کھنگالنے لگے۔ "ہماری زبان" میں وقتاً فوقتاً تحقیقی نوٹ لکھنے لگے۔ پھر "باقیات اقبال" اور "اصلاحات اقبال" دو مختصر کتابیں شائع کیں۔ حالات سازگار ہوتے تو شاید ان کے دامن تحقیق

سے کچھ نوادر اور بھی چھلک پڑتے

کتب خانے کے سلسلے میں دوسرا نام پروفیسر نجیب اشرف ندوی[1] کا آتا ہے۔ طالب علمی کے زمانۂ قیام کے دوران نجیب اشرف صاحب کلکتہ کی وہ سڑکیں چھانا کرتے تھے جہاں قیمتی جواہر پارے کوڑیوں کے مول بکتے تھے۔ شرط صاحب نظر کی تھی اور ان کے صاحب نظر ہونے میں کسے شبہ ہو سکتا تھا! مشہور خطاط سلطان مشہدی کا لکھا ہوا عمر خیام کی رباعیات کا نسخہ جو دنیا کا اولین مصور نسخہ بھی ہے، نجیب صاحب نے کلکتہ کے فٹ پاتھ پر کتابوں کے ایک ڈھیر سے نکال کر اپنے لئے خریدا۔ فورٹ ولیم کالج کی بیسیوں مطبوعات اور بہت سی دوسری کتابیں انھوں نے دیسنہ کے کتب خانے کے لئے یہیں سے حاصل کیں۔

دیسنہ لائبریری کا ذکر ہوتا ہو اور سید عبدالحکیم کا نام نہ آئے، ویسی ہی بات ہوگی جیسے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا تذکرہ کیا جا رہا ہو اور سرسید کا نام نہ آئے، جامعہ ملیہ کا تذکرہ ہو اور ذاکر صاحب کا نام نہ لیا جائے۔

مرحوم سید عبدالحکیم، مولانا شبلی کے ہم عصروں کے لئے "ابوالکمال سید عبدالحکیم دیسنوی" تھے۔ اپنے، پٹنہ کے قارئین کے لئے "نام کے حکیم" اور اپنے ہم وطنوں کے "حکیم چچا" یا "حکیم بھائی" تھے لیکن دیسنہ لائبریری کے لئے وہ کیا تھے، اس کا جواب کون دے اور کیا دے؟ سوال یوں ہونا چاہئے کہ وہ اس کے کیا نہیں تھے! وہ لائبریرین بھی تھے، ناظم بھی، مشیر بھی تھے، نگراں بھی، سرپرست بھی تھے، کلرک بھی، سکریٹری بھی تھے، فراش بھی۔ دو سال ہوئے ان کا انتقال ہوا تو ان کے ایک بڑے عزیز ساتھی (جو خود مفلوج ہو کر صاحب فراش تھے) بڑے درد کے ساتھ بکا۔ اٹھو لوگو ؏ :

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

کتنی صحیح بات تھی!

ہم نے اس کتب خانے میں کتابوں کی فراہمی کی داستان شروع کی تھی۔ کتابیں خرید کر اور عطیہ جمع کرنے کا دستور تو عام ہے۔ اس لئے اہالیان دیسنہ سے بھی عطیے کی صورت میں کتابیں حاصل ہوتی

---

[1] ڈائرکٹر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی۔

تھیں مگر یہاں ایک اور طریقہ کتابوں کی وصولی کا بھی تھا۔ لائبریری کا نہ کوئی فنڈ رہا نہ بجٹ بنا۔ نہ کوئی سالانہ گرانٹ تھی اور نہ مستقل آمدنی کا کوئی ذریعہ۔ اس کے باوجود اردو کی جب کبھی کوئی اچھی کتاب چھپتی (خواہ وہ کسی قیمت کی رہی ہو) تھوڑے دنوں ہی میں لائبریری میں نظر آنے لگتی، اور دلچسپ بات یہ تھی کہ لائبریری کو وہ کتاب کبھی ایک آنہ سے زیادہ میں نہ پڑتی! اس کا راز کیا تھا، سن لیجئے۔ لائبریری کے ناظم سید عبدالحکیم کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ تاریخ و سیر، مذہب و فلسفہ، شعر و ادب، غرض ہر عنوان پر ان کی نگاہ گہری ہوئی تھی۔ رسالوں اور اخباروں میں وہ نئی کتابوں کے ریویو پڑھتے، ناشرین کی فہرستوں کا مطالعہ کرتے، پھر جب کوئی نئی کتاب لائبریری کے لئے منگوانی ہوتی تو دو پیسے کا کارڈ ناشر کو لکھ دیتے کہ اس کتاب کی ایک جلد فلاں صاحب کے پتہ پر وی۔ پی کر دی جائے، اور دوسرے کارڈ کے ذریعہ اس کارروائی کی اطلاع ان صاحب کو بھیج دی جاتی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جن لوگوں کے نام یہ حکم نامہ جاری ہوتا وہ صرف اہل دلیسنہ ہوا کرتے جو بسلسلۂ روزگار مختلف مقامات پر پھیلے ہوئے تھے۔ پھر ان کو یہ حکم ملتا کہ اگلی تعطیل میں وطن آؤ تو کتاب ساتھ لیتے آنا۔

اس طریقہ کار کا دلچسپ نتیجہ کبھی اس طرح ظہور میں آتا کہ چھٹیوں میں کوئی پیشکار صاحب بغل میں فلسفہ کی کتاب دبائے ہوئے یا پولیس کے حوالدار صاحب تاریخ ہسپانیہ لئے ہوئے یا وکیل صاحب تاریخ الاطباء لے کر لائبریری میں داخل ہوتے دکھائی دیتے۔ یہ کتابیں رجسٹر میں درج ہو جاتیں اور "کیفیت" کے کالم میں لکھا جاتا "عطیہ منجانب ــــــــ" بس یہی دو لفظ اس کتاب کی قیمت تھی جو اس کے خریدنے اور لانے والے کو لائبریری کی طرف سے ادا کی جاتی۔ یہ نسخہ ایسا آزمودہ تھا جو کبھی ناکام نہیں رہا۔ کیونکہ "حکیم چچا" یا "حکیم بھائی" کے اس حکم کو ماننے سے انکار کرنا، دلیسنہ کو وطن ماننے سے انکار کر دینے کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ جو ترکیب نئی کتابوں کے حاصل کرنے کے لئے استعمال کی جاتی وہی رسائل کے لئے بھی کام آتی تھی۔ اس طریقہ کار نے ایک طرف اہل دلیسنہ کو (چاہے وہ کہیں بھی رہتے ہوں) اردو کی اعلیٰ درجہ کی کتابوں اور معیاری رسالوں سے روشناس کرایا تو دوسری طرف انھیں کتابوں اور رسالوں کو سلیقے سے رکھنا بھی سکھا دیا۔ آبکاری کے ایک داروغہ اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں جب کہ وہ کسی چھوٹے موٹے قصبے میں تعینات تھے۔ انھیں اپنے ہم وطن علامہ سید سلیمان ندوی کی ذات گرامی پر بڑا فخر تھا اور عقیدت بھی۔ چنانچہ اسی جذبے کے تحت وہ

"معارف" کے خریدار بن گئے۔ ان کے الفاظ ہیں "ہر مہینے رسالہ آتا، سرورق پر دیسنہ کے سپوت سید سلیمان ندوی' کا نام چھپا ہوا دیکھ کر سر اونچا کر لیا کرتا مگر چونکہ مضامین عالمِ بالا سے تعلق رکھتے تھے اس لئے پڑھنے کی توفیق کبھی نہ ہوتی۔ ہاں دیسنہ والوں کی عادت کے مطابق بڑے سلیقے سے ان رسالوں کو میز پر جمع کرتا جاتا۔" ایک بار کسی الزام پر ان داروغہ صاحب سے کیفیت طلب ہو گئی۔ ایک افسر (جو اردو داں تھا) تحقیقات کے لئے آیا اور اتفاق سے اپنی رپورٹ اسی میز پر لکھنے بیٹھا۔ یہاں اس کی نظر "معارف" کے شماروں پر پڑی۔ حیرت ہوئی، آبکاری کا داروغہ اور معارف کا مطالعہ! جھجکتے ہوئے اس نے پوچھا: "آپ کے یہاں یہ معارف کیسے؟" بلا توقف داروغہ صاحب نے کہا۔ "حضور! میں تو اس کا مستقل خریدار ہوں۔" یہ سننا تھا کہ وہ رعب طاری ہوا کہ تحقیقات الگ رہی، افسر نے معذرت کرتے ہوئے اپنے گھر کی راہ لی اور "معارف" کے "قدردان" حیران و ششدر ان کا منہ دیکھتے رہ گئے۔

کتابوں اور رسالوں کی فراہمی کے بعد ان کی جلد سازی، حفاظت اور صفائی کی ذمہ داری دیسنہ کے نوجوانوں کی تھی۔ اور یہ کام ان کی جمعیۃ الطلباء انجام دیا کرتی تھی۔ جمعیۃ الطلباء کے ناظم کو دیسنہ لائبریری کا نائب معتمد تو بنا دیا جاتا تھا لیکن بے چارے طالب علموں کے پاس کون سا سرمایہ تھا جس سے وہ اپنی ذمہ داری پوری کر سکتے؟ چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں، والی بات تھی۔ بہت دنوں تک یہ ایک پیچیدہ مسئلہ بنا رہا۔ آخر اجتہاد کی نوبت آئی اور ایک انقلابی قسم کا فتویٰ دیا گیا۔

دیسنہ میں شادی کے موقعوں پر دولہا کے بازو پر امام ضامن باندھے جانے کی رسم ہے۔ خصوصاً رشتے کی عورتیں اس میں پیش پیش ہوتی ہیں۔ اس کے پیچھے عقیدے کے بجائے رسم کو دخل ہوتا تھا، کیونکہ شادی زیادہ تر آپس میں ہوا کرتی تھی اس لئے سفر کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ اور جب سفر درپیش نہ ہو تو پھر امام ضامن کا باندھنا غیر ضروری ہو جاتا ہے۔ ان باتوں کے مدنظر طلبہ نے فتویٰ دیا کہ ایسے تمام امام ضامن کھول کر جمعیۃ الطلباء کے سپرد کر دئے جائیں اور ان کی رقمیں کتب خانے میں جلد سازی کے حساب میں جمع کر دی جائیں۔ جب یہ بات عام طور پر معلوم ہو گئی تو عورتوں نے ہم خرما و ہم ثواب پر عمل کرتے ہوئے، اپنی شفقت کا اظہار کرنے اور کتب خانے کی ضرورت پوری کرنے میں اور زیادہ فیاضی سے کام لینا شروع کیا۔ جمعیۃ الطلباء کے ناظموں میں سید محمد نسیم (مقیم ڈھاکہ) بڑے

بااصول تھے۔ وہ ازمام ضامن کی رقمیں ہی نہیں، بلکہ کناری اور گوٹ لگے ہوئے کپڑے کو بھی بیچ کر رقم حاصل کر لیا کرتے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی ڈھاکہ کے مشہور معالج ڈاکٹر سید محمد شمیم نے بھی اپنی طالب علمی کے زمانے میں کتب خانے کی مختلف حیثیتوں سے بڑی خدمت انجام دی۔

علامہ سید سلیمان ندوی جب کبھی دیسنہ تشریف لاتے اپنے وقت کا کافی حصہ اس کتب خانے میں صرف کیا کرتے۔ ان کی بعض تصانیف تو جیسا کہ ان کے دیباچے میں درج ہے، یہیں بیٹھ کر مکمل ہوئیں۔ سید صاحب کو اپنے وطن کے ذرّے ذرّے سے کیسی بے پناہ محبت تھی۔ یہ ان کے خطوط (بالخصوص سید عبدالحکیم کے نام) بتائیں گے۔ ۱۰ مارچ ۱۹۲۷ء عیسوی کو انھوں نے لکھا: "رمضان کے دن گزر رہے ہیں مگر دیسنہ کا لطف میسر نہیں۔ وہاں کا عجیب نظارا رہے۔ فرصت مل سکے تو رمضان کا مہینہ لازماً دیسنہ میں بسر کروں۔" یہ تو نہ ہو سکا لیکن جب تک مولانا ہندوستان میں رہے وہ گرمی کے دنوں میں مہینہ ڈیڑھ مہینہ ہر سال اپنے وطن میں ضرور گذارا کرتے تھے۔ یہی حال ان کے بھتیجے مولوی سید ابوظفر ندوی (مصنف "تاریخ گجرات" وغیرہ) کا تھا جو بالالتزام احمد آباد سے آیا کرتے تھے۔

کتابوں کے علاوہ کتب خانے کی چھوٹی بڑی بیسیوں دوسری ضرورتیں، قلم دوات سے لے کر الماریاں، میز کرسی وغیرہ تک اہالیان دیسنہ انفرادی طور پر پورا کیا کرتے تھے۔ لائبریری کے سالانہ چندہ سے ان ضرورتوں کا پورا ہونا ممکن نہ تھا۔

دیسنہ لائبریری میں مخطوطات، نادر مطبوعہ کتابوں اور رسالوں کی جلدوں کی کوئی مطبوعہ فہرست نہیں تھی پھر بھی اس کی معنوی خوبیوں کا تعارف مختلف طریقوں سے کرایا جاتا رہا۔ اکتوبر ۱۹۲۲ء کے رسالہ "اردو" میں نجیب اشرف ندوی نے اپنے ایک مضمون میں اس کتب خانے کا اجمالی ذکر کیا۔ پھر راقم الحروف کا ایک مضمون "کتب خانہ الاصلاح[1]" کے عنوان سے رسالہ "ندیم" گیا میں دسمبر ۱۹۳۶ء کے شمارہ میں شائع ہوا جس کے ذریعہ یہاں کے قدیم اور نایاب رسائل، بعض مخطوطات اور نادر مطبوعہ کتابوں کا تعارف کرایا گیا۔ ۱۹۵۴ء میں کتب خانے کی طلائی جوبلی منائی گئی تو اس موقع پر جمعیۃ الطلبا نے اپنے ایک

---

[1] دیسنہ لائبریری کا اصل نام کتب خانہ الاصلاح ہے اس کا انتظام انجمن الاصلاح دیسنہ کے ذمہ تھا۔

سرگرم کارکن سید عبدالقوی کی مختصر کتاب "ایک اور مشرقی کتب خانہ" کے عنوان سے شائع کی۔ اس میں بھی اکثر مخطوطات اور نادر کتابوں کا ذکر ہے۔

غرض اس طرح جس کتب خانے کا فیض ۱۸۹۹ء سے مسلسل ۵۵ سال تک جاری رہا، جس ذخیرے نے اہل دیسنہ کے علمی شوق کو اُبھارا، جس نے ان کے دل و دماغ روشن کئے، جس نے ان کی ثقافتی زندگی کی قدروں کو اُجاگر کیا۔ آخر اس انمول خزانے کو خود اہل دیسنہ ہی نے ۱۷ر جولائی ۱۹۶۰ء کو یہ کہتے ہوئے دوسروں کے حوالے کر دیا ؂

سپردم بہ تو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

باقی نام رہے اللہ کا!

محمد اسلم

سلطان علاء الدین خلجی کے دو نقرئی تنکے

جولائی ۱۹۶۹ء کا ذکر ہے کہ میں ایک روز دہلی میں جامع مسجد سے چاندنی چوک جاتے ہوئے دریبہ کلاں سے گذرا۔ حسب عادت میں سناروں کی دکانوں پر سجائے ہوئے شوکیسز (SHOW CASES) پر گہری نظر رکھے ہوئے تھا۔ اتفاقاً میری نظر ایک شوکیس میں رکھے ہوئے علاء الدین خلجی (۱۲۹۶ء تا ۱۳۱۶ء) کے ایک نقرئی تنکے پر پڑی۔ میں نے دوکاندار سے اس تنکے کے بارے میں استفسار کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ فارسی یا اردو تحریر نہیں پڑھ سکتا اس لئے وہ اس سکے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ اس اطمینان کے بعد میں نے اس تنکے کی قیمت دریافت کی تو دکاندار نے دس روپوں کے عوض وہ تنکہ میرے ہاتھ فروخت کر دیا اب مجھے یہ اشتیاق پیدا ہوا کہ اگر مجھے علاء الدین خلجی کا ایک اور تنکہ مل جائے تو میرا سیٹ مکمل ہو جائے۔ میں نے سارا بازار چھان مارا لیکن علاء الدین خلجی کا اور کوئی سکہ دستیاب نہ ہوا۔

چند روز بعد میں اجمیر گیا۔ وہاں خواجہ معین الدین چشتیؒ اور سلطان حسین خنگ سوارؒ کے مزاروں پر حاضری دی اور "مسجد ڈھائی دن کا جھونپڑا" دیکھی۔ اس کے بعد میں نے اجمیر کے صرافہ بازار میں پرانے سکوں کے بارے میں پوچھنا شروع کیا تو ایک صراف نے مجھے چند سکے دکھائے۔ اتفاق سے ان میں علاء الدین خلجی کا نقرئی تنکہ بھی موجود تھا جو اس نے تیرہ روپوں کے عوض میرے ہاتھ فروخت کر دیا۔ یہ سکہ حاصل کرنے کے بعد میرا سیٹ مکمل ہو گیا۔

ان دونوں سکوں کی حالت بہت اچھی ہے لیکن کاریگر کی ذرا سی بے احتیاطی سے حاشیے

پروفیسر محمد اسلم، N/۴۵۰، سمن آباد، لاہور۔ ۲۵

پر پوری عبارت منقوش نہیں ہو سکی۔ ان سکوں کا وزن بالترتیب ۱۰۶۹۴۵ء۷ اگرین اور ۱۰۶۲۵ء۱ اگرین ہے۔ ان کا سائز ۲۸ ملی میٹر ہے۔

تنکے کے سیدھے رخ پر ڈبل لائنوں کے ایک مربع میں یہ عبارت منقوش ہے:

السلطان الاعظم علاالدنیا والدین ابو المظفر محمد شاہ السلطان

اسی طرح اُلٹے رخ پر ڈبل لائنوں کے مربع میں یہ عبارت درج ہے:

سکندر الثانی یمین الخلافۃ ناصر امیر المومنین

سکے کے اسی رخ پر حاشیئے پر یہ عبارت نقوش ہے:

ضرب ھذہ الفضۃ بحضرت دھلی فی سنۃ ست و سبعمایۃ

علاءالدین خلجی اپنے سکوں پر اپنے القاب سکندر ثانی اور محمد شاہ کندہ کروایا کرتا تھا۔ اس کی کنیت ابوالمظفر تھی جو اس کے سکوں پہ مضروب ہے۔ حسن اتفاق سے چتوڑ میں پیر غیبی کے مقبرہ کی مغربی دیوار پر ایک کتبہ نصب ہے، جس میں اس کے القاب اور کنیت کندہ ہیں۔ وہ عبارت یہ ہے:

شہر یار جہاں محمد شاہ — آفتاب زماں وظل اللہ
ابوالمظفر سکندر ثانی — شد مسلم بر و جہانبانی
عشر ذوالحجہ موسم قربان — سال بُد ہفت صد و نہ از ہجران
تا بود کعبہ قبلۂ عالم — باد ملک شاہ بنی آدم

ہانسی شہر کے پانچ دروازے ہیں، جن میں سے ایک کا نام بڑسی دروازہ ہے۔ یہ دروازہ سلطان علاءالدین خلجی کے عہد حکومت میں تعمیر ہوا تھا۔ اس دروازے پر جو کتبہ نصب ہے اس پر یہ عبارت منقوش ہے:

بعہد مملکت بادشاہ روئے زمین — خدائیگان سلطان شہ علاء الدین
ابوالمظفر شاہ جہان محمد شاہ — کہ باد مملکتش جاودان بروئے زمین
یگان خسرو گیہان سکندر ثانی — رسید صیت معادلش تا باعلیین
بسمت حضرت دہلی کہ ہست دارالملک — بامر خسرو دوران شدہ حصار حصین

بنا نمود شد بی نظیر دروازہ کز ارتفاع بہ کیوان کند ہمین تمکین
بنا نہادہ بروز دہم ربیع آخر بسال ہفت صد و سہ شدہ عمارت این[ا]

ان کتبات سے مترشح ہوتا ہے کہ سکندر ثانی کا لقب صرف اس کے سکوں پر ہی منقوش نہ تھا بلکہ نجی حلقوں میں بھی استعمال ہوتا تھا۔[۵] گمان غالب ہے کہ اس نے یہ لقب دکن اور راجستھان میں فتوحات کے بعد اختیار کیا تھا۔ اسی طرح اس نے تخت نشینی کے موقع پر اپنی کنیت ابوالمظفر رکھی۔[۶] یہ کنیت اس کے پیشرو سلاطین میں سے سلطان محمد غوری، شمس الدین التمش، فیروز شاہ بن التمش، مسعود شاہ بن فیروز شاہ، بہرام شاہ، ناصر الدین محمود، غیاث الدین بلبن، معز الدین کیقباد، کیومرث، جلال الدین خلجی اور اس کے فرزند رکن الدین ابراہیم نے بھی اختیار کی تھی۔[۷] امیر حسن علا سجزی نے سلطان علاء الدین خلجی کی مدح میں ایک قصیدہ میں یہی کنیت تحریر کی ہے۔[۸]

سلطان علاء الدین خلجی کے سکوں پر اس کا ایک لقب "ناصر امیر المومنین" بھی منقوش ہے۔ اس کے پیشرو سلاطین میں سے سلطان شمس الدین التمش نے بھی یہ لقب استعمال کیا تھا۔[۹] اسی طرح اس کا ایک لقب "یمین الخلافۃ" بھی تھا، جو اس کے سکوں کے علاوہ علائی دروازہ دہلی کے ایک کتبے میں بھی موجود ہے۔[۱۰] اسی طرح "سلطان الاعظم" بھی ایک معروف لقب تھا جو اس کے پیشرو کئی سلاطین کے سکوں پر مضروب ہے۔

سلطان علاء الدین خلجی کے پیشرو سلاطین میں سے شمس الدین التمش قانونی اور شرعی تقاضے پورا کرنے کی خاطر بغداد کے عباسی خلیفہ کی اطاعت کا دم بھرتا تھا۔ خلیفہ مستنصر باللہ نے اسے ہندوستان کا جائز حکمران تسلیم کرلیا تھا۔[۱۱] سقوط بغداد کے بعد سلاطین دہلی کا قاہرہ کے عباسی خلیفہ سے کوئی رابطہ قائم نہ ہوسکا تاہم وہ احتراماً اپنے سکوں کے ایک رخ پر عباسی خلیفہ کا نام مضروب کراتے رہے یا خود کو اس کا حامی و مددگار ظاہر کرتے رہے۔ علاء الدین کا عباسی خلیفہ کے ساتھ کوئی رابطہ نہ تھا اس کے باوجود وہ اپنے سکوں پر بڑے فخر کے ساتھ "یمین الخلافۃ ناصر امیر المومنین" منقوش کرواتا رہا۔ علاء الدین کے جانشین قطب الدین خلجی نے اپنے نام کے ساتھ

"الامام الاعظم خلیفہ رب العلمین" اور "خلیفۃ اللہ امیر المومنین" لکھنا شروع کیا۔[۷] یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ عباسی خلیفہ کی سیادت کو تسلیم نہیں کرتا۔ تغلق سلاطین میں سے محمد بن تغلق[۸] اور فیروز شاہ تغلق[۹] نے عباسی خلیفہ کے ساتھ از سر نو تعلقات قائم کئے اور اس کی سیادت کو قانونی اور شرعی حد تک تسلیم کرتے رہے۔

بہرحال میرے ذخیرۂ مسکوکات میں علاء الدین کے نقرئی تنکوں کا اضافہ میرے لئے خوشی اور اطمینان کا باعث ہے۔ اس زمانے میں ایک تنکے کی اتنی قدر و قیمت تھی کہ بقول حضرت چراغ دہلی سردیوں میں پشمینہ کا لباس تیار ہو جاتا تھا۔

حواشی

۱۔ کشوری سرن لال، خاندان خلجی، مطبوعہ دہلی ۱۹۸۰ء، ص ۱۲۷۔

۲۔ سردار علی احمد خاں، ملہات، مطبوعہ لاہور ۱۹۸۵ء، ص ۶۴۔

۳۔ ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، مطبوعہ علی گڈھ (تاریخ ندارد)، ج ۲، ص ۲۷۔
— اسکندر ثانی السلطان الاعظم علاء الدنیا والدین محمد شاہ خلجی —

۴۔ کشوری سرن لال، خاندان خلجی، ص ۶۲۔

۵۔ تھوماس، ای۔ دی کرونیکلس آف پٹھان کنگس آف دہلی۔ لاہور ۱۹۷۶ء، صفحات ۱۴۳، ۵۲، ۸۱، ۱۱۸، ۱۴۱، ۱۴۵ اور ۱۴۹۔

۶۔ امیر حسن علاء سجزی، دیوان حسن سجزی، مطبوعہ حیدر آباد ۱۳۵۲ھ، ص ۵۵

ابو المظفر سلطان علائے دولت و دین
کہ ہست او بخلافت سکندر ثانی

۷۔ تھوماس، ای، حوالہ سابقہ ص ۵۲۔

— السلطان المعظم شمس الدنیا والدین ابو المظفر التمش السلطان امیر المومنین —

۸۔ خلیق احمد نظامی ، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ، مطبوعہ دہلی ۱۹۵۸ء
ص ۳۴۶

۹۔ حبیب اللہ اے بی ایم ۔ دی فاؤنڈیشن آف مسلم رول ان انڈیا ۔ الہ آباد ۱۹۶۱ء ۔
ص ۱۰۵ ۔

۱۰ کشوری سرن لال ، خاندان خلجی ، ص ۲۳۱ ۔

۱۱۔ آغا مہدی حسین دی رائز اینڈ فال آف محمد بن تغلق ۔ لندن ۱۹۳۸ء ص ۱۶۹ ۔

۱۲ ۔ فیروز شاہ تغلق ، فتوحات فیروز شاہی ، مشمولہ تاریخی مقالات ، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۸ء ، ص ۲۱۰ ۔

کوائف جامعہ

۵؍جنوری ۱۹۸۶ء کی صبح تقریباً پانچ بجے شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ کے پرنسپل (ریٹائرڈ) اور دار المصنفین اعظم گڑھ کے سرگرم رکن جناب مرزا اسلفان بیگ صاحب کا انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ انتقال کی خبر جیسے ہی جامعہ پہنچی ہر طرف سوگواری کا عالم طاری ہوگیا۔

۹؍جنوری کو شعبۂ عرب ایرانین اینڈ اسلامک اسٹڈیز میں ایک تعزیتی جلسہ زیر صدارت پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی منعقد ہوا جس میں پروفیسر موصوف کے علاوہ جناب منظور احمد صاحب (او۔ ایس۔ ڈی جامعہ)، پروفیسر شعیب اعظمی، ڈاکٹر شفیق احمد خاں، ڈاکٹر محمد معظم جیراج پوری اور جناب عبد اللطیف اعظمی صاحب نے مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی خوبیوں پر عموماً اور ان کی علمی خدمات پر خصوصاً روشنی ڈالی۔ آخر میں جناب عبد اللطیف اعظمی صاحب نے ایک تعزیتی تجویز پیش کی جو ذیل میں نقل کی جا رہی ہے :

تعزیتی تجویز

افسوس کہ پچھلے اتوار کی صبح کو تقریباً پانچ بجے جناب مرزا شوکت سلطان بیگ صاحب کا للت پور کے ایک ویران علاقے راج گھاٹ میں حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے یکایک انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم مولانا شبلی نعمانیؒ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی تعلیمی یادگار

شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج کے مدت العمر پرنسپل رہے۔ نیز مولانا شبلی کی دوسری یادگار دارالمصنفین کے ایک طویل عرصے سے سرگرم اور فعال رکن تھے۔ مرحوم نے ان دونوں اداروں کے ذریعے ضلع اعظم گڈھ کی بالخصوص اور یوپی کے مشرقی اضلاع کی بالعموم جو شاندار خدمات انجام دی ہیں، ان کی وجہ سے وہ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ مرحوم کے زمانہ پرنسپلی میں کالج نے بہت ترقی کی اور گریجویٹ کالج سے ترقی کر کے بہت جلد پوسٹ گریجویٹ کالج کے درجے پر پہنچ گیا۔ اگر وہ کچھ عرصہ اور اس کے پرنسپل رہتے تو مکمل یونیورسٹی نہیں تو قومی اہمیت کی یونیورسٹی ضرور ہی بنوا دیتے۔

مرحوم کو جامعہ ملیہ اسلامیہ سے بھی بڑا گہرا اور مخلصانہ تعلق تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر محمد مجیب مرحومین جب بھی اعظم گڈھ تشریف لے گئے، شبلی کالج میں ان کا پرتپاک خیرمقدم کیا گیا۔ مرحوم مجیب صاحب کا ایک تعلیمی خطبہ شوکت صاحب ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے، جسے مرحوم نے چند گھنٹوں میں لکھ کر شبلی کالج میں دیا تھا۔

مرحوم کی زندگی کا ایک اور روشن پہلو قابل ذکر ہے۔ ویسے تو وہ ابتدا ہی سے مذہب اور مذہبی اقدار کا احترام کرتے تھے مگر کالج سے ریٹائر ہونے کے بعد مذہب سے ان کی والہانہ عقیدت اور وابستگی اور زیادہ پختہ اور راسخ ہو گئی۔ زندگی کے آخری زمانے میں مذہب کی خدمت ہی ان کی زندگی کا واحد مقصد رہ گیا تھا، ان کا جینا اور مرنا سب اسی کے لیے تھا۔

ادھر کچھ عرصے سے ان کی صحت قابل اطمینان نہیں تھی مگر ڈاکٹروں کے مشورے کے خلاف ان کی سرگرمیاں حسب معمول جاری رہیں۔ اس ماہ کی تین تاریخ کو وہ اپنی اہلیہ کے ساتھ اپنی لڑکی اور داماد سے ملنے کے لیے للت پور تشریف لے گئے، جس کے قریب راج گھاٹ ڈیم کی تعمیر کے سلسلے میں ان کے داماد کی پوسٹنگ ہے۔ ۵ رجنوری کی صبح کو جب وہ علی گڑھ کے سفر کی تیاریوں میں مصروف تھے، ان کا بلاوا آ گیا اور علی گڑھ کے بجائے آخرت کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ خوش قسمتی سے چندیری کے مشہور اور تاریخی قبرستان میں، جہاں بہت سے قومی ہیرو اور شہداء محو خواب ہیں، ان کو جگہ ملی اور دوسرے روز پیر کے دن زوال سے قبل سپرد خاک کیے گئے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی رحمتوں سے نوازے اور متعلقین کو صبر جمیل کی توفیق

عطا فرمائے۔ آمین۔

۴۵ واں نارتھ زون انٹر یونیورسٹی ہاکی ٹورنامنٹ

دہلی میں پہلی مرتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے گراؤنڈ پر نارتھ زون انٹر یونیورسٹی ہاکی ٹورنامنٹ منعقد ہوا۔ جموں کشمیر، ہماچل پردیش، پنجاب، ہریانہ، دہلی اور اتر پردیش کی تیس یونیورسٹیوں سے آئی ہوئی ٹیموں نے اس ٹورنامنٹ میں شرکت کی جس کا افتتاح دہلی کے لیفٹیننٹ گورنر ائیر وائس مارشل (ریٹائر) جناب ایچ۔ایل کپور نے ۳۰ر دسمبر ۸۵ء کو کیا۔ ٹورنامنٹ کا افتتاحی میچ جامعہ ملیہ اسلامیہ اور چندر شیکھر آزاد یونیورسٹی کانپور کی ٹیموں کے درمیان ہوا جس میں میزبان یونیورسٹی کی ٹیم نے اپنے مدمقابل ٹیم کو صفر کے مقابلے انیس گول سے شکست دے کر شاندار کامیابی حاصل کی۔

ٹورنامنٹ کے تمام مقابلے جامعہ ٹیچرس کالج کے نزدیک نئے ہاکی گراؤنڈ پر ہوئے۔ کوارٹر فائنل میں جو چار ٹیمیں براہ راست پہنچی تھیں وہ ہیں: گزشتہ سال کی نارتھ زون چیمپئن پنجابی یونیورسٹی، رنرس اپ گرونانک یونیورسٹی امرتسر، پنجاب یونیورسٹی، چنڈی گڈھ اور پنجاب اگریکلچرل یونیورسٹی لدھیانہ۔ اس کے علاوہ جو چار اور ٹیمیں ٹورنامنٹ میں اپنے کھیل کا اچھا مظاہرہ اور کامیابی حاصل کرکے پہنچیں وہ تھیں: جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی یونیورسٹی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور کرکشیتر یونیورسٹی۔ کوارٹر فائنل کے بعد لیگ کی بنیاد پر ٹورنامنٹ کے اختتام پر جن چار یونیورسٹیوں کے درمیان مقابلہ ہوا وہ تھیں: گرونانک دیو یونیورسٹی امرتسر، پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڈھ، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ پہلا مقام گرونانک دیو یونیورسٹی کو حاصل ہوا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور پنجابی یونیورسٹی کے پوائنٹ برابر تھے اس لئے سکّہ اُچھال کر دوسری پوزیشن کا فیصلہ کیا گیا اور یہ فیصلہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے حق میں گیا۔ اب نارتھ زون سے گرونانک دیو یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ٹیمیں آل انڈیا یونیورسٹی ہاکی ٹورنامنٹ میں حصّہ

لیں گی۔

۹ جنوری کو لیگ کے آخری میچ ہوئے اور میچ کے اختتام پر انعامات تقسیم کئے گئے۔ ابھی تک نارتھ زون انٹر یونیورسٹی ہاکی ٹورنامنٹ میں اول آنے والی ٹیم کے لئے کوئی ٹرافی نہیں تھی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اس کمی کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے ایک ٹرافی "ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید" کے نام سے منسوب کر کے قائم کی، یہ ٹرافی سپلا لمیٹڈ بمبئی کے تعاون سے قائم کی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید سپلا کے بانی اور جامعہ کے سابق استاد کیمسٹری رہے ہیں۔ جامعہ کے لئے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ہی یہ ٹرافی قائم کی گئی۔

تقسیم انعامات سے قبل جامعہ کے طالب علموں نے جامعہ کا ترانہ اور ایک مختصر کلچرل پروگرام بھی پیش کیا۔ بعد ازاں امیر جامعہ جناب خورشید عالم خاں صاحب نے ٹورنامنٹ کے موقع پر تیار کئے گئے ایک سووینئر (SOUVENIR) کا اجرا کیا۔ جلسۂ تقسیم انعامات کے لئے مہمان خصوصی مشہور اولمپک کھلاڑی جناب بلبیر سنگھ تھے۔ اُن ہی کے ہاتھوں سے گرونانک دیو یونیورسٹی کے کپتان نے فاتح ٹیم کے لئے ٹرافی حاصل کی۔ اس کے علاوہ پہلی تین پوزیشن حاصل کرنے والی ٹیموں کے کھلاڑیوں نے اسپورٹس اتھارٹی آف انڈیا کے عطا کئے ہوئے تمغے بھی حاصل کئے۔ بہترین اسکورر اور بہترین کھلاڑی کے لئے جامعہ کے ایک سابق طالب علم جناب رمّان سلیم کی دی ہوئی دو خصوصی ٹرافیاں بھی دی گئیں۔

اس ٹورنامنٹ کے آرگنائزنگ سکریٹری شری یوپندر سنگھ تھے جو فیکلٹی آف ایجوکیشن میں لیکچرر ہیں۔

یہ ٹورنامنٹ جامعہ میں اپنی نوعیت کا پہلا تھا اور اس طرح سے یہ ایک یادگار کی حیثیت سے برسوں تک لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ رہے گا۔

منوہر لال ہادی

سانیٹ

بھٹک رہا ہوں مِگوں سے سراب زاروں میں
ملی نسیم، نہ بادِ صبا، نہ بادِ مُراد
سفر نہ چھوڑ سکا میں کہ تھا اُمید نژاد
جو پر شکستہ تھے وہ جا بسے مزاروں میں

گِھرا ہُوا ہوں طلسمات کے حصاروں میں
سجے ہوئے ہیں جہاں صد ہزار آئینے
کہ جن میں قید ہیں حیرت مآب گنجینے
نظر اسیر ہے ان سحر زا نظاروں میں

ہزار سال پھرا اِعلم کے دیاروں میں
کِسی گلی نے بھی میرا پتہ نہ بتلایا
سوال لکھ کے بھی اپنے گلے میں لٹکایا
لکھا ہُوا تھا یہ شاید عدم کے غاروں میں

مرا اخیر ٹھکانہ تو ہے ستاروں میں
یہ اور بات مِگوں سے ہوں رہگزاروں میں

جناب منوہر لال ہادی - ۱۳۷ سیکٹر III آر کے پورم - نئی دہلی - ۲۲

ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی، نئی دہلی
کی طرف سے
ذہین اور باصلاحیت طلبہ کی اعلا تعلیم کے لیے
گراں قدر وظیفے

ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی، نئی دلی کے صدر جناب حکیم عبدالحمید صاحب نے اعلان کیا ہے کہ ان کی سوسائٹی نے ذہین اور طبّاع مسلم طلبہ اور طالبات کو معقول رقومات کے وظیفے دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ وظیفے سائنس اور سوشل سائنسز، خصوصاً اقتصادیات کے شعبوں میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے دیے جائیں گے۔

یہ وظیفے ہائی اسکول یا ہائر سکنڈری کے امتحان کے بعد ڈھائی ڈھائی سو روپے ماہانہ، بی ایس سی کی سطح پر ساڑھے تین تین سو روپے، پوسٹ گریجویٹ سطح کے لیے پانچ پانچ سو روپے اور ڈاکٹریٹ کی تعلیم کے لیے بارہ بارہ سو روپے ماہانہ کے ہوں گے۔ ان رقموں کے علاوہ کتابوں اور دیگر متعلقہ مصارف کے لیے بھی سالانہ تین سو سے ایک ہزار روپے تک دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

وظیفوں کے لیے طلبہ کا انتخاب کل ہند پیمانے پر ہوگا۔ اُمیدواروں کی ذہانت اور صلاحیت کا اندازہ امتحانات کے نمبروں کے علاوہ دوسرے ذرائع سے بھی لگایا جائے گا۔ اس لیے صرف وہی طالب علم درخواست بھیجیں جن کے نمبر گذشتہ امتحان میں کم از کم ۶۵ فی صد آئے ہوں۔ اس اسکیم کا مقصد ایسے غیر معمولی ذہین اور باصلاحیت طلبہ کو تعلیمی سہولت بہم پہنچانا ہے جو سائنس، سوشل سائنسز یا اقتصادیات کے کسی شعبے میں آگے چل کر اپنا مقام پیدا کر سکیں۔

ان وظائف کی شرائط اور دیگر تفصیلات حسب ذیل پتے سے حاصل کی جا سکتی ہیں:

سکریٹری، ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی،
ہمدرد نگر، نئی دہلی 110062

ماہنامہ جامعہ

مدیر: ضیاء الحسن فاروقی مدیر معاون: عبداللطیف اعظمی

جلد ۸۳	بابت ماہ مارچ ۱۹۸۶ء	شمارہ ۳

ماہنامہ جامعہ کا مجیب نمبر

جامعہ کے پچھلے شمارے میں اعلان کیا گیا تھا کہ ماہنامہ جامعہ سابق شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب کی یاد میں مجیب نمبر کے نام سے خصوصی شمارہ شائع کر رہا ہے جو ڈیڑھ سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہوگا، اور جس کی رعایتی قیمت پندرہ روپے ہوگی۔ اس شمارے کے ذریعے یہ اعلان کیا جا رہا ہے کہ چونکہ اس خصوصی شمارے کے لئے مضامین اور دیگر مواد کافی جمع ہو گیا ہے اس لئے اس کی ضخامت پہلے اندازے سے کہیں زیادہ ہو جائے گی اور اس کی رعایتی قیمت بھی پندرہ (۱۵) روپے سے زیادہ ہوگی۔ اس خصوصی شمارے کی کتابت شروع کرا دی گئی ہے، لیکن چونکہ اس میں وقت لگے گا، اس لئے یہ خصوصی شمارہ مئی ۱۹۸۶ء کے پہلے ہفتے میں شائع ہوگا، انشاء اللہ، اس دوران مارچ اور اپریل ۸۶ء کے مختصر پرچے نکلیں گے۔ صفحات کی خاصی تلافی خصوصی شمارے سے کر دی جائے گی۔

—— ادارہ

تبصرہ و تعارف

انفاس العارفین

نام مصنف : شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

نام مترجم : سید محمد فاروق القادری

ناشر : مکتبۃ الفلاح، دیوبند، ضلع سہارنپور، یو پی، صفحات ۴۱۵، طباعت آفسٹ

قیمت : اڑتالیس ۴۸ روپے

انفاس العارفین شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی مشہور و معروف تصنیف ہے جسے مصنف نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ مصنف علام دیباچے میں خود لکھتے ہیں: "اس کتاب کو میں نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے اور اس کا نام انفاس العارفین تجویز کیا ہے۔ پہلے دو حصوں کو میں نے دو علیحدہ رسالوں کی شکل میں مرتب کیا ہے، ایک کا نام "بوارق الولایۃ" اور دوسرے رسالے کا نام "شوارق المعرفۃ" رکھا ہے، تیسرا حصہ پانچ مقالات پر مشتمل ہے جن کے عنوانات حسب ذیل ہیں:

۱۔ الامداد فی مآثر الاجداد (خاندان مصنف کے حالات پر مشتمل)

۲۔ عطیۃ الصمدیۃ فی انفاس المحمدیۃ (مصنف کے نہالی جد حضرت الشیخ محمد پھلتی کے حالات میں)

۳۔ النبذۃ الابریزیۃ فی لطیفۃ العزیزیۃ (مصنف کے جد اعلیٰ مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی کے حالات میں)

۴۔ انسان العین فی مشائخ الحرمین (مصنف نے حرمین شریفین میں جن مشائخ سے استفادہ کیا ان کا ذکر خیر)

۵۔ الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف (مصنف کی خود نوشت)۔"

انفاس العارفین کے اس اردو ترجمے کے شروع میں "تقدیم" کے عنوان سے مترجم نے

ایک مفصل مقدمہ لکھا ہے جس میں خاص طور سے اس امر سے بحث کی گئی ہے کہ اس برصغیر میں ایک "گروہ ایسا ہے جو شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان کے تصوف اور اس سے متعلق خیالات و معمولات کے ساتھ انصاف نہیں کرتا، اور انھیں "ایک مخصوص انداز فکر کا ترجمان بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس گروہ کا خیال یہ ہے کہ شاہ صاحب کا جو حصہ تصوف سے متعلق ہے اس میں ایسا مواد ملتا ہے جس سے بریلویت کی خاصی تائید ہوتی ہے۔" (انفاس العارفین، صفحات ۱۳۔۱۴) ایک اور جماعت ہے جو اپنے "سردار" کی تقلید میں تصوف کی کچھ ایسی زیادہ قائل نہیں ہے، اس جماعت کے صاحب قلم سردار نے اپنے ایک مقالے میں لکھا ہے کہ "پہلی چیز جو مجھ کو حضرت مجدد الف ثانی کے وقت سے شاہ صاحب اور ان کے خلفاء تک کے تجدیدی کام میں کھٹکی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے تصوف کے باب میں مسلمانوں کی بیماری کا پورا اندازہ نہیں لگایا اور ان کو پھر وہی غذا دیدی جس سے مکمل پرہیز کرانے کی ضرورت تھی۔ حاشا کہ مجھے فی نفسہٖ اس تصوف پر اعتراض نہیں ہے جو ان حضرات نے پیش کیا۔۔۔ لیکن جس چیز کو میں لائق پرہیز کہہ رہا ہوں وہ متصوفانہ رموز و اشارات اور متصوفانہ زبان کا استعمال اور متصوفانہ طریقے سے مشابہت رکھنے والے طریقوں کا جاری رکھنا ہے۔۔۔ مسلمانوں کے اس مرض سے نہ حضرت مجدد صاحب ناواقف تھے نہ شاہ صاحب۔ دونوں کے کلام میں اس پر تنقید موجود ہے، مگر غالباً اس مرض کی شدت کا انھیں اندازہ نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں بزرگوں نے ان بیماروں کو پھر وہی غذا دیدی جو اس مرض میں مہلک ثابت ہو چکی تھی۔"

(مولانا مودودی، "منصب تجدید کی حقیقت۔۔۔"، الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر صفحات ۹۵۔۹۴)

مولانا مودودی نے الفرقان کے اسی خصوصی نمبر کے صفحہ ۴۶ پر جاہلیت خالصہ کے بیان کے بعد ایک دوسری قسم کی جاہلیت کا ذکر کیا ہے جو تصوف ہی کے ضمن میں پیدا ہوئی تھی اور جس میں انبیاء، اولیاء، صالحین، مجاذیب، اقطاب، ابدال، علماء، مشائخ اور ظل اللٰھیوں کی خدائی" "مشرکانہ پوجا پاٹ کی جگہ فاتحہ، زیارات، نیاز، نذر، عرس، صندل، چڑھاوے، نشان، علم، تعزیے اور اسی قسم کے دوسرے مذہبی اعمال کی ایک نئی شریعت"، "بغیر کسی ثبوت علمی کے ان بزرگوں کی ولادت و وفات، ظہور و غیاب، کرامات و خوارق، اختیارات و تصرفات اور اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کے تقرب کی کیفیات کے متعلق ایک پوری میتھولوجی" اور

"توسل اور استمداد روحانی اور اکتساب فیض" وغیرہ کا ذکر کرنے کے بعد تصوف کے قالب پر شرک و بدعت کی پھبتی کسی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس برصغیر میں تجدید و اصلاح کا ہر داعی اپنی دعوت کا سلسلہ شاہ ولی اللہؒ ہی سے جوڑتا ہے لیکن اکثر وہ ولی اللّٰہی فکر کا صرف ایک ہی پہلو لے کر اس فریب میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ وہ شاہ صاحب کے مکتب فکر کا ترجمان ہے۔ شاہ صاحب ایک مخصوص ہیئت فکریہ کے حامل تھے اور انھوں نے اپنی خداداد تاریخی بصیرت کے ساتھ اسلام، تعلیمات اسلام، اور تاریخ و تمدن اسلام کے مکمل فکر کو اس کے مختلف الوان وکیفیات کے ساتھ پیش کیا تھا۔ اس مکمل فکر کا ایک خاص گوشہ تصوف بھی تھا جس کی روایات کے ساتھ استہزاء، شاہ صاحب تاریخ کے ساتھ استہزاء تصور کرتے تھے۔ انھوں نے اس رمز کو پالیا تھا کہ ہندوستان میں اسلام کی خدمت و اشاعت کی راہ میں تصوف کی تعلیم، اس کی اصطلاحات اور اس کے رموز و اشارات پر ناسمجھی کی تنقید ایک بڑی رکاوٹ ہوگی۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ جو ولی اللّٰہی فکر کے مستند مفسر اور محقق ہیں، لکھتے ہیں: "ہند میں اسلام ایران کے راستے سے آیا لہٰذا یہاں فقہ حنفی آئی اور تصوف بھی آیا۔ بنا بریں ہند میں اسلام کی عظمت قائم کرنے والا کوئی محقق نہ فقہ حنفی سے قطع نظر کر سکتا ہے اور نہ تصوف سے بے نیاز ہو سکتا ہے۔" (الفرقان، شاہ ولی اللہ نمبر، صفحہ ۳۱۶)

شاہ ولی اللہ کی شخصیت ایک جامع الحیثیات شخصیت تھی، ایسی شخصیت کو سمجھنا مشکل ہوتا ہے کیونکہ اس کی دیدہ وری، دانشوری اور مذہبی و روحانی تجربوں کی مختلف سطحیں ہوتی ہیں، مثلاً یہی تصوف اور اس ضمن میں انفاس العارفین کو لے لیجئے۔ یہاں ہمیں شاہ صاحب ایک صوفی و مرشد کی مسند پر بیٹھے نظر آتے ہیں اور بے تکلف اپنے والدؒ اور خاندانی سلسلے کے بزرگوں کے کشف و کرامات بیان کرتے ہیں، صوفیانہ رموز و اشارات کی بات کرتے ہیں اور اپنی دوسری کتابوں میں طالبان سلوک کے لئے اوراد و وظائف تجویز کرتے اور تعویذات دینے کے طریقے بتاتے ہیں لیکن دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ ہر حادثے کا کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے اور جسے ہم خرق عادت حادثہ سمجھتے ہیں، وہ در اصل عادت وطبیعت ہی کے تحت ہوتا ہے، البتہ وہ نادر الوقوع ہوتا ہے۔ اپنی کتاب ہمعات میں شاہ صاحبؒ نے ایک بڑی اہم بات کہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ارباب تصوف پر بحث کرتے وقت ہمیشہ اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ ان بزرگوں کے ہر طبقے کے اقوال و احوال کو ان کے زمانے کے ذوق کے مطابق جانچا جائے۔ اس سلسلے میں یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ ہم ایک عہد کے ارباب تصوف کے اقوال و احوال دوسرے عہد کے معیاروں سے ناپتے پھریں۔" (اردو ترجمہ ہمعات، سندھ ساگر اکادمی لاہور، ۱۹۶۴ء)

ہماری کیسی بدنصیبی ہے کہ ہم اپنی تنگ نظری کے سبب شاہ ولی اللہؒ جیسی جامع العلوم شخصیت کو "بریلویت"، "دیو بندیت" یا "غیر مقلدیت" کے کنویں میں بند کرنے کی کوشش کریں۔ مفتی عنایت احمد کاکوروی رحؒ نے کیا اچھی بات کہی تھی کہ "شاہ ولی اللہ ایک ایسا شجر طوبیٰ ہیں جس کی جڑیں تو اپنی جگہ قائم ہیں اور اس کی شاخیں تمام مسلمانوں کے گھروں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ مسلمانوں کا کوئی ٹھکانہ ایسا نہیں جہاں اس درخت کی شاخیں سایہ فگن نہ ہوں ۔۔۔"

انفاس العارفین، بلاشبہ شریعت و معرفت کا خزینہ اور بقول مولانا عبید اللہ سندھیؒ "شاہ ولی اللہ کے فلسفے اور تصوف کی روح ہے۔" ترجمہ رواں ہے اور مکتبہ الفلاح دیوبند نے اسے شائع کرکے بڑا مفید کام انجام دیا ہے۔

—— ضیاء الحسن فاروقی

خبریں

دہلی میں پوپ جون پال کا استقبال

یکم فروری اور ۲ر فروری ۱۹۸۶ء کو دہلی کی کئی تقریبات میں پوپ جون پال ثانی کا شاندار استقبال ہوا۔ ایسی ہی ایک تقریب ۲ر فروری کی شام کو تھی جس میں عیسائیوں کے علاوہ ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں اور دوسرے مذاہب اور ممالک کے کوئی پچیس ہزار انسانوں نے اندرا گاندھی اسٹیڈیم میں معزز مہمان کو خوش آمدید کہا اور ان کی آمد کی خوشی میں امن و اتحاد کے موضوع پر اسکول کی بچیوں نے رنگا رنگ کلچرل پروگرام پیش کئے۔ اس موقع پر ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کی طرف سے ایک ایک شخص نے سات سات منٹ کی تقریریں۔ مسلمانوں کی نمائندگی کا قرعہ مدیر جامعہ ضیاء الحسن فاروقی کے نام نکلا تھا۔ انھوں نے اس موقع پر تقدس مآب پوپ پال کو خطاب کرتے ہوئے جو تقریر کی تھی، اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

"میں اپنی طرف سے اور اپنے ملک کے ہر نواسی کی طرف سے، چاہے اس کا مذہب اور اس کی ذات پات کچھ بھی ہو، تہہِ دل سے اس قدیم ملک میں آپ کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ یہ ملک جو ایک موزئیک (MOSAIC) کلچر کی سرزمین ہے جس میں دنیا کے تمام بڑے کلچر کے دھارے آکر ملے ہیں اور جو کثرت میں وحدت کا ایک خوشنما منظر پیش کرتی ہے۔

"آپ سے زیادہ کون اس امر سے واقف ہے کہ آج عالم انسانیت کو کیسے عظیم اخلاقی و روحانی بحران کا سامنا ہے۔ انسانیت بیمار ہے، انسانیت زخمی اور لہو لہان ہے اور سب حضرت انسان ہی کا کیا دھرا ہے۔ پچھلی دو صدیوں میں سائنس اور ٹیکنولوجی نے بڑی ترقیاں کیں، اور ان کے ساتھ مل کر ذہنی و فکری آزادی نے جدید مغربی تہذیب کی بنیاد رکھی جس نے اب عالمی تہذیب کا رتبہ حاصل کرلیا ہے۔ اس تہذیب پر جب غیر معمولی مادی اور سماجی ترقیوں کا نشہ چھا گیا تو عقل اور وحی کی ہم آہنگی پر اس کی گرفت ڈھیلی ہوگئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان دونوں کے مابین خلیج چوڑی ہوتی گئی اور اس کا نتیجہ اخلاقی انتشار، روحانی انحطاط اور قوتِ اخلاقی کو کمزور کرنے والی تشکیک کے فروغ کی صورت میں

رونما ہوا۔ سرمایہ داری نظام اور پھر اس کے بعد کمیونزم کے اثر سے صورت حال اور بھی خراب ہوگئی۔
آج دو بڑی طاقتوں کے مابین اسلحہ سازی اور اسلحہ بندی کا جو خطرناک طور پر مریضانہ مقابلہ ہے، اس کے سبب دنیا کے ذمہ دار دانشور اور سچی مذہبیت والے یہ محسوس کرتے ہیں کہ مشرق اور مغرب میں ہر جگہ ایک بے روح خلا پیدا ہے جہاں روحانی و انسانی اقدار بے بس ہو کر رہ گئی ہیں اور ایک ایسی جنگ کا خطرہ منڈلا رہا ہے جو دنیا کو نیست و نابود کر دے گی، اور مذہبیت خود اپنی جگہ غیر متحرک اور غیر فعال ہو کر رہ گئی ہے۔ اس اندھیرے میں بس روشنی کی ایک کرن ہے اور وہ یہ ایمان و یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کی رحمت دائمی اور ہر چیز پر محیط ہے انسان کو تنہا نہیں چھوڑے گا، اور اس پر اپنا فضل فرما کر عالم انسانیت کو تباہی سے بچالے گا۔

مسائل بہت ہیں جن میں سے ہم یہاں چند ہی کا ذکر کرسکتے ہیں: ہزاروں لاکھوں انسان بھیانک غریبی میں مبتلا ہیں اور نیوکلیائی اسلحوں کی تیاری میں بے تحاشا دولت خرچ کی جارہی ہے، ایسا کیوں ہے؟ لاکھوں انسان دنیا کے مختلف ملکوں کی سرحدوں پر ریفیوجی بن کر مصیبت اور جلاوطنی کی زندگی گذار رہے ہیں، بہت سے علاقوں میں بنیادی انسانی حقوق کو پیروں تلے کچلا جارہا ہے، قید خانے اور کنسنٹریشن کیمپ ہیں جہاں انسان جانوروں سے بدتر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں، منظم دہشت پسندی اور قتل و غارت گری ہے، مردوں اور عورتوں کا استحصال ہو رہا ہے آخر یہ سب کیوں ہے؟ کیوں ایسا ہے کہ انسان کی ترقی خود اس کے خلاف نبرد آزما ہے؟

میرا خیال ہے کہ آج اس صورت حال سے صرف مذہبی لوگ نبٹ سکتے ہیں بشرطیکہ، اور یہی خدا کا منشا بھی ہے، وہ باہم اشتراک و تعاون کریں اور متحد ہو کر آدمیوں کو انسان بنانے کی جدوجہد کریں، انھیں اللہ کا یہ حکم ہے کہ نیکی کے کام میں ایک دوسرے سے تعاون کرو۔

REGD. NO. D-(S.E.)-108 VOL 83 NO 3 MARCH 1986

The Monthly JAMIA

بیان ملکیت ماہنامہ جامعہ و دیگر تفصیلات

(بہ مطابق فارم نمبر ۴، قاعدہ نمبر ۸)

۱۔ مقام اشاعت : ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔ ۲۵

۲۔ وقفۂ اشاعت : ماہانہ

۳،۴۔ پرنٹر و پبلشر کا نام : عبداللطیف اعظمی

قومیت : ہندوستانی

پتہ : ۳۴۹۔ ذاکر نگر، جامعہ نگر نئی دہلی۔ ۲۵

۵۔ ایڈیٹر کا نام : پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی

قومیت : ہندوستانی

پتہ : اعزازی ڈائرکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔ ۲۵

۶۔ ملکیت : جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔ ۲۵

میں عبداللطیف اعظمی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

(دستخط) عبداللطیف اعظمی

فروری ۱۹۸۶ء

طابع و ناشر : عبداللطیف اعظمی
مطبوعہ : جمال پریس دہلی

ماہنامہ جامعہ

مدیر: ضیاء الحسن فاروقی   مدیر معاون: عبداللطیف اعظمی

جلد ۸۳ | بابت ماہ اپریل ۱۹۸۶ء | شمارہ ۴

جامعہ کا مجیب نمبر — ایک نظر میں

جامعہ کے گزشتہ شمارے میں اعلان کیا گیا تھا کہ ماہنامہ جامعہ سابق شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب مرحوم کی یاد میں ایک خصوصی شمارہ شائع کر رہا ہے جو ڈیڑھ سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہوگا۔

اس خصوصی شمارے میں خود مجیب صاحب کی بعض مطبوعہ تحریروں کے علاوہ انہی کی کچھ غیر مطبوعہ تحریریں بھی شامل ہیں۔ ان میں مجیب صاحب کی نامکمل خودنوشت سوانح اور مجیب صاحب کا لکھا ہوا اس ناٹک (ڈرامے) کا ایک سین بھی شائع کیا جا رہا ہے جسے وہ اپنی ناگہانی موت کی وجہ سے مکمل نہ کر پائے تھے۔ اس کے علاوہ مجیب صاحب کی ہمہ جہت شخصیت کا مختلف پہلوؤں اور مختلف زاویہ نگاہ سے جائزہ لینے کی بھی کوشش کی گئی ہے اور اس سلسلے میں جن حضرات کے مضامین اب تک موصول ہو چکے ہیں ان میں شیخ الجامعہ پروفیسر علی اشرف، محترمہ صالحہ عابد حسین، پروفیسر شمس الرحمان محسنی، ڈاکٹر سلامت اللہ، جناب عبداللہ ولی بخش قادری، پروفیسر محمد امین، پروفیسر اولاد احمد صدیقی، مولانا عبدالرحمان اصلاحی، جناب عبداللطیف اعظمی، پروفیسر سید جعفر رضا بلگرامی اور جناب محمد عرفان شامل ہیں۔ اس شمارے کی ایک خصوصیت

یہ بھی ہوگی کہ اس میں مجیب صاحب مرحوم سے متعلق کئی یادگار تصویریں شائع ہوں گی۔

یہ خاص نمبر تیاری کے مختلف مراحل میں ہے۔ خدا کرے کہ کاتب اور پریس کے تعاون سے یہ ہمارے منصوبے کے مطابق وقت پر شائع ہو جائے۔ امید ہے کہ ہمیں اس میں کامیابی ہوگی۔ قارئین اور ایجنٹ حضرات ابھی سے اپنی کاپیاں محفوظ کرا لیں تاکہ طباعت کے وقت اس تعداد کو ملحوظ رکھا جائے۔ بہتر ہوگا اگر ہمارے مستقل خریدار رجسٹرڈ پوسٹ کی قیمت مبلغ پانچ روپے ایڈوانس بھیج دیں تاکہ انھیں یہ بیش قیمت شمارہ موصول ہو جائے۔ کسی کو ڈاک کی بدنظمی سے اگر یہ شمارہ نہ ملا تو اس کی ذمہ داری ہم پر نہ ہوگی، اس لئے خریدار حضرات اپنے ڈاکخانے کو ابھی سے تاکید کر دیں۔

——— ادارہ

تبصرہ وتعارف

نام کتاب : بدایوں کے چند ادبار وشعرار

نام مصنف : مبشر علی صدیقی

ناشر : اردو سوسائٹی، گلی وحید بخش، محلہ سوتھ، بدایوں (یوپی)

قیمت : دس روپے سن اشاعت : ۱۹۸۲ء

بدایوں اپنی تاریخی قدامت، عہد وسطیٰ کی ہندستان میں کلیدی اہمیت، مذہبی، علمی اور ادبی شہرت کے اعتبار سے ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اس کو "مدینۃ الاولیاء" بھی کہا جاتا رہا ہے۔ بیسویں صدی میں بھی بدایوں کی علمی وادبی تاریخ کچھ کم تابناک نہیں رہی۔ اسی شہر نے ہمیں میر محفوظ علی بدایونی جیسا ممتاز طنز وظرافت نگار دیا جس کے قلم سے نکلے طنز کے نشتر اور مزاح کی کاٹ نے "ہمدرد" (مولانا محمد علی) کو مقبولِ عام کرنے میں مدد دی۔ یہیں سے یاسیات کے امام اور جدید اردو غزل کے چار ستونوں میں سے ایک فانی بدایونی نے ہمیں متوجہ کیا۔ سلطان حیدر جوش جیسا افسانہ نگار، پروفیسر ضیاء احمد بدایونی جیسا فارسی کا عالم اور محقق نیز پروفیسر آل احمد سرور جیسا مستند اور معتبر نقاد، یہ سب بدایوں ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ شکیل بدایونی جیسا رومانی شاعر اور دلاور فگار جیسا طنز ومزاح نگار شاعر بھی بدایوں ہی کی دین ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے شاعر، ادیب، محقق اور نقاد ہیں جو بدایوں یا اس کے نواحی اور قصباتی علاقوں سے تعلق رکھتے تھے یا ہیں۔

اسی "بدایوں کے چند ادبا وشعرا" پر مضامین کا یہ مجموعہ ہمارے سامنے ہے جس میں تقریباً ۱۶ مضامین ہیں۔ پہلا مضمون بدایوں کی تاریخی وادبی اہمیت پر ہے۔ بقیہ مضامین "فانی بدایونی کی کچھ یادیں"، "قمر الحسن قمر بدایونی"، "علی حاتم بدایونی"، "بدایوں کے تین شعرا"، "بدایوں کے دو نعت گو"، "ظہیر دہلوی کے ایک شاگرد نجم الدین احمد ثاقب بدایونی"، "ابرار حسین قادری"، "لکشمی نرائن جوہر بدایونی"، "شکیل بدایونی یادوں کے آئینہ میں"، "ابر گنوری کی یاد میں"، "آل احمد سرور — بحیثیت نقاد"، "دلاور فگار

کی مزاحیہ وطنزیہ شاعری'، 'سید محفوظ علی بدایونی ـــ طنزیات و مقالات'، 'ڈاکٹر سید محمود کا مقدمہ دیوانِ غالب (بدایوں ایڈیشن)'، 'ماہوار جریدہ چمن بدایوں' اور 'ماہوار رسالہ المنظور بدایوں' کے عنوانات کے تحت ہیں۔

کتاب کا پیش لفظ شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے استاد، ڈاکٹر انصار اللہ نظر نے لکھا ہے۔ اس کے علاوہ خود مصنف نے بھی "اس کتاب کے بارے میں" شروع میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ کتاب کی طباعت وکتابت کی خرابی کی وجہ سے صوری ومعنوی دونوں حیثیتیں بری طرح متاثر ہوئی ہیں۔

نام مجلہ : ادبی مجلہ (اپریل ۱۹۸۲ء)

نگراں : ڈاکٹر فیروز احمد

پیشکش : شعبہ اردو و فارسی۔ راجستھان یونیورسٹی، جے پور۔

اردو زبان کی ہمہ گیر مقبولیت میں راجستھان کی سنگلاخ زمین اور ریگزاروں کا بھی حصہ ہے۔ محمود خاں شیرانی جیسے محقق اور عالم، اختر شیرانی جیسا رومانی شاعر اور مشتاق احمد یوسفی جیسے طنز و مزاح نگار اسی ریاست سے وابستہ رہے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی نہ جانے کتنے ایسے ادیب، شاعر، نقاد اور افسانہ نگار ہیں جن کی علمی و ادبی تربیت راجستھان ہی کے کسی نہ کسی حصہ میں ہوئی۔ ٹونک کی ریاست تو زبان و ادب اور مذہبی علوم کا ایک ایسا نخلستان تھی کہ اس کے رفیع الشان آثار آج بھی اس کے ماضی کی عظمت وشوکت کی گواہی دیتے ہیں۔

آزادی کے بعد اردو زبان کی ترویج واشاعت اور اسے نئی نسل میں مقبول بنانے کا فریضہ ہماری یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے اردو انجام دے رہے ہیں۔ اور یہ بات بڑے اطمینان اور مسرت کی باعث ہے کہ راجستھان یونیورسٹی کے شعبۂ اردو وفارسی کی جانب سے 'ادبی مجلہ' کی سالانہ اشاعت کا اہتمام ہوتا ہے۔ زیر نظر مجلہ میں تیرہ علمی مضامین اور ایک افسانہ شامل ہے۔ علمی مضامین میں ڈاکٹر قمر رئیس (سجاد حیدر یلدرم ـــ چند ابتدائی تحریروں کی روشنی میں) ڈاکٹر محمد علی زیدی (اردو ادب میں علامتی رنگ)، ڈاکٹر اسرار لاری (مولانا حسرت موہانی ـــ ایک ممتاز صحافی) ڈاکٹر فضلِ امام (حلقۂ اربابِ ذوق)، جناب عبد القوی دسنوی (ذوق دہلوی ـــ شخصیت اور فن)،

زبیر احمد برکاتی صاحب (دو مضمون، دو شخصیتیں) ڈاکٹر جگدیش نرائن کلشریسیٹھ (زبان فارسی در ہند — وضع تحصیلات آنہا)، مدبر علی زیدی (نیا افسانہ — سمت و رفتار)، ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی (اصنافِ ادب میں خطوط کی اہمیت)، ڈاکٹر روشن اختر کاظمی (رومی — حیات اور شاعری)، نعمت اختر خان صاحب (ہیئت کی تفہیم)، آنسہ عابدہ فریدی (اختر انصاری کے قطعات میں نشاط)، آنسہ فیروز اختر شیرانی (اختر شیرانی — ایک تعارف) اور ڈاکٹر فیروز احمد ([illegible] ناصر علی دہلوی) شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ارشاد حسین فاروقی صاحب کا "دو ٹوٹیاں" کے عنوان سے ایک افسانہ بھی شاملِ اشاعت ہے۔

کتابت و طباعت کے اعتبار سے یہ مجلہ "مجلّہ" ہے [illegible] امید ہے کہ اس کی تمام علمی و ادبی کوششوں کا خیر مقدم کیا جائے گا۔ ہماری دعا ہے کہ راجستھان یونیورسٹی کا شعبۂ اردو و فارسی دن دونی رات چوگنی ترقی کرے اور اس کی علمی و ادبی سرگرمیوں سے ہم سب مستفید ہوتے رہیں۔

— اختر انصاری

مجھے یاد ہے کہ میں ایک بار ایک روسی آرٹسٹ [illegible] کو قطب کی سیر کرانے لے گیا تھا۔ انھوں نے اس محراب (مسجد قوت الاسلام کی اونچی محراب) [illegible] سے نہیں دیکھی۔ بڑی دیر تک وہ اسے محویت کے عالم میں خاموش کھڑی دیکھتی رہیں۔ اور جب جانے کا وقت آیا تو ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ واقعی [illegible] حسن کو اپنے اندر سرایت کرنے دیں تو ہم محسوس کریں گے کہ وہ [illegible] شکلیں اور [illegible] کی [illegible] ہے۔ اس میں وہ کامل سکون ہے [illegible] شان ہے۔ اس میں ایک فینٹاسی [illegible] کی [illegible] کا ابدی مراقبہ ہے۔ [illegible] کامل کا عنصر اور وہ دل آویزی جسے بیان کرنے کی آرزو شاعروں کے دل کو حسرت سے آباد رکھتی ہے۔ یہ محراب فنِ تعمیر اور سنگ تراشی سے بالاتر [illegible] دروازہ جس سے گذر کر ہم تصورات اور احساسات کی ایک لامحدود فضا میں پہنچ جاتے ہیں۔

(پروفیسر محمد مجیب — قطب کی عمارتوں کا مجموعہ)

منوہر لال ہادی

سانیٹ

سوچتا ہوں لوگ جس تصویر کو کہتے ہیں خواب
وہ سحابِ آرزو کا سایۂ رنگیں نہ ہو
کاوشِ بے کیف کا اجر طلسم آگیں نہ ہو
یا کہیں ضدی سوالوں کا نہ ہو دلکش جواب

سوچتا ہوں لوگ جس غنچے کو کہتے ہیں گلاب
اُس میں اُن کی صورتِ دلبر نظر آتی نہ ہو
اُس کی خوشبو ان پہ کوئی یاد برساتی نہ ہو
اور جگا دیتی نہ ہو بیتے ہوئے لمحوں کا باب

سوچتا ہوں لوگ کہتے ہیں جسے کارِ ثواب
اُس کے رنگِ شوخ میں رنگِ غرض شامل نہ ہو
ماتموں کا ظاہری چہرہ کہیں باطل نہ ہو
اُن کو اکساتی نہ ہو خلدِ بریں کی آب و تاب

سوچتا ہوں جس کو کہتے ہیں سخنور اضطراب
ہو نہ ان کی نارسائی کا عطا کردہ عذاب

جناب منوہر لال ہادی، ۱۳۷، سیکٹر III آر کے پورم - نئی دہلی ۱۱۰۰۲۲

تہذیبی و ادبی خبریں

نئی دہلی ۔ ۷ مارچ کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اسلامک اینڈ عرب ایرانین اسٹڈیز میں روسی ماہر ایرانیات محترمہ لیلی جالنوا نے 'سوویت یونین میں ایران شناسی' پر اپنا مقالہ پڑھا۔ جلسے کی صدارت جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے پروفیسر عبدالودود انصاری نے فرمائی۔ مقالہ سے پہلے صدر شعبہ پروفیسر شعیب اعظمی نے محترمہ لیلی جالنوا کا مختصر تعارف کرایا۔ اس موقع پر دانشکدہ زبانہای شرق، دانشگاہ ماسکو کی استاد محترمہ کارمالیلنوا اور ڈاکٹر احمد اشرف بھی موجود تھے۔

حیدرآباد ۔ 'مولانا آزاد اور قومی یکجہتی' کے موضوع پر حیدرآباد میں ایک سیمینار منعقد ہوا۔ اس کے افتتاحی اجلاس میں ڈاکٹر علی محمد خسرو صدر نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پبلک فنانس نے کہا کہ ہندوستان میں جمہوری اور سیکولر نظام حکومت مولانا آزاد، مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو جیسے قائدین کی دین ہے ورنہ قیام پاکستان کے بعد ہندوستان میں بھی ہندو راج قائم ہو سکتا تھا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہندوستان میں مختلف نسلوں، مذہبوں اور تہذیبوں کے لوگ مختلف ادوار میں آتے رہے، اور ان کے سامنے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہ تھا کہ وہ مل جل کر زندگی بسر کریں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ مولانا آزاد کی ایک خوبی یہ تھی کہ انھوں نے زندگی بھر اپنی تقریر یا تحریر میں کوئی ایسی بات نہ کہی جس سے کسی غیر مسلم کی دل آزاری ہوتی ہو۔ یہ ان کی عظمت تھی۔

علی گڑھ ۔ اردو کے صاحب طرز ادیب پروفیسر رشید احمد صدیقی کی یاد میں یہاں "یوم رشید" کا اہتمام کیا گیا جن مختلف حضرات نے ان کو خراج عقیدت پیش کیا ان میں مسلم یونیورسٹی کے قائم مقام وائس چانسلر پروفیسر وصی الرحمٰن، پروفیسر اسلوب احمد انصاری، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، اور ڈاکٹر نصیر احمد وغیرہ شامل ہیں۔

گورکھپور ۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے ایک جلسہ میں [illegible] ریڈیو کے اردو پروگرام کے انچارج اور مہمان خصوصی جناب عبدالباری انجم نے بتایا کہ مشہور عشقیہ داستان لیلیٰ مجنوں کا

REGD-NO.D-(S.E.)-108 VOL 83 NO 4 APRIL 1986

The Monthly JAMIA

یہ پروفیسر دراصل عربی زبان کا ایک بڑا شاعر تھا جس کا دیوان یورپ کی ایک لائبریری میں محفوظ ہے

اعظم گڑھ۔ یہاں فروری ۱۹۸۶ء میں دار المصنفین کی مجلس انتظامیہ کے جلسے کے موقع پر پروفیسر خلیق احمد نظامی نے "شبلی بحیثیت مورخ" کے زیر عنوان ایک توسیعی مقالہ پیش کیا۔ اس تقریب کی صدارت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے کی اور شہر کے ممتاز معززین، علمائے کرام اور رفقائے دار المصنفین نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔

اسلام اور عصر جدید کا خاص شمارہ

اسلام اور عصر جدید کا اپریل ۱۹۸۶ء میں خاص شمارہ شائع ہوگا۔ اس میں اجتہاد، اسلام میں عورتوں کے حقوق، مذہب، قانون اور اخلاق، مسلمانوں کے ملی تشخص کا مسئلہ اور تدوین فقہ کی تاریخ جیسے اہم موضوعات پر چند مشہور علماء اور دانشوروں کے مضامین شامل ہوں گے۔ ان میں ڈاکٹر سید عابد حسین مرحوم، مفتی محمد رضا انصاری، مولانا محمد تقی امینی، مولانا منت اللہ رحمانی، مولانا ابو العرفان ندوی، پروفیسر مشیر الحق، پروفیسر طاہر محمود، ڈاکٹر رشید احمد جالندھری اور مولانا شاہ نعیم عطا (مرحوم) کے نام قابل ذکر ہیں۔

اس خاص شمارے کی قیمت دس روپے ہے جو حضرات اسے رجسٹرڈ منگانا چاہیں وہ براہ کرم پانچ روپے مزید ارسال فرمائیں۔ مستقل خریداروں کو یہ شمارہ حسب معمول بھیجا جائے گا۔ لیکن اگر وہ دوبارہ طلب کریں گے تو انھیں یہ شمارہ دس روپے میں ملے گا۔

—— ادارہ

طابع و ناشر: عبد اللطیف اعظمی
مطبوعہ: جمال پریس دہلی

سالانہ قیمت
۱۵ روپے

جامعہ

قیمت فی شمارہ
ڈیڑھ روپے

جلد ۸۳	بابت ماہ مئی ۱۹۸۶ء	شمارہ ۵

فہرست مضامین

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

مدیر معاون

عبداللطیف اعظمی

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی، مطبوعہ: جمال پریس دہلی، ٹائیٹل، فائن ...

شذرات

جانے والے کی یاد آتی ہے اور سو سو طرح سے آتی ہے۔ ذاکر صاحب کا انتقال آج سے سترہ برس پہلے ۱۹۶۹ء میں ۳ مئی کو ہوا تھا، ہر سال ۳ مئی کو ان کی برسی کا دن ہوتا ہے، اور بیگم صاحبہ اور دیگر اہل خاندان کے ساتھ ذاکر صاحب کے بے شمار عقیدتمند اُن کی عظیم اور حسین شخصیت کو یاد کرتے ہیں، ان کے کارناموں اور احسانات کو یاد کرتے ہیں جن کے بوجھ سے ملک و ملت دونوں کبھی کبھی سبک بار نہیں ہو سکتے، ان کے خیالات، ان کے عزائم، ان کی باتیں کہ دلوں میں کچھ کر جانے کا حوصلہ پیدا کرتی تھیں، ان کی موثر خطابت جس میں بصیرت اور مسرت، دونوں کی رعنائیاں اور گہرائیاں ہوتی تھیں، یہ سب کچھ یاد آتا ہے اور دلِ حساس ایک قسم کے "غم بیدار" کی کیفیت سے لذت آشنا ہوتا ہے۔ آج ہم اپنے قارئین کے سامنے ذاکر صاحب کی بصیرت افروز خطابت کی چند جھلکیاں پیش کریں گے، خطابت سے قطع نظر اس میں آزاد ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے مذہبی اور قومی مشن کا ایک خاکہ بھی ہے، بشرطیکہ وہ سمجھیں اور عمل کریں۔

لیکن اس سے پہلے ہم مجیب صاحب کی لکھی تقریر کا ایک ٹکڑا نقل کریں گے کہ اس سے ذاکر صاحب کی باتوں کا حسن اور اجاگر ہوگا۔ مجیب صاحب لکھتے ہیں: "آخری بارہ تیرہ سال چھوڑ کر باقی عمر ڈاکٹر ذاکر حسین نے تعلیمی کاموں میں صرف کی۔ یہ کام بھی تبھی ہو سکتے ہیں جب خلوص اور قابلیت رکھنے والے ساتھی ملیں، وسائل ہوں، یکسوئی ہو۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کو ساتھی ملے لیکن سب کی طبیعتیں الگ، صلاحیتیں الگ اور حوصلے الگ تھے۔ جامعہ میں، وسائل کی کمی نے انھیں پریشان رکھا، علی گڑھ میں وسائل کی فراوانی نے، جو انھیں کی بدولت حاصل ہوئے تھے۔ یکسوئی انھیں کبھی

نصیب نہ ہوئی۔ پھر بھی وہ آزاد رہے۔ اپنی نظر کو حالات سے بالاتر رکھا اور یہ سوچے بغیر کہ وہ بیج بکھیر رہے ہیں، جمیں گے اور پھوٹیں گے یا نہیں، اپنے خیالات بیان کرتے رہے۔ یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ کس پر کتنا اثر ہوا، مگر ایسے بہت سے لوگ ملیں گے جن کے لئے ان کا کوئی قول کوئی خیال مشعل راہ بن گیا۔ اس تعلیمی جد و جہد نے ڈاکٹر ذاکر حسین کے ادبی ذوق اور صلاحیت کو نمایاں کیا، اگرچہ ان کی زبان میں جو لطف تھا اسے دیکھتے ہوئے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ دراصل وہ ادیب تھے اور قومی ضرورت اور مصلحت نے انھیں معلم بنا دیا۔"

مارچ ۱۹۵۲ء میں علی گڑھ میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں اپنا خطبۂ صدارت پیش کرتے ہوئے ذاکر صاحب نے فرمایا تھا: "لازمی مذہبی تعلیم کی کوئی تین چوتھائی صدی میں تو ہم اپنے اسلامیہ مدرسوں اور کالجوں کے لئے دینیات کا کوئی قابل اطمینان نصاب بھی نہ بنا سکے۔ اب اس کام کو کرنا چاہیئے۔ دین کی قانونی اور فقہی موشگافیوں کی تعلیم دین کا مرکز بنانے کی جگہ، شاید ہمیں اپنے نئے نصاب میں، اس کی زندگی کی بنیادوں کو استوار کرنے والی، فکر و عمل کی سمت درست کرنے والی، زندگی کو نوامیس قدرت سے ہم آہنگ بنانے والی، روح کو تڑپانے اور دل کو گرمانے والی، سیرت کو یکسو اور شخصیت کو مضبوط بنانے والی صفتوں کو اجاگر کرنا زیادہ ضروری معلوم ہو۔ شاید اب ہم اس کی مرکزی تعلیمات کو قرآن کے انقلاب انگیز پیام سے اور اس کی عملی انسانی شکل کو اسوۂ حسنۂ نبویؐ سے ذہنوں اور دلوں میں پہونچانے پر زیادہ توجہ کریں . . . اگر ایسا ہو سکا . . . تو اختیاری ہونا دینی تعلیم کے لئے مبارک ثابت ہوگا۔ دینی تعلیم، دینی تعلیم بن جائے گی۔ چندہ بٹورنے کا بہانہ نہ رہے گی۔ اس سے ایک بہتر ماحول پیدا ہوگا جس میں مذہب لڑنے لڑانے کا ہتکنڈا نہ ہوگا بلکہ زندگی کو معنی و مقصد بخشے گا، اس کے لئے ایک اخلاقی و روحانی اساس مہیا کرے گا، اقدار عالیہ سے تعلق و شیفتگی پیدا کرے گا، اپنی تنویری قوت سے زندگی کو روشن اور اپنی تخلیقی طاقت سے اسے مالا مال کر سکے گا۔"

مئی ۱۹۵۶ء میں مسلم یونیورسٹی کا ایک وفد ذاکر صاحب کی قیادت میں سعودی عرب گیا تھا، وہاں مقیم ہندوستانیوں کی طرف سے اس کی خدمت میں ایک سپاس نامہ پیش کیا گیا تھا،

ذاکر صاحب نے اس سپاس نامے کے جواب میں جو تقریر کی تھی، اس میں کہا تھا کہ "حضرات میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانان ہند کا مقام ہندی قوم میں آج ایک خاص حیثیت رکھتا ہے۔ مسلمان آبادیاں دنیا میں بہت ہیں، کہیں خدا کے فضل سے وہ اپنی زندگی کی تشکیل میں خود مختار ہیں، کہیں دوسروں کے زیر اقتدار آزادی سے محروم۔ مسلمانان ہند کی پوزیشن یہ ہے کہ وہ کسی کے زیر اقتدار نہیں لیکن تنہا اقتدار بھی نہیں رکھتے۔ وہ ایک آزاد جمہوریہ میں آزاد شہری کی حیثیت رکھتے ہیں جس کی آبادی مختلف مذاہب و مسالک، مختلف السنہ اور مختلف تاریخی و تمدنی عناصر پر مشتمل ہے۔ اسلام کی جو حیثیت عالمی زندگی میں ہونی چاہیے مسلمانوں کی وہی ہندوستانی زندگی میں ہے۔ جس طرح دنیا میں مسلمانوں کو اپنے سے مختلف اعمال و اعتقاد رکھنے والوں کے ساتھ زندگی گذارنی ہے اور اپنی مثال، اپنے افکار کی بلندی، اپنے کردار کی خوبی سے ایک صالح اور صحتمند زندگی کا نمونہ دوسروں کے سامنے پیش کرنا ہے اسی طرح مسلمانان ہند پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ مشترک اور مختلف العناصر ہندی قوم میں حیات طیبہ اسلامیہ کا ایسا نمونہ پیش کریں جس سے ان کے ہم وطنوں کے دلوں میں ان کے دین کے لئے جگہ پیدا ہو، زندگی کی وہ اعلیٰ قدریں جن کے یہ حامل ہوں عام ہندوستانی زندگی کو متاثر کریں اور یہ کہ رحمۃ للعالمین کے نام لیوا ہیں اپنے وطن اور اہل وطن کے لئے مثال اور رحمت کا کام دیں ...... یہ ایک بڑا فریضہ ہے اور ایک عظیم الشان مشن، اور میں اس کا حق ادا کرنے کی دشواریوں سے ناواقف نہیں ہوں۔ یہ ہے "مقصد سے از آسمان بالاترے"، لیکن آسمان کے ستاروں کو دیکھ کر ہی سمندر کی تاریکیوں میں حوصلہ مند ملاحوں کے بیڑے پار لگتے ہیں۔ مسلمانان ہند کا شرف یہ ہے کہ ان کے افکار سے ہندی زندگی بہرہ یاب ہو، ان کی انفرادی اور جماعتی زندگی کے معیاروں کو ہندی نظام اقدار میں جگہ ملے .... اسلام کی حیات بخش اور روح پرور تعلیم کسی گروہ کا اجارۂ تجارتی نہ رہے بلکہ ساری ہندی قوم اس چشمۂ فیض سے اپنی تشنہ کامی دور کر سکے۔ یہ دیانت، خلوص، مروت، خدمت و ایثار کی ایسی مثالیں قومی زندگی کو بخشیں کہ قوم احسان مندی سے انھیں اپنی سربلندی کا سرمایہ جانے۔ .... ہے تو بہت مشکل کام، مگر سچے مسلمان کا حوصلہ اس سے کم پر راضی نہیں ہوتا اور میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانان ہند کے لئے اس حوصلے کے پورا کرنے کی سبیل علی گڑھ ہی نکال سکتا ہے۔ .... دعا فرمائیے کہ وہ اس دشوار و دلربا کام کو انجام دے سکے۔

ہم نے چاہا تھا کہ مئی کا شمارہ مجیب نمبر ہو لیکن سارے ارمان کہاں پورے ہوتے ہیں، ایسی اڑچنیں اور رکاوٹیں پیش آئیں کہ ہماری یہ خواہش نہ پوری ہو سکی۔ مجیب نمبر کا کام جاری ہے اور اب اس کی قوی امید ہے کہ انشاء اللہ جون جولائی ۸۶ء کا شمارہ مجیب نمبر ہوگا۔ آج ۱۵ اپریل تک ایک سو بیس صفحے کی کتابت ہو چکی ہے، تصویروں کے بلاک بھی بن چکے ہیں، دعا فرمائیے کہ اب مزید تاخیر نہ ہو۔ قارئین اور ایجنسیاں اس اہم نمبر کی اپنی کاپیاں ابھی سے محفوظ کرالیں۔ بہتر ہوگا اگر ہمارے مستقل خریدار رجسٹرڈ پوسٹ اور پیکنگ وغیرہ کا خرچ مبلغ پانچ روپے ایڈوانس بھیج دیں۔ تاکہ انھیں یہ بیش قیمت مجیب نمبر ضرور مل جائے۔ کسی کو ڈاک کی بدنظمی سے اگر یہ خاص نمبر نہ ملا تو اس کی ذمہ داری ہم پر نہ ہوگی۔ خریدار حضرات ابھی سے اپنے ڈاک خانے کو تاکید کردیں، دوبارہ طلب کرنے کی صورت میں انھیں یہ خاص نمبر اس کی خصوصی قیمت ہی پر مل سکے گا۔ جامعہ کے خصوصی شمارہ مجیب نمبر کی قیمت مبلغ چھبیس روپے ہوگی۔

کبیر احمد جائسی (علیگ)

ایرانی تصوف میں جوانمردی کا تصور

مشہور ایرانی عالم سعید نفیسی کثیر التعداد کتابوں کے مصنف، مؤلف اور مرتب ہیں۔ ہندوستان میں عام طور سے ان کو ایک ناقد اور ادیب کی حیثیت سے جانا جاتا ہے حالانکہ انھوں نے اسلامی علوم پر بھی متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ ان کتابوں میں "سرچشمۂ تصوف در ایران" اس لحاظ سے خصوصی اہمیت کی حامل ہے کہ انھوں نے اس میں تصوف کے بارے میں ایسی ایسی باتیں لکھی ہیں جو نئی اور چونکا دینے والی ہونے کے ساتھ ساتھ مزید تحقیق طلب بھی ہیں۔ اور باتوں کے علاوہ انھوں نے اس کتاب میں "جوانمردوں" یا فتیوں کے بارے میں دلچسپ اطلاعات بہم پہونچائی ہیں۔ درج ذیل سطور میں ان کی پیش کردہ معلومات کا خلاصہ پیش کیا جارہا ہے تاکہ اردو خواں حضرات کو اس بات کا اندازہ ہو سکے کہ دوسرے دوسرے ملکوں میں تصوف پر کس کس انداز اور نہج سے کام ہو رہا ہے اور اس کی کیا کیا توضیحیں، تعبیریں اور تشریحیں کر کے اس کو غیر اسلامی افکار و تصورات سے ماخوذ ثابت کیا جارہا ہے جو حضرات تصوف سے نظری یا عملی تعلق رکھتے ہیں ان کو ایسی کتابوں سے ضرور آگاہ ہونا چاہیے، تاکہ تصوف کو اس کے اصل خد و خال میں تلاش کرنے کی کوشش کریں۔

سعید نفیسی کے نزدیک ایران میں "جوانمردوں" کی جماعت کی تشکیل، ایرانی سماج کی تاریخ کا ایک انتہائی نمایاں اور اہم باب ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ "جوانمردی" کے آئین

ڈاکٹر کبیر احمد جائسی (علیگ) ریڈر ایرانین اسٹڈیز ڈپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

کی بنیاد ایرانی معاشرہ میں ظہورِ اسلام سے پہلے رکھی جا چکی تھی یہ جس زمانے کا ذکر ہے اس زمانے کے ایرانی عوام طبقاتی امتیازات کے چلن سے نالاں ہو چکے تھے۔ وہ لوگ جو طبقاتی امتیازات سے محروم تھے اور اسی وجہ سے طرح طرح کے مصائب کا شکار رہتے، انھوں نے "ایرانی تصوف" کی اس تحریک کو لبیک کہا تاکہ وہ بھی آزاد انسانوں کی سی باشرف و بامنزلت زندگی گذار سکیں۔ سعید نفیسی کے نزدیک ایرانی تصوف میں جوانمردی کا جو آئین ہے وہ مانویوں کے افکار سے بہت متاثر ہے۔ دوسری صدی ہجری کے وسط میں جب کہ ایران پر امویوں کی حکومت تھی مشرقی ایران اور بہ خاص طور سے سیستان اور خراسان کے عوام امویوں کی "چیرہ دستیوں" اور "ملی تعصبات" کے خلاف صف آرا ہوئے۔ جن لوگوں نے امویوں کی نسلی پالیسی کے خلاف عوامی بغاوتوں کی راہنمائی کی ان میں بیشتر لوگ "جوانمرد" تھے اس سلسلے میں سعید نفیسی نے خاص سے ابومسلم خراسانی (۱۰۹ — ۱۳۷ھ) کو سب سے عظیم "جوانمرد" قرار دیا ہے اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جس کثرت سے لوگ ابومسلم خراسانی کے گرد جمع ہو گئے تھے وہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ ایران میں "جوانمردی" کی جڑیں نہ صرف مضبوط تھیں بلکہ صدیوں پرانی بھی تھیں۔

جب ایرانیوں کی مدد سے بنی عباس، امویوں کی حکومت کا خاتمہ کر کے خود تاج و تخت کے مالک بنے تو انھوں نے اپنے تمام وعدوں کو فراموش کر کے ایرانیوں کے سلسلے میں وہی روش اختیار کی جو امویوں کا شعار تھی۔ رفتہ رفتہ ایرانی عوام عباسیوں سے بھی برگشتہ ہونے لگے۔ عوام کی اس برگشتگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک بار پھر مشرقی ایران کے "جوانمرد" عربوں کے خلاف صف آرا ہوئے اور برسوں تک ان سے لڑتے رہے۔ سعید نفیسی کے نزدیک ان "جوانمردوں" کی تحریک اور مسلسل جدوجہد کے نتیجے میں چونکہ عربوں کو جانی اور مالی نقصان ہوتا اس لئے عرب ان کو عیار کے نام سے موسوم کرنے لگے۔ کبھی کبھی ان "جوانمردوں" کو خارجیت کے اتہام سے بھی متہم کیا جاتا۔ عباسیوں کے نزدیک ہر وہ شخص جو اُن سے یا ان کے مذہبی مسلک سے اختلاف رکھتا بے دریغ خارجی قرار دے دیا جاتا۔ عباسیوں کے زمانۂ اقتدار میں "عیاروں" اور "خارجیوں" نے مشرقی ایران میں متعدد بغاوتیں کیں، ان بغاوتوں میں سب سے زیادہ مشہور بغاوت وہ ہے جو سیستان میں حمزہ بن آذرک نے ۱۷۹ھ میں کی تھی۔ وہ چونتیس برسوں تک عباسیوں کے علی الرغم سیستان کا مالک بنا رہا اور ۲۱۲ھ میں قتل ہوا۔ اس کے قتل کے چالیس

سال، بعد صفاری خاندان ابھر کر سامنے آیا اور اس نے ایک آزاد حکومت قائم کی جو عربوں کے اقتدار پر ایک کاری ضرب کی حیثیت رکھتی تھی۔ ان تاریخی حقائق کو پیش کرنے کے بعد سعید نفیسی نے ایرانی تصوف اور "جوانمردوں" کی تحریک کا جو سلسلہ جوڑا ہے وہ انہی کے الفاظ میں یوں ہے :

"ایران میں طریق تصوف کی ابتدا انہی عوامل (طبقاتی امتیازات) کے خلاف ایک جنگ تھی۔ اس طریق کی ابتدا ہی سے ایران کے عظیم صوفیوں نے ہمیشہ تصوف کو خواص کے لئے اور جوانمردی کو عوام کے لئے مختص سمجھا اور وہ حضرات تصوف اور "جوانمردی" دونوں ہی کی ترویج و اشاعت کرتے رہے۔ ایران کے تین بزرگ صوفی ابو حامد احمد بن خضرویہ بلخی متوفی ۲۴۰ء، ابو حفص عمر بن سلمہ حداد نیشاپوری متوفی ۲۶۴ یا ۲۶۵ یا ۲۶۷ اور ابوالحسن علی بن احمد بن سہل صوفی پوشنگی متوفی ۳۴۸ جوانمردوں اور فتیوں کے سردار بھی تھے (کچھا در بعد میں) (ص ۱۳۱)

اس سلسلے میں سعید نفیسی نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ فارسی میں تصوف کے موضوع پر جو بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں سے ایک خاصی بڑی تعداد کا نام فتوت نامہ" ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ایران میں صدیوں تک تصوف اور "جوانمردی" دونوں کے طریق ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو رائج تھے۔ اور انہی کے ذریعے ایرانیوں میں ملی روح کی بقا کا احساس تازہ رہتا اور جب بھی کوئی ستم گر یا بیگانہ قوت ایران پر اپنا اقتدار جمانے کی کوشش کرتی تو ایرانی متصوفین اور "جوانمردوں" کے گروہ مل جل کر اس قوت کے خلاف نبرد آزما ہو جاتے۔ صفویوں کے زمانے تک یہی صورت حال برقرار رہی۔ شاہ عباس کے زمانے میں "قزل باشوں" (بقول سعید نفیسی زیادہ تر قزلباش "جوانمرد" تھے) اور نعمت اللہ ولی کے مریدوں (نعمتیوں) میں خون خرابہ ہونے لگا اور امن و امان کو خطرہ لاحق ہو گیا تو شاہ عباس نے قزل باشوں یہ الفاظ دیگر "جوانمردوں" کے تمام اسلحے ضبط کر لئے۔ یہیں سے "جوانمردوں" کا زوال شروع ہوا اور ایران میں ان کے مراکز جو "لنگر" اور "زاویہ" کے نام سے موسوم تھے دھیرے دھیرے بند ہونے لگے۔ اس کے بعد کے حالات پر سعید نفیسی نے ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے :

"اس کے بعد فتوت و جوانمردی کے پیرو ایران کے ہر مقام پر تتر بتر حالت میں باقی رہے چونکہ

اس گروہ کے مرد، نابالغوں اور امردوں کی اپنی نگرانی میں پرورش کرتے اور ان کو اپنے طور طریق کا آشنا بناتے اس لئے ان امردوں کے لئے "لوطی" اور "الواط" کے الفاظ استعمال کئے جاتے اور چونکہ ان لوگوں کی اکثریت شہر مشہد میں رہتی اس لئے یہ لوگ مشہدی[1] اور مشدی کے نام سے بھی معروف ہوئے۔ اخ، اخی اور برادر کے الفاظ جو "جوانمرد" افراد ایک دوسرے کے لئے استعمال کرتے اس کو ان لوگوں نے "کاکا داش" اور "داش" کے الفاظ سے تبدیل کردیا۔ اس طرح ان لوگوں کے لئے "داش مشدی" کی اصطلاح استعمال ہونے لگی جو "داداش مشہدی" کی تحریف تھی اور ابھی کچھ دنوں پہلے تک یہ لوگ ایران میں اسی نام (داش مشدی) سے پکارے جاتے تھے۔

ایرانی جوانمردی و فتوت کے طور و طریق ایران سے نکل کر تمام اسلامی ممالک میں پھیل گئے حتیٰ کہ عراق اور شام جیسے دور دراز علاقوں کے عرب بھی اس اصطلاح سے آشنا ہوئے (ایران کے بعد) شہر بغداد ان لوگوں کا سب سے پہلا اہم ترین مرکز تھا جہاں ان لوگوں نے اپنے طور طریق رائج کرنے کی بہت کوشش کی اور اس طرح فتوت، فتی اور فتیان کا طور و طریق ایران سے بہت دور کے اسلامی ممالک میں پھیل گیا"۔ (ص ۱۳۴)

ان اطلاعات کو فراہم کرنے کے بعد سعید نفیسی نے ان کتابوں کا ایک جائزہ لیا ہے جو ایران میں "جوانمردی" یا فتوت پر لکھی گئی ہیں۔ درج ذیل سطور میں ان کی پیش کردہ معلومات کا ایک خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے تاکہ ہم "جوانمردی" کے تصور کی اصل تک پہونچ سکیں۔

سب سے پہلے سعید نفیسی نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ اتنے اہم موضوع پر اب تک کوئی جامع کتاب ایسی نہیں لکھی جا سکی ہے جو ایرانی جوانمردی یا فتوت کی تاریخ کا مکمل طور سے جائزہ لے کر اس کے تمام خطوط و ابعاد کو ابھارے اور ایرانی معاشرے کی پیش رفت میں اس تحریک کا جو حصہ رہا ہے اس کی نشاندہی کرے۔ اس سلسلے میں جو متفرق کام ہوئے ہیں ان میں عباس اقبال آشتیانی کے ایک مقالے "زندگانی عجیب یکی از

---

[1] کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ لکھنؤ میں یہی مشہدی پہلے شہدی پھر شہدے کہلانے لگے ہوں۔
[2] ہمارے یہاں گنڈے کے لئے "دادا" کی جو اصطلاح رائج ہے وہ شاید یہیں سے ماخوذ ہے۔

...لماء عباسی" کا سعید نفیسی نے خاص طور سے ذکر کیا ہے جو مجلہ شرق کے چھٹے شمارے خرداد ماہ ۱۳۱۰ھ ش) میں شائع ہوا تھا۔ اس تحقیقی مقالے میں عباس اقبال آشتیانی نے یہ دکھلایا ہے کہ کس طرح ایک ایرانی مسلک، عباسی خلیفہ کے دربار میں جاری و ساری ہوا، خود خلیفہ اس مسلک کا پشت پناہ بنا۔ عباس اقبال کے مقالے کے علاوہ فارسی میں اس موضوع پر اور کوئی ...ں تحقیقی کام نہیں ہوا ہے جس کی مدد سے اس ایرانی تحریک کے سلسلے میں مزید مطالعے کی ...کھلتی۔ اس سلسلۂ سخن میں سعید نفیسی نے اپنا یہ خیال پیش کیا ہے کہ "جوانمردی" یا فتوت کی ...ہیت و حقیقت کو سمجھنے کے لئے ہم کو ایرانی صوفیوں کی ان کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہئیے جو ...ں نے عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں تصوف کے موضوع پر لکھی ہیں۔ سعید نفیسی کے ...بیان کے مطابق ان صوفیوں نے اپنی تصانیف میں تصوف کے ساتھ ساتھ "جوانمردی" یا ...ت کے آئین بھی لکھ دیئے ہیں علاوہ بریں فارسی شاعروں نے بھی "جوانمردی" یا فتوت کے بارے ...جگہ جگہ اپنے اشعار میں اشارے کئے ہیں۔ ان شعرا کے کلام کے غائر مطالعے سے بھی ہم کسی ...یہ پر پہنچ سکتے ہیں مثال کے طور پر انھوں نے عنصری کے دو اشعار اور سعدی کا ایک شعر ...ا ہے جو درج ذیل ہیں:

جوانمردی از کارہا بہتر ست   جوانمردی از خوی پیغمبر ست
دو گیتی شود بر جوانمرد راست   جوانمرد باش و دو گیتی تراست (عنصری)
جوانمردی و لطف ست آدمیت   ہمین نقش ہیولائی مپندار (سعدی)

نثری تصانیف میں سب سے پہلے انھوں نے امام قشیری نیشاپوری کی تصنیف موسوم بہ "رسالہ قشیریہ" کا ذکر کیا ہے جس میں ان کے نزدیک جوانمردی یا فتوت کے بارے میں وافر مواد ...دیا گیا ہے۔ اسی طرح "طبقات الصوفیہ" کے مصنف، ابوعبدالرحمن محمد بن حسین بن ...موسیٰ سلمی ازدی نیشاپوری (۳۳۰ — ۴۱۲) کی تصنیف "کتاب الفتوۃ" کی طرف ...ہ کیا گیا ہے جس کا مقصود یہ دکھلانا ہے کہ تصوف اور فتوت کس طرح ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو گامزن رہے ہیں۔ شہاب الدین سہروردی کی مشہور زمانہ کتاب "عوارف المعارف" ...سلسلے میں سعید نفیسی کا خیال ہے کہ اس کتاب میں بھی فتوت یا جوانمردی کے بارے میں ...مواد ملتا ہے۔ ان کتابوں کا ذکر کرنے کے بعد انھوں نے بعض عربی کتابوں کے بھی نام

لکھے ہیں جو موضوع زیر بحث پر خاصہ وقیع مواد فراہم کرتی ہے۔ فارسی زبان میں فتوت پر جو اہم ترین کتابیں لکھی گئی ہیں وہ سعید نفیسی کے نزدیک یہ ہیں :

۱۔ فتوت نامہ، نجم الدین ابوبکر محمد بن مودود ظاہری تبریزی معروف بہ نجم الدین زرکوب متوفی ۷۱۲ھ
۲۔ تحفۃ الاخوان، کمال الدین عبدالرزاق کاشانی (مصنف نے یہ کتاب پہلے عربی زبان میں لکھی تھی بعد خود ہی اس کا فارسی میں ترجمہ کیا)
۳۔ فتوت نامہ، کمال الدین عبدالرزاق کاشانی۔
۴۔ فتوت نامہ، علاء الدولہ رکن الدین ابوالمکارم محمد بن شرف الدین احمد بن محمد بیابانکی سمنانی (۶۵۹ - ۷۳۶ھ)
۵۔ فتوت نامہ، امیر سید علی بن شہاب الدین بن میر سید محمد حسینی ہمدانی (۷۱۳ - ۷۸۶)
۶۔ فتوت نامۂ سلطانی، کمال الدین یا معین الدین حسین بن علی کاشفی بیہقی ہروی واعظ معروف بہ ملا حسین کاشفی متوفی ۹۱۰ھ۔

یہ تمام فتوت نامے نثر میں لکھے گئے ہیں۔ منظوم فتوت ناموں میں فریدالدین عطار کا ۸۲ اشعار پر مشتمل ایک فتوت نامہ ہے جس کو سعید نفیسی نے "دیوان قصائد و ترجیعات و غزلیات فریدالدین عطار نیشاپوری" کی تیسری اشاعت میں مرتب کر کے شائع کرایا ہے اور ایک اور منظوم فتوت نامہ، ناصر ناصری نام کے ایک شاعر کا ہے جس کی تکمیل ۶۸۹ھ میں ہوئی تھی۔ یہ فتوت نامہ ۱۸۸۲ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس فتوت نامہ کو سعید نفیسی نے مرتب کر کے "فرہنگ ایران زمین" میں شائع کروایا تھا۔ فتوت ناموں کے بارے میں یہ اطلاعات فراہم کرنے کے بعد سعید نفیسی نے یہ بتایا ہے کہ فتوت یا جوانمردی کا آئین کیا تھا اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر ہم اس پر قدرے تفصیل سے نگاہ ڈالتے ہیں۔

سعید نفیسی نے اپنی بات کا آغاز خواجہ محمد پارسا کی کتاب "فصل الخطاب لوصل الاحباب" کے ایک اقتباس سے کیا ہے جس میں فتوت کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

"فتوت نام ہے دل کی صاف و شفاف جگہ کا جس سے نفس کی صفات مترشح ہوتی ہیں اور وہ صفائی قلب کے لئے ہے جو مرحلہ ہے ایمان کے بعد زیادہ ہدایت کے لئے۔"

اس اقتباس کو نقل کرنے کے بعد انھوں نے بتلایا ہے کہ فتوت ناموں کے مطالعے سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ جوانمردوں یا صاحبانِ فتوت کو کسب دانش کے بعد بہتر صفات سے متصف ہونا چاہیئے، سعید نفیسی نے اپنی کتاب میں ان تمام صفات کو بیان کیا ہے مگر ہم یہاں نمونے کے طور پر صرف چند صفات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جو یہ ہیں۔ راستی قیدِ نفس سے آزاد ہونا، چشم و دامن کی پاکی، وفا، دوسروں کے لیے وہی چاہنا جو خود اپنے لیے چاہے، خود کو قوت و دانائی میں چیونٹی سے بھی زیادہ کمزور سمجھنا، نامرادوں کی مراد پوری کرنا، تکبر سے دور رہنا، دل کا راز ہر شخص سے نہ کہنا، بن بلائے کہیں نہ جانا، دوست کو شہوت کی نگاہ سے نہ دیکھنا، تمام لوگوں کی اپنی اولاد کی طرح تربیت کرنا، صبر اختیار کرنا، لوگوں کے درمیان شمع کی طرح جلنا وغیرہ۔

اس طبقے کے لوگوں کے عقیدے کے مطابق درج ذیل لوگ جوانمردی یا فتوت کے اہل نہ تھے۔ کافر، منافق، کاہن، شرابی، حجام، دلال، جولاہا، قصائی، جراح، شکاری، عامل اور ذخیرہ اندوز۔ جوانمردی کے دستورالعمل پر کاربند لوگوں کو اخی کہا جاتا تھا۔ یہ اخی اگر بلیسر کاموں میں سے کسی ایک بھی کام کے مرتکب ہوتے تو درجۂ فتوت سے گر جاتے۔ اس تحریک یا مسلک سے منسلک افراد کو دو حصوں یا طبقوں میں تقسیم کیا جاتا ایک طبقہ قولی کہلاتا اور دوسرا سیفی۔ قولی جوانمرد وہ شخص کہلاتا جو صدق دل سے "جوانمردی" کا قائل ہوتا۔ سیفی وہ کہلاتا جو "جوانمردی" کی ترویج اور اشاعت کے لیے تلوار اٹھانے سے بھی گریز نہ کرتا۔ اس جماعت میں صرف وہی لوگ شامل کیے جاتے جو چند مخصوص لباس پہننے کے ساتھ ساتھ بغاوت کرنے کی بھی قوت و طاقت رکھتے۔ "جوانمردی" کو برقرار رکھنے کے لیے "جوانمردوں" کو اچھی صحبت اختیار کرنی ہوتی اور جوانمردوں کے آداب خورد و نوش اور آدابِ نشست و برخاست پر عمل کرنا ہوتا۔ ان تمام معلومات کو پیش کرنے کے بعد سعید نفیسی نے ایک بہت اہم نکتہ کی طرف توجہ دلائی ہے جو یہ ہے:

"وہ نکتہ جو کہ قابلِ توجہ ہے یہ ہے جوانمردوں اور فتیوں کے اُن مخالفین نے جو ان کو عیار اور خارجی کہتے، ان کی روش و طریق عمل کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے لوٹ مار قتل و

غارت گری اور اسی قبیل کی دوسری بے باکیوں سے گریز نہ کرتے ۔ خاص طور سے سیستان کے عیاروں تک کے بارے میں (مخالف مصنفین نے) ان بے باکیوں کو بڑی صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے ۔ (ان باتوں سے) یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ جماعت انقلابی لوگوں کی تھی جو اپنے مقصد کے حصول کے لئے رہزنی اور قتل تک سے گریز نہ کرتے ۔" (ص: ۱۴۰)

اس موقع پر سوال یہ ہوتا ہے کہ فتوت یا جوانمردی" کا پیش رو کون تھا ۔ اس سلسلہ میں سعید نفیسی نے تین دستاویزوں کا حوالہ دیا ہے ۔ پہلی دستاویز میں اس سلسلے کا بانی آدم صفی علیہ السلام کو قرار دیا گیا ہے ۔ اُن سے یہ مسلک حضرت ابراہیم علیہ السلام کو منتقل ہوا اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ۔ آپؐ کے بعد یہ مسلک حضرت علی رضی اللہ عنہ کو منتقل ہوا اور ان سے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو ۔ حضرت سلمانؓ کے بعد یہ سلسلہ ان حضرات کی وجہ سے قائم رہا ۔ دحلی انصاری ۔ اشجع ، ابومسلم خراسانی ، نجدۃ بن میسرہ ، مالک ، عبداللہ معاذ مازنی ، منظعون ، مبارک بن مطاعن ، حامد بن عدی ، مہدی ۔

دوسری دستاویز میں حضرت سلمان فارسیؓ کو اس سلسلے کا موسس قرار دیا گیا ہے اور خلیفہ ابوالعباس ناصرالدین اللہ پر اس سلسلے کو ختم کیا گیا ہے ۔ سعید نفیسی کو جو تیسری دستاویز ملی ہے اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ناصرالدین اللہ جس کی مدت خلافت ۵۷۵ سے لے کر ۶۲۲ تک کے عرصہ پر محیط ہے ، ۵۷۸ھ میں اس مسلک کا حامی بنا اس کو مالک بن عبدالجبار بن یوسف نے "شلوار فتوت" پہنائی ۔ اس دستاویز میں اس سلسلے کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے شروع کیا گیا ہے اور ناصرالدین اللہ پر ختم ۔ سعید نفیسی نے تینوں دستاویزوں میں "جوانمردوں" کا جو شجرہ درج کیا ہے ان کو پورا پورا نقل کرنے کے بعد اپنے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ان تینوں دستاویزوں میں بجز اس کے کوئی اور فرق نہیں ہے کہ بعض ناموں کو درج کرنے میں تقدیم و تاخیر ہوگئی ہے یا بعض نام نقل کرنے میں چھوٹ گئے ہیں ۔

اس سلسلے کی سب سے اہم چیز ان کے نزدیک یہ ہے :

"وہ چیز جو کہ بہت قابل توجہ ہے یہ ہے کہ ان تینوں فہرستوں میں ابومسلم خراسانی کا نام آیا ہے اس کے علاوہ دوسرے اور پانچ

ایرانیوں، بہرام دیلمی، روزبہ فارسی، جوشن فزاری، فضل بن زیاد فارسی، ملک ابا کالیجار یا کاسجار بن بردویل کے بھی نام آئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کاسجار (کا لفظ) باکالیجار کی تحریف ہے جو طبرستان کے مردوں کا نام ہے اور تاریخ میں اس نام سے چند افراد مشہور بھی ہیں اور یہ تمام کے تمام لوگ یا تو زیاری خاندان کے بادشاہ تھے یا شاہزادے۔ کبھی کبھی لوگوں نے باکالیجار کے لفظ کو عربی کنیت سمجھا ہے اور اس کو ابو کالیجار لکھا ہے۔ طبری اور گیلی زبانوں میں کالیجار اُن ہی معنوں میں مستعمل ہے جو فارسی دری میں "کارزار" کے معنی ہیں۔ فارسی دری کا یہ لفظ، پہلوی لفظ کاریجار سے ماخوذ ہے جو لوگ کالیجار یا باکالیجار کے نام سے تاریخ میں معروف ہیں وہ اس طرح ہیں" (ص ۱۴۲)

اس کے بعد سعید نفیسی نے زیاری، بویہ، کاکویہ اور باوندی خاندانوں کے ان افراد کے نام لکھے ہیں جو تاریخ کے صفحات میں کالیجار یا باکالیجار کے نام سے معروف ہیں ہم ان ناموں سے صرف نظر کرتے ہیں۔ پھر سعید نفیسی نے کسی تاریخی کتاب کا حوالہ دیئے بغیر یہ تحریر کیا ہے کہ آٹھویں صدی ہجری کا ایک شاہی خاندان جو آلِ سربدار کے نام سے موسوم ہے اور جس نے خراسان کے ایک حصے پر ۷۳۷ھ سے ۷۸۳ھ تک حکمرانی کی ہے اس کا تعلق بھی جوانمردوں سے تھا۔ سعید نفیسی کے اس خیال کی وجہ یہ ہے کہ اس خاندان کے حکمرانوں کے لیے پہلوان کا لفظ مستعمل تھا جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان لوگوں کا تعلق "جوانمردوں" کے گروہ سے ضرور رہا ہوگا۔ اس خاندان کا ذکر کرنے کے بعد انھوں نے آٹھویں صدی ہجری کے ایک صوفی شاعر پہلوان محمود خوارزمی کو فتوت کا رہنما قرار دیتے ہوئے بتلایا ہے کہ ان کا تخلص قتالی تھا جو "پوریای ولی" کے نام سے معروف تھے۔ ان کی مثنوی کنز الحقائق (سال تصنیف ۷۰۲ھ) میں جو مضامین نظم ہوئے ہیں۔ ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ قتالی فتوت یا جوانمردی کے افکار و نظریات کو پھیلانے والوں

میں سے تھے۔ سعید نفیسی نے بغیر کسی حوالے کے "نوشتہ اند" کا سہارا لیتے ہوئے یہ بھی بتلایا ہے کہ قتالی اپنے زمانے کے بہت ہی مشہور دانشور شخص تھے۔ آج بھی کشتی لڑنے والے لوگ ان کو اپنا پیشرو مانتے ہیں اور جب کشتی لڑتے اور ورزش کرتے ہیں تو ان کے اشعار پڑھتے ہیں:

"جوانمردوں" کے جن شجروں کی طرف گذشتہ سطور میں اشارہ کیا جا چکا ہے ان کی روشنی میں سعید نفیسی نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ان شجروں میں جو ایرانی نام آتے ہیں وہ سب کے سب خراسان، دیلم و فارس کے رہنے والے تھے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ "جوانمردی" یا فتوت کا مسلک سیستان کے علاوہ خراسان، دیلم اور فارس میں بھی مقبول تھا۔ سعید نفیسی کے نزدیک عبدالقادر گیلانیؒ کا تعلق بھی اسی گروہ سے تھا وہ ان کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

> "عبدالقادر گیلانی کے آثار سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اصول فتوت کو رائج کرنے والوں میں تھے مولانا جلال الدین (مولانا روم) نے بھی اپنی مثنوی میں "ای فتی" کے لفظ سے بار بار (لوگوں کو) مخاطب کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ "جوانمرد" افراد بھی ان کے مخاطب تھے کیونکہ فتی کا لفظ صرف "جوانمردوں" کے لیے استعمال کیا جاتا تھا" (ص ۲۴۱)

اسی سلسلے میں سعید نفیسی نے اس بات پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ لوگوں کو جوانمردوں کے حلقے میں داخل کرنے کے لئے کیا کیا اصول و ضوابط تھے۔ اس سلسلے میں سعید نفیسی نے جو اطلاعات فراہم کی ہیں وہ بڑی دلچسپ ہیں اس لئے درج ذیل سطور میں ان کا خلاصہ کسی قدر تفصیل سے پیش کیا جاتا ہے۔

آٹھویں صدی ہجری کی ایک نثری کتاب "داستان سمک عیار" سعید نفیسی کے نزدیک ایرانی "جوانمردوں" کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنے کا سب سے بہتر اور قابل اعتبار ذریعہ ہے۔ اس کتاب کے علاوہ اور بہت سی تاریخی داستانیں بھی ایسی ہیں جو موضوع زیر بحث پر بھرپور روشنی ڈالتی ہیں مگر سعید نفیسی نے صراحت

کے ساتھ کسی اور دوسری کتاب کا نام نہیں لیا ہے۔ اس سلسلے میں سعید نفیسی نے ایک بار پھر عباسی خلیفہ ناصر الدین اللہ کا ذکر کیا ہے اور اس کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اپنے عقائد کے لحاظ سے شیعہ تھا۔ سعید نفیسی نے یہ بات ایک مؤرخ نورالدین علی بن احمد سخاوی کی کتاب "تحفۃ الاحباب و بغیۃ الطلاب" کے حوالے سے لکھی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ناصر الدین اللہ نے "جوانمردی" کے مسلک کو قبول کر لیا تھا۔ اس مسلک کو اختیار کرنے کے بعد اس نے اتنی ترقی کی کہ وہ خود اس مسلک کے رہنماؤں میں شمار ہونے لگا اور نو واردان حلقہ کو "شلوار فتوت" پہنانے لگا جس کو عرب "سراویل الفتوۃ" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ سعید نفیسی نے اس عمل کو زردشتیوں کے کستی باندھنے کے عمل کے مماثل قرار دیا ہے۔ اس مخصوص شلوار کے علاوہ ایرانی "جوانمردوں" کے پاس ایک مخصوص پیالہ بھی ہوتا جس کو عربوں نے "کاس الفتوۃ" کا نام دے رکھا تھا یہ کاسہ "جوانمردوں" کو وراثت میں ملتا جس کا نقش وہ اپنے اسلحوں پر کندہ کرواتے۔ کبھی کبھی ان کے اسلحوں پر مخصوص کاسہ کے ساتھ ساتھ ان کی مخصوص شلوار کا بھی عکس کندہ ہوتا اور کبھی کبھی ان دونوں چیزوں میں سے کسی ایک چیز کا نقش ہوتا۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے تک ایران کے "لوطی اور داش مشدی" پیتل کے ایک خاص قسم کے پیالے کا استعمال کرتے جس کو وہ ہمیشہ اپنے ساتھ یا تو جیب میں رکھا کرتے یا اپنے پٹکے میں باندھے رہتے۔

جوانمردوں میں یہ بھی رواج تھا کہ اس حلقے کے بزرگ اپنے متسبین کو ایک مخصوص قسم کا خرقہ دیا کرتے جس کا نام عربوں نے "خرقۃ التصوف" رکھا تھا اس رواج کا ذکر کرنے کے بعد سعید نفیسی یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ تصوف اور "جوانمردی" کے افکار و نظریات اور تصورات ایک دوسرے میں جذب و پیوست تھے۔ چھٹی صدی ہجری کے وسط سے لے کر نویں صدی ہجری کے خاتمے تک۔ نام اور

---

[1] وہ پٹکا جو زردشتی افراد اپنے مذہبی عقیدے کے مطابق اپنی کمر کے گرد باندھتے ہیں۔

[redacted]

مصر میں اس مسلک کا بڑا زور رہا۔ شام کے "جوانمرد" سعید نفیسی کے الفاظ میں "رافضیوں" کے مخالف تھے لیکن مصر کے جوانمرد رافضی موافق۔ (اس بات سے سعید نفیسی یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ایرانی تصوف کی طرح یہ مسلک بھی کسی خاص شریعت کا پابند نہیں تھا۔ ایشیائے کوچک میں اس مسلک کے لوگوں کی مخصوص خانقاہیں تھیں جن کو "زاویہ" کہا جاتا۔ ایران میں ساتویں صدی ہجری سے لے کر بعد کے زمانے تک "جوانمردوں" کے پاس ایک مخصوص علم ہوتا جس کو وہ لوگ "طوق" کہتے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ منگولی زبان کا لفظ ہے اور اس کا فارسی زبان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہر خانقاہ کا ایک مخصوص علم ہوتا اور یہ علم جس مخصوص جگہ پر رکھا جاتا اس کو "پاطوق" کہا جاتا۔ سعید نفیسی کا کہنا ہے کہ یہ اصول آج تک ایران میں باقی ہے اور ایران کے بیشتر شہروں میں ہر محلہ کا ایک مخصوص علم ہوتا ہے جس کو ایام عاشورا میں نکال کر سڑکوں پر گھمایا جاتا ہے۔ آٹھویں صدی ہجری تک ایشیائے کوچک میں بھی دستور تھا کہ "جوانمرد" افراد ہر شام کو اپنے "زاویہ" میں جمع ہوتے اور اجتماعی طور پر کھانا کھاتے۔ کھانے سے فراغت کے بعد یہ لوگ ساز بجاتے، گاتے، بجاتے اور ٹھیک اسی طریقے پر عمل کرتے جو صوفیوں میں سماع کے نام سے موسوم ہے۔ ابھی کچھ دنوں پہلے تک ایران میں وہ لوگ جو اصطلاحاً "لوطی" کہلاتے اپنے اپنے محلّوں کے ایک مخصوص قہوہ خانہ میں جمع ہوتے اور وہاں محفل سماع آراستہ کرتے جس کو وہ اپنی اصطلاح میں "دم گرفتن" کہتے۔

عام طور سے ایشیائے کوچک کے "جوانمردوں" کا لباس صوفیا کے نیلے لباس کے برعکس سفید اونی قبا پر مشتمل ہوتا اس کے علاوہ یہ لوگ اپنے کندھوں پر ایک شال بھی ڈالے رہتے۔ ایران کے "لوطیوں" میں بھی یہی چیز رائج تھی علاوہ بر این ایشیائے کوچک کے "جوانمرد" اپنی کمر میں چاقو باندھے رہتے ایران کے "لوطیوں" میں بھی یہی دستور تھا مگر ایران کے لوگ زیادہ تر چاقو کی جگہ قمہ باندھتے۔ ایشیائے کوچک کے "جوانمرد" اپنے سروں پر ایک مخصوص قسم کا تاج

رکھتے جو سلسلۂ مولویہ کی ٹوپی سے کافی ملتا جلتا ہوتا۔ ایران کے "لوطیوں" میں نمد کی ٹوپی پہننے کا رواج تھا۔ وہ لوگ اپنے آپ کو دوسروں سے ممتاز کرنے کے لئے آپس میں ایک دوسرے کو کلاہ نمدی کہہ کر مخاطب کرتے۔ سعید نفیسی نے ایرانی "جوانمردی" کے جس پہلو کو اس کا خاص وصف قرار دیا ہے وہ انہی کے الفاظ میں یہ ہے:

"ایرانی طریق "جوانمردی" کا اہم ترین پہلو یہ رہا ہے کہ (اس کے ماننے والے) اُن اجنبیوں اور لوگوں کو جو خطرے میں ہوتے پناہ دیتے اور ظلم و جبر کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے۔ سخاوت، بے اعتنائی، عفو و درگذر، ناگوار واقعات و حادثات کا اثر نہ لینے اور دوسروں کی خطاؤں کی پردہ پوشی کرنے کو وہ لوگ مردی کی اہم ترین خصلت سمجھتے۔ ابوالقاسم قشیری نے اپنے رسالہ میں جس جگہ فتوت کے طور وطریق پر بحث کی ہے وہاں ان صفات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ایران کے صوفیہ فتوت کو "ایثار علی النفس" کے معنوں میں استعمال کرتے۔ امام غزالی احیاء علوم الدین میں اسی چیز کو سخاوت کا بلند ترین درجہ سمجھتے ہیں" (ص ۱۴۷)

سعید نفیسی نے یہ دلچسپ اطلاع بھی بہم پہونچائی ہے کہ عراق اور مغربی ایشیا کے فتیوں یا "جوانمردوں" کا ایک مشغلہ غلّہ بازی بھی تھا۔ یہ غُلّہ مٹی سے بنایا جاتا اور اس کو دو تاروں والی کمان میں رکھ کر چلایا جاتا۔ ہندوستان میں آج بھی غلیل سے غُلّہ چلایا جاتا ہے اور اس بندوق کے زمانے میں بھی بہت سے لوگ اس سے شکار کرنا پسند کرتے ہیں۔ سعید نفیسی نے جس طرح کی کمان کا ذکر کیا ہے ویسی ہی کمان ہندوستان میں بھی بنائی جاتی ہے جو دو تانتوں سے بنی ہوتی ہے۔ دونوں تانتوں کے درمیان بیچ کے حصے میں ایک چمڑے کا ٹکڑا ٹنکا ہوتا ہے جس پر غُلّہ رکھ کر کمان کھینچی جاتی ہے پھر نشانے کی طرف غُلّہ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ عربوں نے اس شغل کو "رمی البندق" کا نام دے رکھا تھا۔ سعید نفیسی کا خیال ہے کہ عراق اور

مغربی ایشیا کے فتیوں نے یہ چیز ایران کے جوانمردوں کی تقلید میں اپنائی تھی کیونکہ ایران کے جوانمردوں میں گوپھن (فلاخن) چلانے کا عام دستور تھا۔

ایرانیوں کے نزدیک "جوانمردوں" کے حلقے میں داخل ہونے کے لیے انسان میں تین اوصاف کا ہونا لازمی تھا۔ اول سخا دوم صفا سوم وفا۔ سخا سے ان کی مراد یہ تھی کہ جو کچھ انسان کے پاس ہو اس کو خرچ کرنے سے دریغ نہ کرے صفا سے ان کا مطلب یہ تھا کہ انسان کا دل ہر طرح کے کینہ سے پاک وصاف ہو اور وفا سے وہ یہ مراد لیتے کہ انسان خدا اور خلق خدا دونوں کا وفادار ہو کر زندگی بسر کرے۔ اسی طرح صاحب ارادت ہونے کے لیے انسان کا ان پانچ شرطوں کا پورا کرنا لازمی تھا۔ صدق دل کے ساتھ توبہ کرے۔ علایق واشغال دنیا کو ترک کر دے۔ دل کو زبان کا تابع رکھے۔ صحیح پیر کی اقتدا کرے اور مراد کا دروازہ اپنے اوپر بند کرلے۔

سعید نفیسی نے اسی طرح کی دوسری دلچسپ اطلاع یہ بہم پہونچائی ہے کہ کسی فرد کو مرید کرنے کے لئے اٹھائیس لوازم تھے۔ ایرانی جوانمردان میں سے چار چیزوں کو فرض، چار کو سنت، چار کو آداب، چار کو ارکان اور چار کو مستحب سمجھتے تھے بقیہ آٹھ لوازم کے بارے میں سعید نفیسی نے کوئی اطلاع بہم نہیں پہونچائی کہ ان کو "جوانمردوں" کی اصطلاح میں کیا کہا جاتا ان لوازم میں کمر کا باندھنا سب سے اہم تھا جس کو وہ لوگ "شد" کی رسم سے موسوم کرتے اور جو شخص اس کام کو انجام دیتا وہ "استاد شد" کہلاتا۔ ان اطلاعات کو فراہم کرنے کے بعد وہ اپنے محبوب موضوع یعنی قدیم ایران کی طرف مراجعت کرتے ہیں اور یاد دلاتے ہیں کہ ایران میں ظہور اسلام سے پہلے لوگوں کو چار طبقوں میں تقسیم کیا جاتا تھا پھر مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ زردشتیوں میں مذہبی رہنماؤں کو تین طبقوں میں تقسیم کیا جاتا تھا یعنی آذربد، ہیربد، موبد۔ مانویوں کے نظام فکر میں لوگوں کو چار طبقات میں تقسیم کیا جاتا یہی حال متصوفین کا تھا اور ان کے نظام فکر میں بھی طبقہ بندی موجود تھی۔ "جوانمردی" کے نظام فکر میں یہ تقسیم اس طرح تھی۔ سب سے پہلا درجہ پیر کا تھا، اس سے فروتر نقیب، نقیب

سے کمتر پدر عہد اور پدر عہد سے فروتر استاد شد۔ جو شخص اس حلقہ میں داخل ہوتا اور اس کی کمر باندھی جاتی اور اس کو داخل سلسلہ کیا جاتا اس کو یہ لوگ "خلف طریق" یا "فرزند طریق" کہتے۔

کسی کی کمر باندھنے سے پہلے درج ذیل چھ باتوں کا پورا کرنا ضروری تھا۔

۱۔ استاد اس کام کے تنوع کو جانے اور بیان کرے۔ ۲۔ "فرزند" کو چالیس دنوں تک خدمت پر آمادہ کرتا رہے۔ ۳۔ پانی اور نمک اس مجلس میں لاتے۔ نمک، حق نمک ادا کرنے کی طرف اشارہ ہوتا اور پانی اس بات کی طرف اشارہ کرتا کہ جو شخص داخل سلسلہ ہو رہا ہے اس کا دل پانی کی طرح صاف و شفاف اور بے میل ہے۔ ۴۔ پانچ شمعیں روشن کرے۔ پانچ کا عدد آلِ عبا کی طرف اشارہ ہوتا، سعید نفیسی کے نزدیک یہ عمل آگ کے احترام کو ظاہر کرتا ہے جو زرتشتیوں کے دینی عقیدے کے مطابق مقدس سمجھی جاتی ہے۔ ۵۔ "فرزند" کی کمر کو شرط کے ساتھ باندھے (کس شرط کے ساتھ اس بات کی وضاحت نہیں کی گئی ہے) ۶۔ وہ مخصوص حلوی تیار کرے جو اس موقع کے لئے ہوتا ہے۔

یہ کمر بندی کس طرح ہوتی تھی اس کا حال سعید نفیسی نے اس طرح لکھا ہے:

جب کسی "فرزند" کو داخل سلسلہ کرنے کے لئے یہ رسم انجام دینی ہوتی تو "فرزند" کو بالکل اسی طرح ایک وسیع اور پاک جگہ بٹھا دیا جاتا جس طرح زرتشتیوں میں رسم کستی بندی کے وقت کیا جاتا ہے۔ اس موقع پر پیر، پدر عہد، استاد شد، نقیب اور اس سلسلے سے منسلک عام افراد جو برادرانِ سلسلہ سمجھے جاتے، سب کے سب موجود ہوتے۔ اس کے بعد قبلہ رو دو جانمازیں بچھائی جاتیں جو پیر اور استاد شد کے لیے ہوتیں اور دو برادر سلسلہ، پدر عہد کے بائیں طرف بیٹھ جاتے۔ اگر کبھی کسی مجبوری کی بنا پر پیر بذات خود اس رسم کی انجام دہی کے وقت موجود نہ ہوتا تو اس کی جانماز پر کلام پاک رکھ دیا جاتا۔ اس کے بعد ایک پیالے میں صاف اور پاک پانی اور تھوڑا سا پاک نمک رکھا جاتا۔ پھر نقیب کھڑا ہو کر کلام پاک کی آیات کی تلاوت کرتا۔ تلاوت ختم ہونے پر نمک کو پانی میں ڈال دیا جاتا اور پانچ شمعیں روشن کر دی جاتیں۔ جب شمعیں جل جاتیں تو نقیب "اللہ نور السموٰت

والارض ُ دا لیا آیت پڑھتا۔ پھر پدر عہد، فرزند کو عہد کرنے کی تلقین کرتا۔ اس کے بعد فرزند کے بائیں طرف استاد کھڑا ہو جاتا اور استاد و فرزند دونوں پیر کی طرف اپنا منہ کر لیتے۔ استاد بارہوں اماموں کے نام پڑھتا اور فرزند کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتا اور اس کا کلمۂ شہادت پڑھتا اور فرزند کو گناہ کبیرہ سے توبہ کرواتا۔ پھر وہ اپنا بایاں ہاتھ فرزند کے سر پر رکھ کر اہل مجلس کی طرف اپنا چہرہ کر لیتا اور فاتحہ پڑھتا تکبیر کہتا اور اپنے سلسلہ کا شجرہ پڑھتا۔ شجرہ پڑھنے کے بعد اپنے بائیں ہاتھ کو فرزند کے سر سے ہٹا کر اس کے داہنے کندھے پر رکھتا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل بیت پر درود بھیجتا اور تین قدم آگے کی طرف بڑھ جاتا اور دوبارہ فاتحہ پڑھتا اور اپنے داہنے پیر کو ایک قدم آگے کر لیتا۔ ان سارے مراحل کے طے ہو جانے کے بعد وہ سورۂ اخلاص کی تلاوت کرتا اور اپنا داہنا پیر ایک بار پھر ایک قدم آگے کر لیتا اور وہ شال جو "فرزند" کی کمر پر باندھنی مطلوب ہوتی اور جس کو وہ اپنے شانوں پر رکھے ہوئے ہوتا اس کو گردش دیتا پھر بائیں ہاتھ سے شال کو ... کی طرف لاتا اور اپنے داہنے ہاتھ سے جانماز پر اس طرح رکھ دیتا کہ "فرزند" ... پڑھے تو اس کی پیشانی اس شال پر ہو۔ اس کے بعد وہ دو رکعت نماز پڑھتا اس ... اقتدا وہ تمام لوگ کرتے جن کی کمر بندی ہو چکی ہوتی۔ نماز ختم ہو جانے پر وہ خطبہ پڑھتا جب خطبہ سے فارغ ہو جاتا تو "فتوت نامہ" میں درج آداب فتوت پڑھ کر سناتا اور تین مرتبہ فرزند کو عہد کرنے کی تلقین کرتا۔ اس کے بعد "استاد شاہ" اٹھ کھڑا ہوتا وہ اُس شال کو اٹھا کر بوسہ دیتا اور اپنے کندھوں پر ڈال لیتا اور قبلہ رخ ہوتا قبلہ رو ہونے کے بعد داہنے ہاتھ سے شال کو اتار کر جانماز پر ڈال دیتا۔ بعد اپنے بائیں ہاتھ سے شال کو اٹھا کر "فرزند" کی گردن میں اس طرح ڈالتا کہ دونوں سرے فرزند کی کمر پر برابر رہیں۔ اس کے بعد تین مرتبہ شال کمر سے مس کی جاتی، پہلی بار داہنے ہاتھ سے اُس وقت یا حی و یا قیوم پڑھا ... بار بائیں ہاتھ سے اس وقت یا ذوالجلال والاکرام پڑھا جاتا اور تیسری ... ہو اللہ الا ہو پڑھا جاتا۔ جب یہ سب کچھ ہو لیتا تو وہ دعائے قنوت پڑھی ...

حضرت جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب ہے۔ دعائے قنوت پڑھنے کے بعد شال "فرزند" کی کمر میں گرہ دے کر باندھ دیا جاتا اور اس کے کان میں کچھ نصیحتیں کی جاتیں بعد ازاں نمک ملا پانی جو اس رسم کے شروع ہی میں پیالے میں آیا تھا تھوڑا تھوڑا حاضرین مجلس کو چکھایا جاتا اور حلوی تقسیم کر دیا جاتا۔ تین دن گزرنے کے بعد "فرزند" کو "استاد" کے پاس دوبارہ لے جایا جاتا۔ ان تین دنوں تک فرزند کی کمر کی گرہ بندھی رہتی۔ "استاد" اس کی گرہ کو کھول دیتا اور گرہ کھولتے وقت کہتا:

"بستم میان این فرزند بہ ابقا و اکنون گشادم بہ فنا"

(اس فرزند کی کمر کو میں نے بقا سے باندھا اور اب میں نے فنا سے کھولا)

وہ شال "فرزند" کی گردن میں ڈال دی جاتی۔ جو "فرزند" اس تمام رسم سے گزر لیتا وہ داخل سلسلہ ہو جاتا اور "جوانمرد" یا "فتی" کہلاتا۔

سعید نفیسی نے مرد ایران "دنیسہ" جوانمردوں" کا تعارف نہیں کرایا ہے بلکہ دوسرے ملکوں کے "جوانمردوں" کے بارے میں بھی دلچسپ اطلاعات فراہم کی ہیں۔ ان کی فراہم کردہ اطلاعات کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

جن دوسرے ملکوں میں جوانمردوں یا فتیوں کا سلسلہ تھا وہاں کے لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کسی ساتھی کو اس ملک کے سلسلۂ جوانمردان کا سردار مانتے تھے۔ اس طرح تمام ملکوں کے "جوانمردوں" کا سلسلہ حضرت علی پر منتہی ہوتا۔ ماوراالنہر، خراسان، طبرستان، عراق عجم اور عراق عرب کے لوگ حضرت سلمان فارسی کو، مصر، اسکندریہ، حلب اور اس کے نواحی علاقوں کے لوگ حضرت ... کو، روم، بلاد مغرب اور آذربائیجان کے ایک حصے کے لوگ حضرت سہیل ... کو، یمن، عدن، ہرموز اور ہندوستان کے لوگ حضرت ابو محجن کو اپنے ملکوں میں اس سلسلے کا مؤسس سمجھتے۔ ان حضرات کے بارے میں گمان یہ کیا جاتا کہ اس سلسلے کے اسرار و رموز کی تعلیم ان کو حضرت علی نے دی تھی۔ سعید نفیسی نے ایک بار ... اس بات کو دہرایا ہے کہ ایران کے صوفی عبادت اور دوسری فرائض کی ادائگی کو ... اہمیت نہ دیتے تھے اور اسی چیز کو انھوں نے ایرانی "جوانمردوں"

کی بھی خصوصیت قرار دیا ہے وہ لکھتے ہیں:

"ایرانی صوفیوں کی طرح ایرانی جوانمرد بھی عبادت کو چنداں اہمیت نہ دیتے تھے اور اخلاقی امتیازات کو ہر عبادت اور دینی فریضے سے زیادہ بلند رتبہ سمجھتے تھے۔ "عیاروں"، بالخصوص سیستان کے عیاروں کے بارے میں لوگوں نے کہا ہے کہ وہ اُس رہزنی سے بھی گریز نہ کرتے جو ان کے ملی مقصد کے لئے مفید ہوتی۔" (ص ۱۵۲)

یہ تو ایرانی "جوانمردوں"، یا فتیوں کا حال تھا اب غیر ایرانی فتیوں کا حال سماعت فرمائیے۔ بغداد کے فتیوں کے بارے میں سعید نفیسی نے یہ اطلاعات فراہم کی ہیں:

"بغداد کے فتی جس حد تک زنا، جھوٹ بولنے، عورتوں سے دست درازی کرنے اور اپنے سے کمتر لوگوں کو تکلیف پہونچانے کو برا سمجھتے تھے اُسی حد تک اپنے مخالفوں کو لوٹنے حتیٰ کہ راہزنی تک کو برا نہ سمجھتے تھے یہی وجہ ہے کہ یہ دیکھا گیا ہے کہ فتیوں نے راہزنیاں بھی کی ہیں، اس سلسلے کی سب سے مشہور روایت یعقوب بن لیث صفاری کی ہے جو کہ اپنے زمانے کے عیاروں کا پیشوا تھا۔ لیکن وہ لوگ اپنے ناموس کے مسایل کے سلسلے میں اتنے متعصب تھے کہ وہ اپنی بیوی، بہن یا لڑکی کے بارے میں صرف کوئی خبر سن کر ہی تحقیق کئے بغیر ان کو مار ڈالتے تھے، یہ طریقہ مصر میں آج بھی دیکھا جاتا ہے" (ص ۱۵۳)

اس کے بعد سعید نفیسی نے ایک بار پھر ناصر لدین اللہ کا ذکر کیا ہے چونکہ ہم اس خلیفہ کا ذکر گذشتہ سطور میں کر چکے ہیں اس لئے اس موضوع سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔ یہ بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ اس مقام پر سعید نفیسی نے جن مباحث کو پیش کیا ہے وہ اپنے عنوان سے میل نہیں کھاتے۔ انھوں نے چند افراد کا صرف سرسری سا تذکرہ کر دیا ہے جس سے غیر ایرانی فتیوں کے بارے میں کسی خاص بات کا علم نہیں ہوتا بس اتنا معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ چند افراد جو ایرانی تھے یہ بھی فتی یا ایرانی اصطلاح میں "جوانمرد" تھے۔

سعید نفیسی نے "ایرانی فتوت" سے بحث کرتے ہوئے اس بات پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ اس سلسلے کے معروف پیشوا کون کون لوگ تھے۔ ان لوگوں میں انھوں نے سلطان صلاح الدین ایوبی حکمران مصر و شام کا بھی تعلق اسی گروہ فتیان سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے انھوں نے بغیر کسی حوالے کے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اسی بادشاہ کی وجہ سے مصر اور شام میں جوانمردی کے مسلک کو بڑا فروغ ہوا۔ اسی طرح انھوں نے ایک مصری امیر اسامہ بن مرشد بن علی بن مخلد بن نصر بن منقذ (۴۸۸-۵۸۴ھ) کا بھی خاص طور سے ذکر کیا ہے جس کو وہ ایک اچھے ادیب اور انتہائی دلیر شخص کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں اور اس کو اپنے زمانے کی موثر ترین شخصیت قرار دیتے ہیں مگر اس شخص کے بارے میں بھی وہ کسی کتاب یا واقعے کا حوالہ نہیں دیتے۔ ان دو افراد کا ذکر کر کے وہ سفرنامۂ ابن بطوطہ کے بعض مندرجات کی روشنی میں ایشیائے کوچک میں فتیوں یا جوانمردوں کا وجود ثابت کرتے ہیں اور ابن بطوطہ کو ان کے مہمان کی حیثیت سے جو تجربات ہوئے تھے اس کو قدرے تفصیل سے نقل کرتے ہیں اور اس بات کو فراموش کر دیتے ہیں کہ ان کو مشہور و معروف فتیوں کا تعارف کرانا ہے۔ اس قدرے تفصیلی بحث کے بعد وہ پھر چند فتیوں کا نام درج کرتے ہیں جو یہ ہیں۔ اخی فرج زنجانی (متوفی ۴۵۷ھ) اخی علی قتلغ شاہ، اخی محمد دہستانی اور اخی علی مصری۔ سعید نفیسی نے ان فتیوں کے صرف نام درج کر دیئے ہیں ان کے بارے میں کوئی اور اطلاع نہیں فراہم کی ہے۔ ان افراد کا نام درج کرنے کے بعد وہ دوسری ہی سانس میں امیر عنصر المعالی کیکاؤس بن قابوس بن وشمگیر بن زیار کا ذکر کرتے ہیں جو شہرۂ آفاق کتاب "قابوس نامہ" کا مصنف ہے۔ عنصر المعالی نے اس کتاب کا آخری باب "در آئین جوانمردی" کے عنوان سے لکھا ہے اور اس کے مباحث کو تصوف کے مباحث سے ملا دیا ہے چونکہ عنصر المعالی نے اپنے لڑکے گیلان شاہ کو اس بات کی تلقین کی ہے کہ وہ مسلک جوانمردی اختیار کرے اس لئے سعید نفیسی نے عنصر المعالی کی

اس تحریر سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اُس زمانے تک تصوف اور جوانمردی یا فتوت دو الگ الگ چیزیں نہیں تھیں۔ ایران کے بادشاہ اور شاہزادے اس مسلک کو اختیار کرتے اور اس بات کی کوشش کرتے کہ ان کی اولاد بھی اسی مسلک کو اختیار کرے۔ سعید نفیسی کے قول کے مطابق یہ سلسلہ صفویوں کے دورِ اقتدار کے آغاز تک جاری رہا اس کے بعد یہ روبہ زوال ہونا شروع ہوا مگر اس مسلک کے ماننے والے معدوم نہیں ہوئے ہاں یہ ضرور ہوا کہ ان کی تعداد کم ہوتی گئی اور رفتہ رفتہ انگشت شمار ہو کر رہ گئی۔

اسی سلسلۂ سخن میں سعید نفیسی نے ایک ایسا نکتہ پیش کیا ہے جو ہمارے خصوصی مطالعے کا مستحق ہے ان کا بیان ہے کہ جس زمانے میں یہ مسلک ایران میں اپنے پورے عروج پر تھا دستکار اور ہنرمند طبقے کے افراد اس مسلک سے منسلک تھے اور ان سب کے لئے الگ الگ، آئینِ فتوت یا جوانمردی مقرر تھے (اس میں غالباً وہ پیشہ ور طبقے شامل رہے ہوں گے جن کا ذکر گذشتہ سطور میں کیا جا چکا ہے یعنی قصاب، حجام وغیرہ) اس سلسلے میں انھوں نے ملا حسین کاشفی کے "فتوت نامۂ سلطانی" کا خاص طور سے ذکر کیا ہے جس میں ہر پیشے اور ہر طبقے کے لئے الگ الگ آئینِ فتوت درج ہے۔ اس سلسلے کا دوسرا اہم نکتہ انھوں نے یہ لکھا ہے کہ اس زمانے میں جو لوگ کسی حرفت یا ہنر کے پیشے سے منسلک نہ ہوتے وہ لوگ بھی فتوت یا جوانمردی کے مسلک کو اختیار کرنے کے بعد کوئی نہ کوئی ایسا پیشہ اختیار کرتے جو حرفت و ہنر کے زمرے میں آتا اس بارے میں انھوں نے روم کے سلجوقیوں کے عہد کے مشہور مورخ ابن بی.بی کے حوالے سے کیقباد سلجوقی کے بارے میں لکھا ہے کہ جب وہ دائرۂ فتوت یا جوانمردی میں داخل ہوا تو اس نے کئی حرفتوں میں مہارت حاصل کی۔ سعید نفیسی کے خیال کے مطابق ہنر کے حصول کی طرف جوانمردوں کی اس رغبت کی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کے پیش نظر یہ حدیث رہتی "الکاسب حبیب اللہ" (کسب کرنے والا اللہ کا پیارا ہے) اور اسی بناء پر کوئی "جوانمرد"، طفیلی بن کر [illegible]

گذارنے کا عادی نہ تھا۔

ایرانی تصوف میں "جوانمردی" کا جو تصور سعید نفیسی پیش کرتے ہیں اس کو وہ فرقہ ملامتیہ کے افکار و نظریات سے ملا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ "جوانمرد"، اور "ملامتی" صوفیہ ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں ان کو اصل غذا ایک ہی جڑ سے ملتی ہے جس کو وہ ایرانی تصوف کا نام دیتے ہیں اور اس تصوف کو بودھوں، زرتشتیوں اور مانویوں کے افکار و نظریات سے مستفاد قرار دیتے ہیں۔

قطب الدین اشرف

شرح مرغوب القلوب

سے

معراج العاشقین تک*

"تحقیقی سرگرمیوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اردو نثر کے ابتدائی نمونے واس کے خدو خال عارفوں کے تکیوں اور صوفیوں کی خانقاہوں میں مرتب ہوئے۔ ان مردانِ حق شناس نے نثر کو وحدانیت کی عام توسیع کا وسیلہ بنایا۔ اس لسانی و تاریخی صداقت سے بھی انکار ناممکن ہے کہ اکثر و بیشتر صوفیائے کرام کا مرکز "دکن" رہا ہے۔ اس طرح اردو نثر کی ابتدائی نشو و نما میں دکن کی دو خود مختار حکومتوں گویا عادل شاہی حکومت بیجاپور (۸۹۵ھ / ۱۴۹۰ء) اور قطب شاہی حکومت گولکنڈہ (۹۱۶ھ / ۱۵۱۰ء) کا اہم رول نظر آتا ہے۔

دکنی درویشوں کی کہانی دہلی میں ۱۳۲۱ء میں تغلق خاندان کے قیام سے وابستہ ہے۔ اس خاندان کا دوسرا بادشاہ محمد بن تغلق ہے جس نے تخت نشینی کے دو تین سال بعد ہی اندازہ لگا لیا کہ دکن کی دہمات کو دہلی میں بیٹھ کر رام نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اس نے دیوگری (دولت آباد) کو

---

* جناب قطب الدین اشرف صاحب ریسرچ اسکالر، دین منزل، موضع کھیرانٹی، پوسٹ حسین گنج سیوان (بہار)

۱۳۲۷ء میں پایۂ تخت بنایا۔ اور دہلی کی اکثر آبادی اپنے لسانی ورثے کے ساتھ ارضِ دکن پر منتقل ہو گئی۔ ڈاکٹر شمس اللہ صدیقی نے لکھا ہے :۔

"محمد تغلق نے ۱۳۲۷ء میں دولت آباد کو دار الخلافہ بنانے کی کوشش کی اور اہل دلی کو حکم دیا کہ وہاں جاکر رہیں۔[4] تاریخ گواہ ہے کہ عوام و خواص کے علاوہ صوفیوں اور فقیروں کی چودہ سو پالکیاں دکن آئیں۔ چودہ سو کی مناسبت سے وہاں کی مسجد کا نام "چہار دہ صد اولیاء" پڑا ہے۔[5]

ان عارفوں میں حضرت برہان الدین غریب کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ آپ حضرت نظام الدین اولیاء (وفات ۱۳۲۵ء) کے خلیفہ تھے۔[6] آپ کی وفات ۱۳۳۷ء میں ہوئی۔ آپ حضرت نظام الدین اولیاء کے مرشد حضرت بابا فرید شکر گنج کے ممتاز خلیفہ حضرت جمال الدین ہانسوی کے بھانجے ہیں۔[7]

دوسرے سید یوسف حسینی المعروف بہ راجا یا شاہ راجو ہیں۔ حضرت ۱۳۲۵ء میں دولت آباد آئے۔ آپ کے والد حضرت سید علی حضرت نظام الدین اولیاء کے مرید تھے۔ آپ کی اہلیہ "بی بی رانی" کے نام سے مشہور ہیں۔ لسانی و تحقیقی اعتبار سے آپ اس لئے بھی قابل ذکر ہیں کہ آپ کے ساتھ آپ کے برگزیدہ فرزند حضرت بندہ نواز گیسو دراز بھی دولت آباد آئے۔ حضرت راجو کا سن ولادت معلوم نہیں ہو سکا ہے۔ سن وفات میں بھی اختلاف ہے۔ آزاد بلگرامی نے "روضۃ الاولیاء" میں ۷۳۱ھ/۱۳۳۱ء لکھا ہے۔[6] "روضۃ الاقطاب" میں بھی یہی درج ہے۔ حضرت راجو کے شعری کلام کے علاوہ ایک رسالہ نثر میں بھی ہے۔ جو مشتبہ ہے۔ یہ رسالہ سید محمد حسینی گیسو دراز کے کچھ رسالوں کے ساتھ کتب خانہ گلبرگہ شریف میں محفوظ ہے۔[7] آپ فارسی اور قدیم اردو کے اچھے شاعر تھے۔ راجا تخلص کرتے تھے۔ ان کا ایک دیوان بہ نام "دیوان شاہ راجو قتال" کتب خانہ گلبرگہ دکن میں موجود ہے۔[8]

حضرت شیخ گنج العلم بھی اس دور کے صوفیا میں خصوصی طور پر قابل احترام ہیں۔ آپ کی وفات بہمنی دور میں ۷۹۵ھ/۱۳۹۲ء میں ہوئی۔ بہمنی حکومت ۱۳۲۵ء میں وجود میں آگئی تھی۔ حضرت کا سلسلۂ حسب و نسب حضرت جنید بغدادی تک پہنچتا ہے۔[9]

حضرت عین الدین گنج العلم کے بعد ادبی و تحقیقی نقطۂ نظر سے سب سے اہم بزرگ سید محمد حسینی بندہ نواز گیسو دراز ہیں۔ سید محمد نام، ابوالفتح کنیت اور صدرالدین گیسو دراز آپ کا لقب تھا۔ آپ کچھ عرصہ قبل تک اردو کا اولین نثار ہونے کا شرف حاصل تھا۔ اب یہ شرف حضرت میراں جی شمس العشاق کو حاصل ہوگیا ہے۔ ان کی کتاب "شرح مرغوب القلوب۔ (جو فارسی مثنوی "مرغوب القلوب" کا نثری ترجمہ ہے) اردو کی پہلی نثری تصنیف کہی جاسکتی ہے۔ "معراج العاشقین" و دیگر رسالے جو بندہ نواز گیسو دراز کے کہے جاتے رہے وہ بہت بعد کی تخلیق ہیں۔ اور ان کے خالق گیارہویں صدی ہجری کے ایک بزرگ حضرت مخدوم شاہ حسینی ہیں۔

محمد حسینی بندہ نواز گیسو دراز کی ولادت ۲۱ ۷ھ/۱۳۲۱ء میں دہلی میں ہوئی۔ آپ حضرت نظام الدین اولیاء کے خلیفۂ اعظم شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی (۷۵۷ھ/۱۳۵۶ء) سے ۱۳۳۶ء میں بیعت ہوئے۔ اس وقت آزاد بلگرامی کے مطابق آپ کی عمر پندرہ برس تھی۔ پیر کی وفات کے بعد آپ ان کے سجادہ نشین ہوئے۔ آپ چشتیہ سلسلے کے علمبردار ہیں آپ نے گلبرگہ کو ارشاد و ہدایت کا مرکز بنایا۔ اور ۸۲۵ھ/۱۴۲۲ء میں ایک سو چار برس کی عمر میں وہیں پردہ فرما گئے۔ فیروز شاہ بہمنی نے ۱۴۱۵ء میں اپنے ناخلف فرزند کو بادشاہ بنایا۔ حضرت اس عمل سے ناخوش ہوئے کیونکہ بادشاہت کا اہل اس کا چھوٹا بھائی احمد شاہ تھا۔ اس مخاصمت کی بنا پر فیروز شاہ بہمنی نے آپ کو کہلا بھیجا کہ مع اہل و عیال کے شہر سے باہر تشریف لے جائیں۔ لہذا آپ وہیں فروکش ہوئے جہاں آپ کا مزار ہے۔ احمد شاہ نے آپ کے مزار پر حسین گنبد ۱۴۳۸ء میں تعمیر کرایا تھا جو آج بھی عوام و خواص کے لئے روشنی کا مینارہ ہے۔ اسی احمد شاہ کے ہم عصر حضرت فخر دین نظامی ہیں جنہوں نے احمد شاہ کے دور حکومت (۱۴۲۲ء۔ ۱۴۳۵ء) میں "کدم راؤ پدم راؤ" لکھی جو اردو کی اولین شعری تصنیف کہی جاتی ہے۔ بندہ نواز گیسو دراز فارسی و دکنی کے شاعر تھے۔ شہباز تخلص فرماتے تھے۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے لکھا ہے:

"خواجہ بندہ نواز کی زیادہ تر شاعری موسیقی یا راگ راگنیوں کے تابع ہے۔ جس

سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ موسیقی کے ماہر بھی تھے۔ ان کی شاعری میں جذب و مستی و جذب و شوق اور عشق و محبت کی کیفیات کا جو مزہ پوشیدہ ہے اس کو اہل دل ہی محسوس کرسکتے ہیں۔[11] [12] انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ سلطان ابراہیم عادل شاہ نے آگے چل کر جو کتاب "نورس" نامی لکھی اس میں جس عقیدت کے ساتھ بندہ نواز کا نام لیا ہے اس سے ہندوستانی موسیقی میں بندہ نواز کے مقام کا اندازہ ہوتا ہے۔ آپ کے حالات محمد قاسم فرشتہ کی "تاریخ فرشتہ" علی گڑھ، اردو ادب، "تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند" وغیرہ میں مل جاتے ہیں۔ نیز ڈاکٹر عبدالحق (معراج العاشقین" تاج پریس حیدرآباد ۱۹۲۳ء) ڈاکٹر شمس اللہ قادری ("تاریخ زبان اردو" کتابستان حیدرآباد ۱۹۲۵ء) گوپی چند نارنگ و ڈاکٹر خلیق انجم ("معراج العاشقین" دہلی ۱۹۵۷ء) نے بہت کچھ لکھا ہے مگر "معراج العاشقین" پر تحقیقی اعتبار سے ڈاکٹر حفیظ قتیل عثمانیہ یونیورسٹی (معراج العاشقین کا مصنف ۱۹۶۶ء) دیوی سنگھ چوہان (معراج العاشقین "نوائے ادب" جولائی ۱۹۶۶ء) اور ڈاکٹر نذیر احمد ("نوائے ادب" اکتوبر ۱۹۶۷ء) نے جامع کام کیا ہے۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل نے تحقیق کی ایک نئی روش قائم کی ہے۔

بہمنی دور کے زوال کے بعد عادل شاہی حکومت بیجاپور میں ۸۹۵ھ / ۱۴۹۰ء میں قائم ہوئی[13] جو تہذیبی اور لسانی اعتبار سے پر عظمت اور بہت ممتاز تھی۔ مگر قضا و قدر کے ہاتھوں ۱۰۹۷ھ / ۱۶۸۶ء میں عادل شاہی حکومت مغلیہ سلطنت میں شامل کر لی گئی۔ اس دور میں بندہ نواز کے مریدوں و معتقدوں کا سلسلہ بہت دور تک پھیلا، جو گلبرگہ سے نکل کر بیجاپور اور اس کے گرد و نواح میں رشد و ہدایت کے نور لٹاتے رہے۔ بندہ نواز سے متاثر بزرگوں میں سب سے معتبر نام حضرت میراں جی شمس العشاق کا ہے۔ "تذکرہ اولیاء دکن" میں آپ کی وفات کا سال ۹۷۰ھ / ۱۵۶۲ء درج ہے۔ بعض دوسرے حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے ۹۰۲ھ / ۱۴۹۶ء میں وفات پائی۔ آپ حضرت کمال الدین بیابانی کے مرید و خلیفہ تھے[14] مولوی عبدالحق نے مادۂ تاریخ ۹۰۲ھ ہی نکالا ہے[15] اور یہی مستند ہے۔ میراں جی شمس العشاق کا مربوط نثری رسالہ "شرح مرغوب القلوب" ہے۔ جو اب تک کی تحقیق کی روشنی میں سب سے قدیم

او مستند ہے۔ بعض (ماہر لسانیات) نے اس سلسلے میں شک و شبہ کا اظہار کیا ہے۔ حالانکہ اس کا قلمی نسخہ انجمن ترقی اردو کراچی پاکستان میں موجود ہے۔ جو تمام شبہات کی سرکوبی کے لئے کافی ہے۔ اس میں میراں جی نے اپنے مخصوص انداز میں صوفیانہ عقائد، شریعت طریقت، پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس میں دس باب ہیں، جس میں توبہ طریقت، وضو، دنیا اور ترک دنیا پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ نثر کا انداز بیانیہ ہے۔ فارسی اسلوب و آہنگ کا اثر واضح ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا بیان ملاحظہ فرمائیں۔

"شرح مرغوب القلوب" کے بارے میں اس لیے کسی شک و شبہہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ یہ نثری تصنیف اس مخطوطے (شمس العشاق۔ قلمی۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی) میں موجود ہے جس میں میراں جی، برہان الدین جانم، امین الدین اعلا کی کم و بیش ساری تصانیف موجود ہیں۔ یہ مخطوطہ ۱۰۶۸ھ/۱۶۵۷ء کا لکھا ہوا ہے۔ اور اس میں "شرح مرغوب القلوب" کو میراں جی کی تصنیف بتایا گیا ہے[۱۷]

محی الدین قادری زور نے بھی "شرح مرغوب القلوب" کو میراں جی کی تصنیف بتایا ہے[۱۸] "شرح مرغوب القلوب" کے نثری نمونے ملاحظہ ہوں :-

"پیغمبر علیہ السلام کہے خدا کی آشنائی جسے کوئی پوچھتا ہے انوں کیا توں رہ کر انوکھی توبوج، انوکھی توں سُن ہو۔ جب نکو اچھ اس چار تاباں کا پنا ہے۔ یوں شریعت میں پہلے پہلیں پاؤں رکھ طریقت، شریعت منج ہے۔"[۱۸]

"اے ایمانی! یاد کر خدا کوں، بھوت یاد کر ہور رو رو کر یاد کر۔ ہو یگانہ جو سالک اپنا، توں باج توبہ بندگی کرنا یوں ہے جوں جھاڑاں کا بانی جھوٹ ہے۔ اسے بندگی بی جھوٹ ہے خدا کا پچھانت باج۔"[۱۹]

میراں جی کے بعد ان کے فرزند شاہ برہان الدین جانم کا نام آتا ہے۔ جو پائے کے بزرگ، اور اپنے والد کے خلیفہ اور رئیس القلم ہیں۔ ان کے مطبوعہ "ارشاد نامہ" (مرتبہ ...) کے مطابق ان کی وفات سنہ ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء میں ہوئی۔ مولوی عبدالحق نے اس سے اتفاق ہے۔ عبدالحق نے یہ بھی بتایا ہے کہ "ارشاد نامہ" حضرت کی آخری تصنیف ہے[۲۰]

...کے شعری کلام پر سنسکرت اور دکنی کا اثر ہے۔ تشبیہیں عام اور عبارت و خیال سادہ ہیں۔
"کلمۃ الحقائق" شاہ برہان الدین جانم کا مربوط نثری رسالہ ہے جسے محمد اکبر الدین صدیقی نے مرتب کر کے ادارہ ادبیات حیدر آباد سے ۱۹۶۱ء میں شائع کر دیا ہے۔ عبدالحق نے لکھا ہے کہ یہ رسالہ اچھا بڑا ہے اور اس میں تصوف کے مسائل سوال و جواب کے طرز پر بیان کئے گئے ہیں[۱۲] دوسرے تاریخی حوالے سے یہ بھی ثابت ہے کہ ان کے ہم عصر صوفیا و ثقہ بزرگ ہندوی طرز میں لکھنے سے گریز کرتے تھے۔ یہ ابراہیم عادل شاہ اول (۱۵۳۵ء) کی تحریک کا اثر تھا۔ جس سے ایرانی اثرات کو مٹانے کی سرکاری طور پر کوشش کی تھی۔ اور دفتروں و دربار میں دکنی کو رائج کرنے کی مہم چلائی تھی۔ مگر صوفیا جن کو عربی و فارسی کا ذوق تھا وہ نالاں تھے۔ "کلمۃ الحقائق" پر ہندوی کا اثر غالب ہے۔ مولوی عبدالحق نے شاہ برہان الدین جانم کے ایک شعر کا ترجمہ کر کے ان کا مطمح نظر واضح کیا ہے کہ ہندی لفظوں میں کوئی عیب نہیں۔ اگر سمندر کے موتی سی "جوہر" میں ملیں تو عقلمند انہیں کیوں نہ لے۔ "کلمۃ الحقائق" کا جو قلمی نسخہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ میں ہے اس کی تمہیدی و تعارفی عبارت حسب ذیل ہے:

"حضرت برہان الدین قطب الاقطاب، حضرت شاہ برہان العارفین قدس سرہ تصنیف کردہ اند"

یہ فقرہ اس امر کا غماز ہے کہ برہان الدین جانم کے کسی عقیدت مند نے اسے مرتب کیا ہے۔ "کلمۃ الحقائق" کے مطبوعہ نسخہ کی ابتدائی عبارت ملاحظہ ہو:

"اللہ کرے سو ہوئے کہ قادر و توانا قدیم کہ قدیم القدیم اس قدیم کا کبھی کر نہاں سچ بہج سو تیرا سہار سچ ہوا بھی تج تھے۔ اربدھان کچھ نہیں بھی تھا۔ دوجا شریک کوئی نہیں تھا[۲۲]"

مذکورہ بالا عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ نے فارسی و دکنی کا آمیزہ نثر میں شامل کیا ہے۔ پھر بھی "کلمۃ الحقائق" میں دو رجحان ملتے ہیں۔ کہیں تو بیچ بیچ کا طرز ہے کہیں افعال و ضمائر دکنی کے ہیں ورنہ عبارت فارسی کی ہے۔ رسالے میں تصوف کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔

برہان الدین جانم کے بعد خانوادۂ چشت کے دو بزرگ گویا حضرت شاہ امین الدین اعلا اور سید محمد شہباز حسینی کا ذکر لازمی ہے حضرت سید محمد شہباز حسینی تو بندہ نواز کے خاندان سے براہ راست رشتہ رکھتے ہیں، مگر شاہ امین الدین اعلا بندہ نواز سے متاثر صوفیا کی اولاد ہیں۔

شاہ امین الدین اعلا، شاہ برہان الدین جانم کے فرزند اور ان کے خلیفہ ہیں۔"تذکرہ اولیاء" کے مالک عبدالجبار کے مطابق شاہ امین الدین اعلا کے مریدوں کی کثیر تعداد میں "میراں جی خدا نما" (شرح تمہید ہمدانی) اور سید ہاشم نیشاپوری امتیازی مقام رکھتے ہیں[۵۳] مولوی عبدالحق نے شاہ امین الدین اعلا کے انتقال کو ۱۰۸۶ھ / ۱۶۷۵ء کا سانحہ بتایا ہے[۵۴] مگر عبدالجبار خان نے "تذکرہ اولیاء دکن" میں مادہ تاریخ "ختم الولی" سے ۱۱۱۶ھ / ۱۷۰۴ء نکالا ہے[۵۵] شاہ امین الدین اعلا شاعر کے علاوہ نثار بھی تھے۔ مگر ان کی نثر ان کے والد کی نثر سے صاف اور غیر پیچیدہ ہے۔ ان کی نثر مختلف کتابوں میں بکھری پڑی ہے۔ مگر قلمی نسخہ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ اور انجمن ترقی اردو علی گڑھ میں ہیں۔ ان کے دو نثری رسالے ذکر کے قابل ہیں۔ ایک "گفتار شاہ امین" اور دوسرا "گنج مخفی" ہے۔ جو تصوف سے متعلق ہیں[۵۶] ملاحظہ ہو "گنج مخفی" کا ایک پارہ:-

> "اللہ تعالیٰ گنج مخفی کوں عیاں کو نا چاہا تو اول اس میں سوں ایک نظر نکلی۔ سو اس سے امین دیکھ ہوا۔ امین شاہد کہتے ہیں۔ یو دونوں ذات کے دو طور ہیں۔ ذات نے اس کو دیکھا اس کو نظر کہتے ہیں۔ دیکھ کر گواہی دی تو اسے شاہد کہتے ہیں۔
> یہ تینوں مرتبے ذات کے ہیں"

اس سے زبان کے واضح ارتقاء کا احساس ہوتا ہے۔ ہندوی اثر زائل ہوتا گیا ہے اور کھڑی بولی و فارسی اسلوب زیادہ گہرا ہوتا گیا ہے۔ ملا وجہی کی "سب رس" بھی اسی دور کا کارنامہ ہے ۱۰۴۵ھ / ۱۶۳۵ء۔

اس سلسلے کے ایک اور بزرگ جن کا ذکر تاریخی اعتبار سے حضرت امین الدین اعلا سے پہلے ہی ہونا چاہیئے تھا وہ سید محمد شہباز حسینی بیجاپوری ہیں۔ جن کا مختصر ذکر "روضۃ الاولیائے بیجاپور" اور "تذکرہ اولیاء دکن" میں مل جاتا ہے۔ مگر ڈاکٹر عبدالحق، ڈاکٹر شمس اللہ قادری اور

تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند" کے مصنف اس سلسلے میں خاموش ہیں؛ علی گڑھ تاریخ ادب اردو" میں ان کا ذکر ہے۔ سید محمد حسینی شہباز، عادل شاہی دور کے جید صوفی اور بزرگ تھے۔ آپ ابراہیم عادل شاہ (مصنف "نورس") کے ہم عصر ہیں۔ آپ کی وفات ۱۰۱۵ھ مطابق ۱۶۰۶ء میں بیجاپور میں ہوئی۔[۲۷] آپ کے تفصیلی حالات پردۂ خفا میں ہیں۔ حتیٰ کہ آپ کے والد کا نام معلوم نہیں ہو سکا ہے۔ اور نہ یہ کہ آپ کے پیر کون تھے۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے لکھا ہے کہ آپ شاہ ہدایت اللہ حسینی کے پوتے تھے اور شاہ ہدایت اللہ حسینی بندہ نواز کی اولاد میں تھے[۲۸] اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ "حسینی" لقب خاص بندہ نواز کی اولادوں کا ہے۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل نے جن بزرگ کو "معراج العاشقین" وغیرہم کا مصنف بتایا ہے وہ بھی اسی خانوادے کے ہیں۔ حضرت مخدوم شاہ حسینی کے پیر جن کا نام انھوں نے خود "معراج العاشقین" میں درج کیا ہے وہ "پیر اللہ حسینی" ہیں۔ علیگڑھ انجمن ترقی اردو کے "نسخۂ معراج العاشقین" کے اخیر کے چند جملے ملاحظہ ہوں:-

"اے مخدوم حسینی تو کتنا بولے گا۔"

"اے مخدوم تو پیر اللہ حسینی کے کرم سوں اس راز کی خبر پایا"

آثار و قرائن کی مدد سے کہا جا سکتا ہے کہ اس خانوادے والوں کو بیعت یا خلافت کے لئے کسی دوسرے بزرگ کا کبھی محتاج نہیں ہونا پڑا۔ خاندان میں ہی بزرگوں کی کیا کمی تھی۔ تاریخ اس بات کی بھی گواہ ہے کہ اس خاندان میں خلافت باپ سے بیٹے کو ورثے کے طور پر ملتی رہی قیاس غالب ہے کہ حضرت سید محمد شہباز حسینی کو بھی ولایت باپ سے ورثے میں ملی ہوگی۔

"معراج العاشقین" پر کام کرنے والوں میں سب سے اہم نام ڈاکٹر حفیظ قتیل کا ہے۔ جنھوں نے مستند لسانی دلائل اور ٹھوس اثبات کے ذریعہ ۱۹۶۸ء سے ماقبل کی تمام تحقیقات کو باطل قرار دے دیا۔ ڈاکٹر قتیل کی تحقیق کے اہم پہلوؤں کی صراحت تحریر کی جاتی ہے۔

۱۔ "معراج العاشقین" معتبر شواہد کی رو سے بندہ نواز کی تصنیف نہیں بلکہ گیارہویں صدی ہجری کے ایک بزرگ مخدوم شاہ حسینی کی تخلیق ہے۔ صوفیا میں حسینی لقب کے بہت سے بزرگ گذرے ہیں۔ اس لئے کاتبوں نے محض حسینی کو بنیاد بنا کر "معراج العاشقین"

کو بندہ نواز سے منسوب کر دیا۔ اس لئے سب سے قدیم نثری نمونہ اب میراں جی شمس العشاق کا رسالہ "شرح مرغوب القلوب" ہے۔ گو کہ ڈاکٹر قتیل نے جانم کے "کلمۃ الحقائق" کو اولین نثری نمونہ کہا ہے جو غلط ہے پھر بھی حتمی طور پر کون کہہ سکتا ہے کہ میراں جی ہی اردو کے اولین نثار ہیں۔ ممکن ہے تلاش و جستجو سے ان سے قدیم کوئی نثار مل جائے تو میراں جی کی اولیت چھن بھی سکتی ہے۔

۲۔ "معراج العاشقین" کے بندہ نواز کی تصنیف نہ ہونے کا ٹھوس اور اندرونی ثبوت کتاب کا متن ہے۔ اس کی نثر آٹھویں صدی ہجری کی ہرگز نہیں۔ گیارہویں صدی ہجری میں جو نثر رائج تھی وہ "معراج العاشقین" کی نثر سے میل کھاتی ہے۔ اس پہ فارسی اور عربی غلبہ ہے جبکہ آٹھویں صدی ہجری میں ایسی نثر کا وجود نہیں ملتا۔ آٹھویں صدی ہجری کی زبان بوجھل مبہم اور ہندی و سنسکرت کی آمیزش کی وجہ سے پیچیدہ ہے۔ "معراج العاشقین" کی نثر قدرے صاف اور شستہ ہے۔ جس پر کھڑی بولی کا اثر نمایاں ہے۔ آٹھویں صدی ہجری میں کھڑی بولی منصۂ شہود پر نہ آسکی تھی۔ کھڑی بولی تاریخی طور پر مغلوں کے دور میں ہی نکھری۔ اس کا نکھرا ہوا روپ فارسی و عربی کے قالب میں ڈھل گیا جس سے "معراج العاشقین" عبارت ہے۔

۳۔ "معراج العاشقین" کے تصوف کا مزاج خالص بیجا پوری ہے۔ بیجا پوری تصوف کا ایک خاص رنگ تھا جس میں اسلامی تصوف اور ہندو فلسفہ کا امتزاج دیدنی ہے پھر برہان الدین جانم نے پہلے پہل وجود کے فلسفے کو ایک نئی شکل میں پیش کیا۔ اور "واجب الوجود"، "ممکن الوجود"، "ممتنع الوجود" اور "عارف الوجود" کے ذریعہ اس کے مختلف درجے متعین کیے گئے[۱۲]۔ "معراج العاشقین" میں بھی وجود کے پانچ اقسام اور گُن بتلائے گئے ہیں جو بلاشبہ برہان الدین جانم کی تقلید ہے۔

۴۔ قدیم قلمی مخطوطات میں تین رسالے مخدوم شاہ حسینی کے دستیاب ہوتے ہیں۔ جو بندہ نواز گیسو دراز کے سمجھے جاتے رہے ہیں[۱۳] جن کے مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ "معراج العاشقین کا مطبوعہ نسخہ "تلاوۃ الوجود" کا خلاصہ ہے جو تیرہ ابواب پر مبنی ہے۔

رسالہ کی ابتدا ایک مختصر تعارف سے ہوتی ہے۔ جو مصنف ہی کا لکھا ہوا ہے۔

"از تصنیف فقیر حقیر شاہ حسینی رہنما خانوادۂ چشت واہل بہشت وطن در دکن،
صوبہ دارالمظفر بجاپور راچور پرگنہ ساکن قصبہ بلکانور ملکہ"

شائع شدہ نسخہ کی پیچیدگی اور بے ترتیبی کا ذمہ دار کاتب ہے جس نے محض اپنی سہولت کے لئے "معراج العاشقین" کی شکل مسخ کی ہے۔

۵۔ خواجہ بندہ نواز کی دیگر فارسی نثر و اشعار میں خواجہ بندہ نواز کے تصوف کی حیثیت ایک کیف یا جذبہ کی ہے نہ کہ فلسفہ کی "معراج العاشقین" کے خشک فلسفوں سے ان کی کوئی نسبت نہیں۔

۶۔ سب سے قوی شہادت مخدوم شاہ حسینی کی تائید میں یہ ملی ہے کہ وہ "تلاوۃ الوجود" وغیرہ میں اپنے پیر کا نام "پیر اللہ حسینی" بتاتے ہیں۔ جس سے خواجہ کی طرف "معراج العاشقین" کے انتساب کی کلیتاً تردید ہو جاتی ہے۔

ان حقائق کے پیش نظر "معراج العاشقین" مخدوم شاہ حسینی کی تصنیف ثابت ہوتی ہے اور متعلقہ کتاب کا شائع شدہ ایڈیشن "تلاوۃ الوجود" کی تلخیص جس میں الحاق و تحریف سے کام لیا گیا ہے۔

مگر سب سے پیچیدہ اور تہہ دار رسائی مسئلہ یہ ہے کہ مخدوم شاہ حسینی صاحب کون ہیں؟ کہیں یہ سید محمد شہباز حسینی بیجاپوری تو نہیں؟ ڈاکٹر قتیل یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ مخدوم شاہ حسینی کے حالات کیا تھے۔ وہ قطعیت کے ساتھ یہ بھی نہ بتا سکے کہ مخدوم کس صدی ہجری سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے قیاسیات سے کام لیا ہے جو ان کی تحقیق کا سب سے کمزور پہلو ہے۔ اس لیے اس سلسلے میں کچھ وثوق کے ساتھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔ اس بحث کا آخری انداز پیش کرنے کے لئے مزید تحقیقات در پیش ہیں۔

جہاں تک "معراج العاشقین" کی بات ہے اس کا جو اصل نسخہ انجمن ترقی اردو علیگڈھ میں ہے۔ تیرہ ابواب پر مشتمل ہے۔ ان کی صراحت مختصراً بیان کی جاتی ہے۔

رسالہ کے پہلے باب میں مخدوم شاہ حسینی نے تن یعنی وجود کی پانچ قسموں کی تفصیل لکھی ہے۔ یعنی واجب الوجود، ممکن الوجود، ممتنع الوجود، عارف الوجود، اور واحد الوجود، ہر وجود کے پانچ خصائص بتلائے ہیں۔ دوسرے باب میں توحید اور اس کے لوازم کی نشاندہی کی ہے۔ یہ دونوں حصے گنجلک، صوفیانہ و فلسفیانہ رموز سے پُر ہیں۔ قرآن کی آیات اور احادیث و عارفانہ علامات نے عبارت کو مشکل و پیچیدہ بنا دیا ہے۔ تیسرے باب کا عنوان "گنج مخفی" ہے جس کو رسول اللہ صلعم کی شان میں قصیدہ یا نعت کہا جا سکتا ہے۔ چوتھے باب کا عنوان "پانچ منزل" ہے۔ جس میں معراج کے واقعہ کا ذکر ہے اور طریقت کی پانچ منزلوں کا نام لیا ہے۔ پانچویں باب کا عنوان "در بیان چہار کاسہ" ہے جس میں انھوں نے دودھ، پانی، شہد اور شراب، سے مختلف مفاہیم اخذ کیے ہیں۔ مختلف چیزوں سے ان کی تشبیہہ دی ہے۔ جو دراصل علامت نگاری ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

"اے عزیز! او فرشتیاں کے معنی سن۔ دودھ جبریل، پانی میکائل، شہد اسرافیل، شراب عزرائیل۔ دوسرے معنی جبریل عقل کوں بولتے۔ میکائل دل کوں، اسرافیل دم کوں۔ عزرائیل روح کوں۔"

چھٹے باب میں صدق، حیا، عدل، عنایت اور شجاعت کے مفاہیم مختلف انداز میں بیان کئے ہیں۔ اور ان کو دنیائے سنیت کے چاروں مسلک سے منسلک کر دیا ہے۔ گویا صدق حنفی، حیا شافعی، شجاعت مالکی اور عدل حنبلی ہے۔ ساتویں باب کا عنوان "در بیان معراج" ہے۔ جس میں معراج کے واقعہ کو بڑے والہانہ انداز میں بیان فرمایا ہے۔ نیز محب و محبوب کی بات چیت اور راز و نیاز کی تشریح علامتی انداز میں کی ہے۔ بہت ممکن ہے آگے چل کر ملا وجہی نے "سب رس" کی تمثیل نگاری میں اس سے استفادہ کیا ہو:۔

"بعد ازاں ملنے کا شوق ہوا اللہ کوں محبت ہور محمدؐ کو ذوق ہوا۔۔۔۔

جبریل لیکو صدق، عدل، شجاعت، عنایت یو صدق کا پے جامہ، عدل کا جامہ۔ حیا کا کمربند، شجاعت کا دستار، عنایت کا دوپٹہ، اڑ کر میرے معشوق کو لیاؤ۔"

آٹھویں کا عنوان "خلق کوں نصیحت کرنے کوں" ہے۔ اس میں اُسوۂ حسنہ کی پیروی کرنے اور کفر و شرک سے محفوظ و بیزار رہنے کی ترغیب دی ہے۔ نواں باب "در بیان مسلمانی کی ابتدا" ہے۔ اس میں مومنوں کے فرائض بتائے ہیں۔ دسویں باب کا عنوان "در بیان پیر کامل" ہے جس میں پیر کی اہمیت و ضرورت پر خامہ فرسائی کی ہے۔ سچے پیر کی شناخت کے طریقے بتائے ہیں اور ناقص پیر سے خبردار رہنے کی تلقین کی ہے۔ گیارہویں کی سرخی "در بیان ظاہر کی پیروی" ہے۔ بارہویں باب کا عنوان "در بیان پاکی وضو کرنے کی" ہے جس میں وضو اور طہارت کے اوصاف بیان کئے ہیں۔ تیرھواں باب جس کا عنوان "نماز حقیقی تلاوۃ الوجود" قرار دیا ہے بہت مبہم ہے۔ صوفیانہ اصطلاحات اور علامات افہام و تفہیم کی راہ میں سنگ رکاوٹ ہیں۔ اس میں نماز حقیقی کی ادائیگی کے طریقے بتائے ہیں۔ اس کے آداب و ضوابط درج کئے ہیں۔ پانچوں اوقات کی نماز کا ذکر کیا ہے اور پانچ وقت کی اذانوں کو ذکر جلی (فجر)، ذکر ہی (ظہر)، ذکر روحی (عصر)، ذکر سری (مغرب) اور ذکر خفی (عشاء) کے نام سے موسوم کیا ہے۔

"معراج العاشقین" کی نثر پر دکنی کھڑی بولی کا ملا جلا روپ ملتا ہے اور یہ روپ عربی و فارسی کے حسن میں ضم ہو کر شیریں آواز و زبان پیدا کرتا ہے۔ تشبیہات و استعارات عربی و فارسی سے مستعار ہیں۔ اس میں روزمرہ کی زبان کی مٹھاس بھی شامل ہے۔ دیوی سنگھ چوہان نے لکھا ہے:۔

> "وہ عوام کی بولی کو تحریر کا روپ دے رہے تھے۔ اور وہ بھی قرآن کے ایک مذہبی میدان میں۔ اس لیے ان عجمی یا بدیسی لفظوں کو کھڑی بولی میں سمو لینے میں ذرا فراخدلی سے کام لیا ہے۔۔۔۔ لیکن کھڑی بولی کی فطرت اور ضروریات حالات کے مدِنظر ان کو فارسی یا عربی زبانوں کے طے شدہ اصولوں کو مروڑ کر کچھ تبدیلیاں کرنی پڑیں۔"[۱۲]

"معراج العاشقین" کی نثر و اسلوب میں تکلمی اور خطابت کا انداز جلوہ گر ہے۔ قاری کو جگہ جگہ بے ربطی کا احساس ہوتا ہے۔ مگر زبان نسبتاً صاف ہے۔ اس طرح "معراج العاشقین" گیارہویں صدی ہجری کی نمائندہ نثری تصنیف ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ماجومدار "ایڈوانسڈ ہسٹری"، صفحہ ۳۱۰

۲۔ "تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند" مدیر: وحید قریشی چھٹی جلد ۱۹۷۱ء مقالہ: "سیاسی فکری اور تہذیبی پس منظر"، صفحہ ۴۔

۳۔ "علی گڑھ تاریخ ادبیات اردو" مقالہ: "اردو ادب بہمنی دور میں" از۔ پروفیسر عبدالقادر سروری جلد اوّل ۱۹۶۲ء۔ صفحہ ۱۴۳

۴۔ مولوی عبدالحق "اردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام" انجمن ترقی اردو ۱۹۶۹ء صفحہ ۱۸

۵۔ "بزم صوفیہ" صباح الدین عبدالرحمٰن صفحہ ۲۷۸

۶۔ "روضۃ الاولیاء" آزاد بلگرامی صفحہ ۱۹۔

۷۔ پروفیسر عبدالقادر سروری۔ مقالہ: "اردو ادب بہمنی دور میں" "علی گڑھ تاریخ ادبیات اردو" جلد اوّل۔ صفحہ ۱۴۶۔

۸۔ ڈاکٹر پی۔ این۔ دیوارے۔ A Short History of Persian Literature at Bahmani & Qutub Shahi Court, Deccan صفحہ ۲۰۔

۹۔ "دکن میں اردو" نصیر الدین ہاشمی۔ صفحہ ۲۷۔

۱۰۔ "معراج العاشقین" مرتبہ۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ دہلی ۱۹۵۷ء صفحہ ۵

۱۱۔ "تاریخ فرشتہ" محمد قاسم فرشتہ۔ نولکشور ایڈیشن صفحہ ۳۹۹ بحوالہ "مقالات شیرانی" جلد اوّل صفحہ ۱۴۴۔

۱۲۔ "تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند" چھٹی جلد۔ مدیر۔ وحید قریشی۔ مقالہ: مشائخ و دیگر مصنفین" ۱۹۷۱ء صفحہ ۲۵۷،۵

۱۳۔ ڈاکٹر نذیر احمد: "اردو ادب عادل شاہی دور میں" "علی گڑھ تاریخ ادب اردو" جلد اوّل صفحہ ۱۹۱۔

۱۴۔ "دکن میں اردو مع آندھرا میں اردو" نصیر الدین ہاشمی۔ صفحہ ۳۶۔

۱۵۔ "اردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام" عبدالحق صفحہ ۴۲۔ انجمن ترقی اردو ۱۹۶۹ء۔

۱۶۔ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ مقالہ: "دکنی و گجراتی ادب" "تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند" چھٹی جلد۔ ۱۹۷۱ء صفحہ ۳۹۷

۱۷۔ محی الدین قادری زور۔ مقالہ: "بہمنی دور" "نوائے ادب" بمبئی اکتوبر ۱۹۵۰ء صفحہ ۱۲۰۔

۱۸۔ "قدیم اردو" ۱۹۶۱ء کراچی صفحہ ۲۲ بحوالہ "تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند" چوتھی جلد صفحہ ۹۶۔

۱۹۔ ایضاً ــــــ صفحہ ۲۳۔

۲۰۔ رسالہ "اردو" جولائی ۱۹۲۷ء صفحہ ۵۱۹

۲۱۔ "اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" عبدالحق صفحہ ۰۰ انجمن ترقی اردو ۱۹۵۹ء

۲۲۔ "کلمۃ الحقائق" برہان الدین جانم۔ مرتبہ: محمد اکبر الدین صدیقی ادارہ ادبیات حیدرآباد ۱۹۶۱ء صفحہ ۲۱۔

۲۳۔ "تذکرہ اولیاء" حیدرآباد اور صفحہ ۱۲۰، ۱۱۶۔

۲۴۔ "اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصہ" صفحہ ۴۰۔

۲۵۔ "تذکرہ اولیائے دکن" عبدالجبار خان ملکاپوری صفحہ ۱۲۰۔

۲۶۔ "داستان تاریخ اردو" حامد حسن قادری صفحہ ۲۵۔

۲۷۔ رسالہ "اردو" اکتوبر ۱۹۵۰ء صفحہ ۷۔

۲۸۔ ڈاکٹر نذیر احمد "اردو ادب عادل شاہی دور میں" علی گڑھ تاریخ ادب اردو "پہلی جلد صفحہ ۲۶۹۔

۲۹۔ ڈاکٹر جمیل جالبی "دکنی اور گجراتی ادب" "تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند" چوتھی جلد صفحہ ۳۱۶

۳۰۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل "معراج العاشقین کا مصنف" مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۹۶۸ء۔

۳۱۔ "نوائے ادب" مقالہ: معراج العاشقین نئی تحقیق" پروفیسر سید محمد ہاشم اکتوبر ۱۹۰۰ء صفحہ ۷۔

۳۲۔ دیوی سنگھ چوہان مقالہ: "معراج العاشقین لسانی پہلو" "نوائے ادب" بمبئی شمارہ جولائی ۱۹۶۶ء صفحہ ۲۱۔

سید یحییٰ نشیط

سکھ مذہب : اردو شاعری میں

مذاہب عالم میں سکھ مذہب نسبتاً نیا ہے۔ اس مذہب کے بانی گرو نانک دریائے راوی کے کنارے واقع تلونڈی نامی موضع میں ۱۴۶۹ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اس موضع کو اب ننکانہ کہا جاتا ہے۔ گرو نانک نے اگرچہ کسی نئے مذہب کی بنیاد ڈالنے کا دعویٰ نہیں کیا تھا اور نہ ہی ان کا منشا و مقصد اس طرح کا تھا لیکن ان کے انتقال کے بعد گروؤں کی سعی و جہد سے یہ ایک مستقل مذہب بن گیا۔

گرو نانک نے اپنے پیش رو معلمین اور مصلحین ہی کی تعلیمات کو اپنا کر قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا تھا۔ مذاہب کے نام پر بنی نوع انسان کے درمیان جو تفرقہ پیدا ہو گیا تھا، گرو نانک نے اس خلیج کو پاٹنے کی کوشش کی۔ ہندوستان میں ہندو مسلم میں باہمی اتفاق پیدا کرنے اور مذہبی بُعد کو ختم کرنے کے لیے انھوں نے بہت کوشش کی، چنانچہ ان کی تعلیمات میں ان دونوں مذاہب کے اجزا بھی ملتے ہیں، اور ان کے معتقدین میں ہندوؤں کے ساتھ مسلمان بھی پائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گرو گرنتھ صاحب میں رامانند، کبیر داس اور نام دیو کے علاوہ خواجہ فریدالدین مسعود گنج شکر کا کلام بھی ملتا ہے۔

گرو نانک کا انتقال ۱۵۳۹ء میں ہوا۔ مرتے وقت انھوں نے اپنے ایک شاگرد لہنا کو اپنا جانشین بنایا تھا، جو سکھوں کے دوسرے گرو انگد جی کے نام سے معروف ہیں۔ ان کے بعد امرداس، ارجن دیو، رام داس، ہرگوبند، ہر رائے، ہرکشن، تیغ بہادر، اور گرو گوبند سنگھ یہ آٹھ گرو

ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط، کالی دولت خاں، مہاراشٹر ۔ ۴۴۵۲۲۶

ویسے تیغ بہادر تک تو سکھ مذہب ہندو مذہب ہی کا ایک حصہ سمجھا جاتا تھا، لیکن گرو گوبند سنگھ نے ذات پات کی تفریق کی خرابیوں کو خالص سیاسی نقطۂ نظر سے برطرف کر سکھوں کی ایک الگ قوم بنا ڈالی جس میں سکھوں کو معاشرتی مساوات دے دی گئی۔ اس طرح گرو گوبند سنگھ کے بعد سے سکھ مذہب ایک الگ مذہب کی حیثیت سے پروان چڑھنے لگا۔

اس مذہب کی مقدس کتاب "گرو گرنتھ صاحب" مانی جاتی ہے۔ جو پنجابی زبان میں اور گورمکھی رسم الخط میں لکھی ہوئی ہے۔ اس کتاب کی تدوین گرو ارجن صاحب سے منسوب کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ گرو نانک سے منسوب بھی ایک کتاب ہے جسے "جپ جی صاحب" کہتے ہیں۔

اس مذہب کی ترویج و اشاعت کے لئے اردو میں کئی کتابیں لکھی گئیں اور تراجم بھی ہوئے ہیں۔ یہ مذہب اردو ادب بالخصوص شاعری پر بھی اثر انداز ہوا ہے۔ چنانچہ شمالی ہندوستان پنجاب کے اردو شعراء کے کلام میں اس کا کافی اثر پایا جاتا ہے۔ جیسے شاہ اور محمد نوشہ گنج بخش (م ۱۰۶۴ھ/۱۶۵۴ء) کے کلام کو ہم بطور مثال پیش کر سکتے ہیں۔ جہاں تک اردو شاعری کا تعلق ہے تو مذہب کی ترویج میں اس کا بھی حصہ رہا ہے۔ چنانچہ اس مذہب کی مقدس کتابوں کے منظوم اردو تراجم اس کی بہترین مثال ہیں۔

گرو گرنتھ صاحب کے منظوم تراجم اس کے مختلف حصوں کے ہوئے ہیں۔ مجھے تا حال گرو گرنتھ صاحب کا کوئی مکمل ترجمہ نہیں مل سکا۔ اس کے ابتدائی حصے میں "جپ جی صاحب" کا ایک باب ہے۔ جپ جی صاحب گرو نانک کی تصنیف بھی مانی جاتی ہے۔ اس میں ۳۸ پوڑیاں (پنجابی شاعری کی ایک صنف) ہیں۔

صاحب: یہ لفظ ہندی ہے جس کے معنی ذکر کے ہوتے ہیں۔ جی لفظ تعظیم کے لئے لگایا گیا ہے اور صاحب سے مراد نانک ہیں۔ اس طرح اس کتاب کے نام کے معنی "گرو نانک کے اذکار" ہو گئے۔ اس کتاب میں جو منظومات درج ہیں وہ "پوڑی" کی شکل میں ہیں۔ سکھوں کے یہاں پوڑی راہِ سلوک کی ایک منزل کا نام ہے اور پنجابی ادب میں ایک صنف شاعری بھی، جو بحور و اوزان میں دیگر اصناف سے مختلف ہوتی ہے۔ "جپ جی صاحب" کا منظوم

ترجمہ خواجہ دل محمد نے ۱۹۴۵ء میں کیا تھا۔ ان سے پہلے مشرقی نامی ایک شاعر نے نثر میں اس کا ترجمہ کیا تھا جس میں جگہ جگہ اشعار کے ذریعہ بھی معنی و مفہوم سمجھائے گئے ہیں۔ دل محمد کا منظوم ترجمہ کتاب کے اصل متن کے ساتھ ہے۔

شاعر نے 'پوڑی' کے ہر شعر کا مفہوم ایک ایک شعر ہی میں واضح کر دیا ہے اور مشکل اصطلاحات کے معنی حاشیہ پر دے دیئے ہیں۔ اس طرح اصل متن کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ ترجمہ عام فہم زبان میں ہے، جس میں عرفان کی تعلیم دی گئی ہے، لیکن ترجمے میں شعری خوبیوں کا فقدان ہے۔ پوڑی ۳۷ کا یہ ترجمہ ملاحظہ کیجئے:

کرم کی منزل وہ منزل ہے — زور کی ھے بات جہاں
اس میں اور نہ پہنچے کوئی — غیر کا اس میں دخل کہاں
اس منزل میں پہنچیں گے — شہ زور بلی منصور ہیں جو
رام کی جن میں قوت ہے — اس قوت سے بھرپور ہیں ہم
بھگت یہاں من بستے ہیں — سیتا ؤں روپی عظمت سے
جن کا روپ بیان نہ ہو — ہے زیب جنھیں ہر زینت سے [1]

خواجہ دل محمد صاحب کا دوسرا ترجمہ "سکھ منی صاحب" کا ہے۔ یہ وہ مقدس نظم ہے جسے پانچویں گرو ارجن دیو نے تصنیف کیا تھا۔ اس میں کل ۲۴ باب ہیں، ہر باب میں چند بند ہیں اور ہر بند میں پانچ پانچ شعر۔ خواجہ دل محمد نے اسی مناسبت سے اس کتاب کا ترجمہ کیا ہے۔ اس کی زبان بھی نہایت صاف اور آسان ہے۔

یہاں "سکھ منی صاحب" کے تیرھویں باب کے چوتھے بند کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے:

کرتا ہے جو سنت کی نندا، نیک نہیں بدکار ہے وہ
کرتا ہے جو سنت کی نندا، بولو کس کا یار ہے وہ
کرتا ہے جو سنت کی نندا، اس پر ڈنڈ لگائیں گے
کرتا ہے جو سنت کی نندا، چھوڑ سب اس کو جائیں گے [2]

سکھ منی صاحب کا ایک اور منظوم ترجمہ بسمل دہلوی نے کیا تھا جو دیال پریس دہلی میں

چوتھی بار ۱۹۵۷ء میں چھپا تھا۔ بسمل کا یہ ترجمہ، ترجمہ سے زیادہ تفسیر محسوس ہوتا ہے۔ الفاظ کا وضاحتی انداز جہاں ترجمے کی روح کو مجروح کرتا ہے وہاں اصل مطالب سے دور بھی لے جاتا ہے۔ شاعر نے کچھ غیر ضروری ہی الفاظ ہی نہیں، اشعار تک ان میں ملا دیئے ہیں، جس کی وجہ سے اصل مطلب تک قاری پہنچ ہی نہیں سکتا۔ مثال کے طور پر پہلے باب (اشٹ پدی) کے یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یاد کر ذات خدا کو یاد کر　　　رنج و غم فکر و الم برباد کر
سب سے اول ہے اسی کی بندگی　　　سب سے افضل ہے اسی کی بندگی
اس کا عابد ہے جو دنیا سے قول ہے　　　اس کا ساجد ہے جو دل سے قول ہے
جس کا تن بھی یاد خالق پر نثار　　　جس کا من بھی یاد رازق پر نثار ہے [3]

خواجہ دل محمد نے اس اشٹ پدی کا ترجمہ یوں کیا ہے۔

رب کی یاد کئے جا بندے　　　یاد کئے سکھ پائے گا
یاد کئے جا تن من سے　　　سب جھگڑے روگ مٹائے گا
رب واحد کو یاد کئے جا　　　سب کا جو رکھوالا ہے
جپتے ہیں ان گنت اسے　　　ان گنتی ناموں والا ہے [4]

صاحب ذوق قارئین کے لئے پنجابی اشٹ پدی کے اصل اشعار بھی پیش خدمت ہے

سمر سمر سمر سکھ پاوہ!　　　کل کلیس تن مانہہ مٹاوہ
سمرو جاس بسنبھر ایکے　　　نام جپت اگنت انیکے

(ماخوذ از سکھمنی صاحب، خواجہ دل محمد: امرتسر ص ۱۸)

یہ چند منظوم تراجم سکھ مذہب کی مقدس کتابوں کے ہیں۔ ان کے علاوہ علاقہ پنجاب کے ایک بزرگ شاعر امر چند قیس نے "مثنوی لاڈوا" کے عنوان سے گرو گوبند سنگھ کی سوانح منظوم کی ہے جو تا حال زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہو سکی۔ رسالہ "ادم" لاہور/دہلی میں البتہ اس کی چند قسطیں چھپ چکی ہیں۔ بزرگ شاعر نے اپنے ایک مکتوب میں مجھے اس طرف متوجہ کیا تھا کہ "مثنوی لاڈوا" کے جو اوراق "ادم" میں شائع ہوئے ہیں ان سے

فرقہ پرستی کی بو آئے گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان سے میری ذات پر حرف آئے گا۔" ؎۵

لہذا "مثنوی لادا" کی مثالیں یہاں نظم زد کی جاتی ہیں۔ قیس کی ایک اور تصنیف "مثنوی شعلہ زار" ہے۔ اس میں بندہ ویراگی کی سوانح حیات منظوم ہوئی ہے۔

'جپ جی صاحب' کے مترجم مشرقی نے "در نعت سری گورو نانک جی نرنکاری، مقبول بارگاہ باری" کے عنوان سے جو مدحیہ اشعار قلمبند کئے ہیں یہاں چند مثالیں اس سے پیش کی جا رہی ہیں:

پس از حمد دارائے لوح و قلم — کرے اب مشرقی نعت نانک رقم
ضلالت پہ جب سب نے باندھی کمر — لگے پوجنے لوگ شمس و قمر

کیا ترک جب دھرم سنسار نے — تو نانک کو بھیجا نرنکار نے
مہاراج، حامی شرع متیں — شہنشاہ ملت، شہنشاہ دیں
سرِ سروراں، سرورِ مقبلاں — شہ عارفاں، مرشد کاملاں ؎۶

پنڈی داس قمر نے اپنی تصنیف 'گرو نانک درشن' میں گرو نانک کی سوانح عمری نظم کی تھی۔ قمر کی یہ کتاب ۱۹۲۴ء میں راولپنڈی سے چھپ چکی ہے۔ اس میں زیادہ تر مدحیہ عنصر غالب ہے۔ حروف تہجی کا استعمال کرکے لکھی گئی قمر کی یہ نظم ملاحظہ کیجئے:

گاف سے گلزار وحدت کا گل یکتا ہے تو — واو سے وحدت پرستی کیلئے آیا ہے تو
رے سے رہبر گمرہوں کا اے گورو بابا ہے تو — واو سے وصل خدا کا راستہ بتلاتا ہے تو
نون سے ہے نور پھیلا اک جہاں میں چار سو — ہے الف سے اس احد کا ذکر جاری کو بہ کو
نون سے ہے نامرادوں کی بر آئی آرزو — کاف سے ثابت ہے ذات نیک طینت نیک خو

بشیشور پرشاد منور لکھنوی نے دوارکا پرشاد افق لکھنوی کی لکھی ہوئی گرو گوبند سنگھ کی منظوم سوانح حیات کا تذکرہ بھی کیا ہے، جس میں سکھوں کے دسویں گرو گوبند سنگھ کے تاریخی واقعات قلمبند کئے گئے ہیں۔

خود منور لکھنوی نے گرو نانک اور گرو گوبند سنگھ کے علاوہ بھی سکھوں کے دیگر اکابرین

کی حیات اور سوانح عمری کو نظم کیا تھا، جو تاریخی واقعات اور تعریفی و توصیفی انداز بیان کا مرقع ہیں۔

اکابرین و مصلحین کی مدح سرائی کا عنصر تو اردو کے گویا خمیر ہی میں ہے۔ یہاں بلا تفریق مذہب و ملت نفوس قدسیہ کے قصیدے بھی لکھے گئے ہیں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نظیر اکبر آبادی (م ۱۸۳۰ء) نے شنکر اور کرشن جی کے ساتھ ہی گرو نانک کی بھی مدح کی ہے:

ہیں کہتے نانک شاہ جنہیں وہ پورے ہیں آگاہ گرو
وہ کامل رہبر جگ میں ہیں یوں روشن جیسے ماہ گرو
مقصود، مراد، امید سبھی بر لاتے ہیں دل خواہ گرو
نت لطف و کرم سے کرتے ہیں ہم لوگوں کا نرباہ گرو
اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو
سب سیس نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو واہ گرو ۸

نظیر نے اس نظم میں عظمت نانک کا اعتراف نہایت عقیدت سے کیا ہے۔ محبت و الفت اس نظم کے ہر شعر سے ٹپکتی ہے۔

علامہ اقبال (م ۱۹۳۸ء) جن کا تعلق سرزمین پنجاب سے رہا ہے، اپنے دل میں نانک کی عقیدت رکھتے ہیں۔ غالباً اردو کے یہ پہلے مسلم شاعر ہیں جنھوں نے گرو نانک کو ایک جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نور سے تشبیہ دی ہے۔ اقبال نے اس نظم میں یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ گوتم کے پیغام کے بعد ہندوستان میں وحدت کا نعرہ بلند کر کے خواب سے جگانے والا مرد کامل سرزمین پنجاب کا وہ شخص ہے جسے دنیا گرو نانک کہتی ہے۔ گرو نانک کی مدح و توصیف اقبال اس طرح کرتے ہیں:

بتکدہ پھر بعد مدت کے مگر روشن ہوا ۔۔۔ نور ابراہیم سے آزر کا گھر روشن ہوا
پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے ۔۔۔ ہند کو اک مرد کامل نے جگایا خواب سے ۹

اقبال کے بعض اشعار میں سکھ مذہب کے اثر کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ مثال کے لئے ان کے مجموعۂ کلام "بال جبریل" کی نظم "فرمان خدا (فرشتوں سے)" کا یہ شعر لیا جاسکتا

[redacted]

ہے ے

گر ناؤ غلاموں کا اہو سو لیقیں ہے

کنجشک فرمایہ کو شاہیں سے لڑادو تے

اس شعر میں گرو گوبند سنگھ نے اس قول کو منظوم کر دیا گیا ہے۔

چڑیوں سے میں باز لڑاؤں

سوا لاکھ سے ایک لڑاؤں

تبھے گوبند سنگھ نام کہاؤں

خواجہ دل محمد نے گرو نانک کی مدح سرائی میں "واہ گرو" کے عنوان سے ایک نظم لائل گزٹ لاہور کے "بیتی نمبر" میں شائع کروائی تھی۔ اس نظم کا ٹیپ کا مصرع منیر اکبر آبادی کی مجولہ بالا نظم سے لیا گیا ہے۔ نظم کے ہر بند میں اسی کی تکرار سے عظمت و شان پیدا کر دی گئی ہے۔

تلوک چند محروم (م: ۱۹۶۶ء) نے اپنی ایک نظم میں منر شہنشاہ بابر اور گرو نانک دیو کا مکالمہ قلمبند کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بابر: ہماری بزم عشرت میں جو لے آیا ہو بابا	تو بسم اللہ! جام بادۂ احمر چڑھا بابا
جہاں میں آب زر سے کو نسا ہے پاک زیادہ	کہ ڈھل جاتا ہو جس سے دفتر اوشہا یا با
گرو نانک: مبارک ہو مئے احمر تجھے صاحبقراں تیری	رکھے بس سرخ رو تجھکو شراب ارغواں تیری
وہ مئے اپنی ہے جس سے بن پئے مخمور رہتے ہیں	خیال چشم ساقی کے نشے میں چور رہتے ہیں

— — — — — — —

مناسب ہے یہی ترک مئے انگور کر دینا	ہمارے جام سے تھوڑی سی اب منظور کر دینا!

دور حاضر کے کہنہ مشق شاعر بہاری منظمی نے گرو نانک کی منظوم سوانح "ندر نانک" کے نام سے لکھی ہے۔ روایات کے ساتھ ہی شاعر نے تاریخ سے بھی استنباط کیا ہے، جس کی وجہ سے "ندر نانک" ایک طرح سے تاریخی دستاویز بن گئی ہے۔ "طلوع مہر" کے عنوان سے شاعر نے نانک کی ولادت کا یوں بیان کیا ہے:

ترپتا دیوی کے شکم سے راہبر پیدا ہوا　　رات کے پچھلے پہر مہر سحر پیدا ہوا

سادھوؤں نے یوں نہ دیکھی تلونڈی پہ بارش نور کی　　جیسے لو بھڑکی ہو چراغ طور کی

منعکس تھا وہ منی صورت میں جلوہ طور کا　　چودھویں کے چاند پر ہالا ہو جیسے نور کا

خاک تلونڈی پہ اتری روشنی آکاش سے　　جگمگا اٹھا اندھیرا رات کے پرکاش سے

مہر عرفاں کی ضیا چشم بصیرت تک گئی　　ست کے سورج کی کرن کیلاش پربت تک گئی ۱۱

عطا کاکوروی "گرو نانک" کی یاد یوں کرتے ہیں:

یہ وہ ہیں جن کی دلوں پہ ہے حکومت باقی　　پانسو سال گذرنے پہ ہے عظمت باقی

یہ وہ سورج ہیں کہ ابتک ہے تمازت باقی　　یہ ہیں وہ پھول کہ گلشن میں ہے نکہت باقی

عزم زندہ ہے، عمل زندہ ہے، ہے دل زندہ　　زندہ ہے شمع ہدایت کی ہے محفل زندہ ۱۲

سکھ مذہب کے ان نفوس قدسیہ کی مدح سرائی کرنے والے اردو کے کئی معروف و غیر معروف شعراء کی فہرست مرتب کی جا سکتی ہے جنھوں نے نہایت اکرام و احترام و والہانہ عقیدت سے ان اکابرین کی عظمت کے گیت گائے ہیں۔

ان نظموں میں عقیدت کا ایک دریا ہے کہ بڑھا چلا آتا ہے، جو تعصبیت کے خس و خاشاک کو اپنے ساتھ بہا لے جاتا ہے اور گلشن اتحاد کے لئے زمین ہموار کرتا ہے۔ راز سنتوکھ سری کی نظم "شری گرو گوبند سنگھ" کے اشعار میں اسی عقیدت کے پھول کھلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، جن کی مہک سے ایک جہان معطر ہوا جاتا ہے:

اے گرو گوبند سنگھ، اے رونق پیغمبراں
فخر موجودات عالم، نازش کرّوبیاں
باغ دنیا تیری آمد سے بنا رشک جناں
رفعت ارضی بنی، حسرت درائے آسماں
ساقیٔ خمخانۂ عرفانیت تھی تیری ذات
جنگ جوئی میں بھی عالی مرتبت تھی تیری ذات

اے سراپا مہر و الفت، منبع صدق و صفا
امتیاز رنگ و نسل و ذات سے نا آشنا
تیری نظروں میں نہیں تھا کوئی چھوٹا اور بڑا
مرحبا! "سنگت" کو اپنے سے بھی اونچا کر دیا
تھا ترا جمہوریت کی راہ پر یہ سنگ میل
کارنامہ ہے ترا یہ بے نظیر و بے عدیل [۱۴]

عقیدت سے لبریز اس طرح کی کئی نظمیں اردو کے دامن کو سجا رہی ہیں۔ یہ گل ہائے رنگارنگ جن کی مہک بھی جدا جدا ہے، اردو کے گلدستۂ شاعری کی خوبصورتی بڑھا رہے ہیں۔

ماخذ

۱؎ خواجہ دل محمد (مترجم): "جپ جی صاحب" امرتسر ۱۹۴۵ء ص ۶۹
۲؎ ایضاً "سکھمنی صاحب" امرتسر ۱۹۴۵ء ص ۱۹۳
۳؎ بسمل دہلوی "سکھمنی صاحب" دہلی ۱۹۵۷ء ص ۳۱
۴؎ خواجہ دل محمد سکھمنی صاحب امرتسر ۱۹۴۵ء ص ۸۲
۵؎ مکتوب قیس بنام راقم الحروف مورخہ ۲۷ اپریل ۱۹۸۲ء
۶؎ مشرقی "جپ جی صاحب مشرح" تاریخ ندارد ص ۱۰-۱۱
۷؎ پنڈی داس قمر "گرو نانک درشن" راولپنڈی ۱۹۲۴ء ص ۱۵
۸؎ نظیر اکبر آبادی (بحوالہ) اردو شاعری میں قومی یکجہتی کی روایت — ص ۹
۹؎ علامہ اقبال کلیاتِ اقبال (بانگ درا — نانک) دہلی تاریخ ندارد ص ۱۸۱
۱۰؎ ایضاً (بال جبریل۔ فرمانِ خدا (فرشتوں) تاریخ ندارد ص ۶
۱۱؎ تلوک چند محروم "گنجِ معانی" — دہلی ۱۹۵۷ء ص ۳۷
۱۲؎ مہدی نظمی "نذر نانک" غازی آباد بلا مورخہ ص ۷۵
۱۳؎ عطا کاکوروی "کاروانِ خیال" (گرو نانک کی یاد) پٹنہ ۱۹۷۷ء ص ۲۱
۱۴؎ راز سنتوکھ سری "شری گرو گوبند سنگھ" مشمولہ "پاسبان" چنڈی گڑھ اکتوبر ۱۹۸۰ء

مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم)

تعلیم نسواں

ہماری قوم میں کیونکر ہو سکتی ہے

تعلیم نسواں کے متعلق رام پور کانفرنس میں جو رزولوشن پیش ہوا اور جس پر نواب عماد الملک نے نہایت مدلل تقریر کی، یہ اسی کا اثر ہے کہ آج کل قوم کو اس ضروری مسئلے کی طرف زیادہ توجہ ہو گئی ہے اور اصول مدلہ کی طرح مسٹر امیر علی کے ہم زبان ہو کر یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ قوم کا سنورنا بگڑنا تعلیم نسواں کے ہونے نہ ہونے پر موقوف ہے۔ بے شک یہ توجہ ہماری مستقبل ترقیوں کی بنیاد ہے اور ثابت کرتی ہے کہ قوم کو اب اپنی ضرورتوں کا احساس ہو گیا ہے۔ یہی وہ بات ہے جو قومی زندگی کا اصلی عنصر ہے اور یہی وہ راز ہے جس سے قومیں گرتے گرتے سنبھل جاتی ہیں۔ لیکن باوجود اس کے اس توجہ کو عملاً وجود میں لانے کے لئے آج تک جو کوشش کی گئی ہے۔ اگر بزرگان قوم ہماری گستاخی کو معاف کریں تو ہم نہایت زور کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ کوشش صرف فضول ہی نہیں بلکہ ایک حد تک قوم کے لئے مضر بھی ہے۔ اور اگرچہ اس کا اس وقت احساس نہ ہو لیکن عمل کے بعد بیشک محسوس ہو گا۔ اس لئے مناسب ہے کہ ابھی سے سوچ سمجھ لیا جائے۔

تعلیم نسواں کے متعلق اس وقت تک جتنی رائیں شائع ہوئی ہیں ان کا ماحصل یہ ہے۔ پرائیویٹ مکاتب جاری کئے جائیں یا ہر خاندان کے لئے علاحدہ علاحدہ مکاتب بنا دیئے جہاں اس خاندان کی لڑکیاں تعلیم حاصل کریں۔ مسٹر مارلیسن بھی اسی کے قریب قریب رہتے ہیں۔ مسٹر شوکت علی کی رائے ہے کہ ایک مدرسہ قائم کر کے پہلے استانیوں کو

تعلیم دی جائے جو اوسط درجے کی تنخواہ پر گھروں میں جا کر پڑھائیں۔ ہم ان تمام ساعیوں کو نہایت افسوس کے ساتھ دیکھتے اور ہندوستان کے بیکس فرقۂ نسواں کی بدبختی پر روتے ہیں کہ ان کی تعلیم کی طرف اگر قوم کی توجہ بھی ہوتی ہے تو اس کا عملی نتیجہ ہونے نہ ہونے کے برابر نظر آتا ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ یہ سب کچھ سہی لیکن اس قسم کی تعلیم سے عورتوں کو کونسا فائدہ حاصل ہوگا؟ اس تعلیم سے جس قدر لیاقت عورتوں کو حاصل ہوگی اس سے بدرجہا اچھی لیاقت قدیم خاندانوں کی خواتین میں موجود ہے۔ خود ہمارے خاندان میں ہر لڑکی کے لئے اردو فارسی اور دینیات کا پڑھنا لازمی امر ہے۔ لیکن نہ اس سے وہ فائدہ حاصل ہوتا ہے جس کی ضرورت ہے نہ ان کے دماغ روشن ہوتے ہیں، نہ ان کی اولاد پر اچھا اثر پڑتا ہے، نہ وہ تعلیم یافتہ شوہر پر اثر ڈال سکتی ہیں اور نہ وہ اس کے دست و بازو ہو سکتی ہیں بلکہ اس ادھوری تعلیم سے ان میں آزادی کا خیال (جو ہر انسان میں فطرتاً موجود ہے اور جسے ہندوستانی خارجی اثرات سے دبا دیا گیا ہے) پیدا ہو جاتا ہے اور پھر جب سوسائٹی میں جائز آزادی کی کوئی صورت نہیں ملتی تو وہ ناجائز طریقے سے آزادی چاہتی ہیں اور ایسے واقعات ہو جاتے ہیں جن کو تعلیم نسواں کے مخالف تعلیم کا نتیجہ بتاتے ہیں۔ حالانکہ اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ ان کو ادھوری تعلیم دی جاتی ہے اور غلامی سے نجات نہیں ملتی۔ بلبل کو باغ کی بہار کی ایک جھلک دکھلا کے پھر پنجرے میں مقید کر دینا ٹھیک ایک عورت کو تعلیم دے کر اس آزادی سے جو فطرت نے عطا کی ہے مستفیض نہ کرنا ہے۔

ہم صاف صاف کہہ دیتے ہیں کہ اور اسے فیصلہ قطعی سمجھ لو، اصول مسلمہ کی طرح مان لو کہ جب تک متعارف پردہ ہندوستان سے نہ اٹھے گا، جب تک عورتوں کو جائز آزادی اور وہ آزادی جس کا اسلام مجوز ہے نہ دی جائے گی غلامی میں رکھ کر اور پردے کی قید کے ساتھ تعلیم دینی نہ صرف فضول بلکہ مضر اور اشد مضر ہے۔ اس کی ایک نہیں بیسیوں مثالیں مل جائیں گی کہ اس قسم کی تعلیم برے نتیجے پیدا کرتی ہے یا کم از کم ایسی تعلیم سے کوئی مفید نتیجہ نہیں نکلتا۔

انسان فطرتاً آزاد ہے۔ یہ آزادی اس کے ہر غیر ارادی افعال [illegible]

ہوتی ہے۔ اگرچہ زمانہ قدیم میں اس آزادی کے سمجھنے میں بڑی غلطیاں ہوئیں اور انسان کی آزادی میں استثنار کی گنجائش رکھی گئی۔ اس خیال نے غلامی کی ناپاک رسم پیدا کی۔ یورپ ایک مدت تک اس میں مبتلا رہا لیکن جب علم کی روشنی تمام جاہلانہ تاریکیوں پر غالب آئی تو انسان کی فطری آزادی ظاہر ہوئی اور تمام یورپ کی فلاسفروں نے انسان کو بلا استثنا آزاد تسلیم کرلیا۔ مگر ہندوستان کی زمین نے جس کے تخت سلطنت پر کبھی غلام بھی بادشاہت کرچکے ہیں ایسی آزادی کو ضائع کردیا۔ عورتوں کو حبشی غلاموں سے تشبیہ کے لائق بنا دیا اور آزادی مردوں کے لئے مخصوص کردی۔ (اگرچہ ہندوستان کے مرد بھی غیر قوم سے آزاد نہیں ہیں) کیا موجودہ روشن عہد میں کیا جدید ہندوستان میں پھر اس غلامی کو قائم رکھنا چاہتے ہو؟ عورتوں کی غلامی ایک جاہلانہ کام ہے۔ کیا جہالت اور ظلم کو جمع کرنا چاہتے ہو؟ عورتیں غلام بھی بنی رہیں اور جاہل بھی ہو جائیں! جب تک عورتوں کو آزادی نہ دی جائے گی کبھی تعلیم مفید نہیں ہو سکتی اور نہ عام طور سے تعلیم شائع ہو سکتی ہے۔

بعض حضرات ہمارے اس بیان کے جواب میں فرماتے ہیں کہ جب ہندوستانی عورتوں کو آزادی دینا پسند نہیں کرتے تو بدرجہ اولیٰ کیا انہیں تعلیم سے بھی محروم رکھا جائے؟ لیکن ہم نہیں سمجھتے کہ یہ جواب کس بنا پر دیا جاتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ وہ آزادی دینا پسند نہیں کرتے لیکن جب قوم میں اصلاح کرنی ہمارا کام ہے تو ہم اپنی اصلاحوں پر قوم کو لائیں گے یا خود ان کی جاہلانہ رائے پر چلیں گے۔

ہمیں زمانہ ماضی نہیں بھولنا چاہیئے جب قوم انگریزی تعلیم کو پسند نہیں کرتی تھی انگریزی پڑھنے والوں کے لئے "فقد کفر" اور انگریزی لباس پہننے والوں کے لئے "من تشبہ بقوم فہو منہم" کے بھرے ہوئے طمنچے تیار رکھے۔ کیا ہمیں قوم ہی کی رائے پر چل کر محمڈن کالج کے مدرسہ عربیہ تیار کرنا تھا؟ اور بورڈرز ٹوپیس بجائے ترکی کے عربی قائم کرنا؟ کیا سرسید کو سمجھنا تھا کہ جب قوم انگریزی پر راضی نہیں ہوتی تو بدرجہ اولیٰ عربی سے محروم رکھا جائے؟ لیکن ہم تمام معاملہ اس کے برعکس دیکھتے ہیں۔ انگریزی کا پڑھنا مسلمانوں کے لیے سنت ثانیہ ہو رہا ہے اور انگریزی لباس ہر انیسویں صدی کے نوجوانوں کے لئے لازمی

ہے۔ اس وقت اگر قوم حریتِ نسواں پر راضی نہیں ہوتی تو کچھ دنوں میں ہماری کوششوں سے راضی ہو جائے گی۔ ہمارا قوم کی جہالت پر راضی ہو جانا اور پردے کے ساتھ تعلیم دینا یہ معنی رکھتا ہے کہ ہم قوا کو پردے کا اور عادی بنا رہے ہیں اور اس لئے اب ہمیں کبھی عورتوں کی آزادی کا خواب نظر نہیں آسکتا۔

اگر ہمیں تعلیم نسواں کی واقعی ضرورت ہے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ تعلیم یافتہ نسل بلا تعلیم یافتہ ماؤں کے نہیں پیدا ہو سکتی، اگر یہ ٹھیک ہے کہ مردوں کا نیک ہونا عورتوں کے نیک ہونے پر موقوف ہے تو پہلے اس کی کوشش کرو کہ یہ پردہ جو ہماری ترقی کا ایک بڑا مانع ہے یہ عورتوں کی غلامی جس نے ہماری عورتوں کو کسی علمی ترقی کے لائق نہیں رکھا ہے جس سے ان کے دماغ ان کے قوی بالکل خراب ہو گئے ہیں اٹھا دیا جاوے اور وہ پردہ قائم کیا جائے جس کا اصلی جوہر حسن اخلاق ہے جو عورت کی عصمت کی ایسی حفاظت کرتا ہے جسے مضبوط سے مضبوط ہاتھ اور بڑے سے بڑا وسوسہ متزلزل نہیں کر سکتا اس کے بعد تعلیم کے زیور سے عورتوں کو آراستہ کرو اور ان میں اس کی استعداد پیدا کرو کہ وہ اپنی اولاد کی خود عمدہ تربیت کر سکیں۔ بچپن ہی سے ان میں عمدہ اخلاق پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ اس کوشش کے بعد جو نسل ہندوستان میں نظر آئے گی وہ بیشک کامل طور سے تعلیم یافتہ قوم کے لئے باعث فخر اور ملک کے لئے باعث شرف ہوگی۔ ورنہ اس قسم کی تعلیم سے جس کی ابھی کوشش کی جا رہی ہے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا، سوا اس کے کہ کوشش میں ہمارا وقت ضائع ہو اور عمل کے بعد افسوس ہو۔ وما علینا الا البلاغ۔

(علی گڑھ منتھلی، جلد ۱، نمبر ۱۱، نومبر ۱۹۰۳ء)

سہ ماہی اسلام اور عصر جدید کا خصوصی شمارہ

یہ رسالہ ۱۹۶۹ء سے پابندی کے ساتھ نکل رہا ہے۔ اپریل ۸۶ء کا شمارہ جو کہ خاص نمبر ہے شائع ہو چکا ہے، اس میں فقہ اسلامی، ملی تشخص، پرسنل لا جیسے موضوعات پر ممتاز علماء، مفکرین اور دانشوروں کے جو مضامین شامل ہیں وہ اس طرح ہیں:

'ایسی بلندی، ایسی پستی' (پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی) 'فقہ اسلامی کی روح خوابیدہ — علامہ اقبال کا زاویۂ نگاہ' (مفتی محمد رضا انصاری)، 'مذہب، اخلاق اور قانون' (مولانا منت اللہ رحمانی)، 'سید رشید رضا مصری کا نظریۂ اجتہاد' (الاستاذ صلاح الدین المنجد)، "تدوین فقہ کی تاریخ اور موجودہ حالات کا جائزہ' (مولانا محمد تقی امینی)، 'اسلام اور اسلامی ملکوں میں سماجی انصاف کا تصور' (ڈاکٹر رشید احمد جالندھری)، 'مسلم پرسنل لا' (ڈاکٹر سید عابد حسین مرحوم)، 'مسلمانوں کا ملی تشخص' (پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی)، 'ملی تشخص کے تحفظ کا مسئلہ' (مولانا محمد تقی امینی)، 'ملی تشخص کا مسئلہ اور دستور ہند' (پروفیسر طاہر محمود)، 'مسلمانوں کے ملی تشخص کا مسئلہ' (پروفیسر مشیر الحق)، 'مسلمانوں کے ملی تشخص کا مسئلہ' (مولانا ابوالعرفان ندوی)۔

ان مضامین کے علاوہ مولانا شاہ نعیم عطا سلونی (مرحوم) کا ایک غیر مطبوعہ رسالہ 'النجم الناجدہ فی ان الطلقات الثلث واحدہ' بھی اس میں شامل ہے۔

اس خاص نمبر کی قیمت دس روپے ہے۔

اس رسالے کی تعداد محدود ہے اس لئے ارباب ذوق فوری توجہ فرمائیں

ملنے کا پتہ: ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز
جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

سالانہ قیمت ۱۵ روپے

جامعہ

قیمت فی شمارہ ڈیڑھ روپے

جلد ۸۳ بابت ماہ جون ۱۹۸۶ء شمارہ ۶

فہرست مضامین

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

مدیر معاون

عبداللطیف اعظمی

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی۔ مطبوعہ: جمال پریس دہلی۶۔ ٹائیٹل: فائن پریس دہلی

شذرات

اپریل ۸۶ء کے دوسرے ہفتے میں سیمون دی بُوا جو مالرو، موریک، کامیو، اراگاں، ژاں جینی اور سارتر جیسے اہلِ قلم کے مشہور حلقے سے تعلق رکھتی تھی، اس دنیا سے رخصت ہو گئی اور اس کی وفات سے اس دور کا بھی خاتمہ ہو گیا جس میں فرانس نے واقعی بڑے ادیب اور دانشور پیدا کئے۔ سیمون دی بُوا اور سارتر کی دوستی نے اِس دور میں ایک افسانوی حیثیت اختیار کر لی تھی، وہ ۱۹۰۸ء میں ایک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوئی تھی، اور ۲۱ برس کی عمر میں جب وہ سوربون یونیورسٹی میں فلسفے کی تعلیم حاصل کر رہی تھی، اس کی پہلی ملاقات سارتر سے ہوئی تھی جو عمر میں اس سے تین سال بڑا تھا اور سوربون ہی میں فلسفے کا طالب علم تھا۔ بعد میں اس نے لکھا کہ "جب ہم اگست کے شروع میں ایک دوسرے سے جدا ہوئے تو میں جانتی تھی کہ وہ میری زندگی سے اب کبھی جدا نہ ہو گا۔"

۱۹۴۹ء میں جب سیمون دی بُوا کی کتاب دی سکنڈ سیکس شائع ہوئی تو لوگوں نے اُسے ژاں پال سارتر کے ساتھیوں میں شمار کیا اور اس نے خود بھی اپنے آپ کو ایسا ہی سمجھا۔ اس نے کہا ہے کہ "دوسری جنگ عظیم کے بعد جب وجودیت

کی تحریک نے زور پکڑا اور لوگوں کی زندگیوں میں اس کے اثر سے حیرت انگیز تبدیلیاں نظر آئیں تو، حالانکہ میرا ادبی سرمایہ بے حقیقت تھا، میرا نام سارتر کے ساتھ لیا جانے لگا جو ادبی دنیا میں یکایک مقبول ومشہور ہو کر لوگوں سے خراج تحسین وصول کر رہا تھا۔" اُس وقت وہ یقیناً حیرت زدہ رہ جاتی اگر اس سے کہا جاتا کہ اس کی وفات کے وقت لوگ یہ کہیں گے کہ سارتر کی کسی تصنیف کا اثر اتنا نہیں ہوا جتنا کہ اس کتاب کا۔ لندن آبزرور کے کالم نویس رابن اسمتھ نے لکھا ہے کہ پیرس کے مشہور اخبار لبریشن نے اس اعتبار سے اُسے مشہور ماہر معاشیات کینز کا ہم پلہ قرار دیا ہے کہ دونوں نے اپنے وقت کے اُن لوگوں کے مذاق اور رجحانات کو متاثر کیا جن میں سے اکثر یہ نہیں جانتے تھے کہ جن کا اثر ان پر پڑ رہا ہے وہ کون ہیں۔

معلوم نہیں کہ آنے والی نسلیں سیمون دی بُوا کو یہ مرتبہ دیں گی یا نہیں، لیکن اتنا تو ضرور ہے کہ سارتر کے ساتھ غیر رسمی 'رفیقہ حیات' کی حیثیت سے اس کی پچاس سالہ زندگی اور ادبی اور سیاسی معرکوں میں ان دونوں کی اسی قدر طویل رفاقت بیسویں صدی کی ادبی دنیا کا ایک نہایت ہی اہم واقعہ متصوّر ہوگا۔ سیمون کی خود نوشت سوانح حیات میں جو چار جلدوں میں ہے، اس رفاقت کی داستان بڑی دلچسپ ہے، ساتھ ہی یہ برسوں پر پھیلی عالمی سیاست، انسانوں کے افکار و عزائم، آرزوؤں اور امنگوں، دانشوری اور اس کے مطالبوں اور تقاضوں کی داستان بھی ہے۔ سارتر اور سیمون نے بہت سے اچھے مقاصد کے لئے جدوجہد کی، ان میں سے ایک الجیریا کی آزادی کا اعلا نصب العین بھی تھا۔ انھوں نے بڑے پکے عزم کے ساتھ مسلسل اپنی حکومت کی مخالفت کی، اور قلم اور زبان سے الجیریا کے مجاہدوں کے حق میں اپنی قوم کے سامراجیوں کے خلاف اس وقت تک محاذ قائم رکھا جب تک کہ الجیریا آزاد نہ ہو گیا۔ ان دونوں کو نئے عہد کے نوجوانوں سے بڑی امیدیں تھیں، دونوں

انہیں انقلابی دیکھنا چاہتے تھے، دونوں یہ چاہتے تھے کہ نوجوان کسی لبرل تحریک یا مقصد کے جال میں نہ پھنسیں، لیکن اس میں انہیں ناکامی ہوئی، یہ اُن کے افکار کا المیہ تھا۔ اِن دونوں ادیبوں کا تعلق بائیں بازو سے رہا لیکن دونوں ہی آخر میں اشتراکیت سے مایوس ہو گئے۔ ستر برس کی عمر میں جب سیمون دی بُووا تیسری دنیا اور آہنی پردے کے پیچھے کی دنیا کے بیشتر ملکوں کی سیاحت کر چکی تھی، اس نے ایک صحافی سے کہا تھا: "سوشلزم ایک خواب ہے۔ اس کا کہیں وجود نہیں۔ آج جن ملکوں کو ہم سوشلسٹ کہتے ہیں، وہ دور دور تک بھی سوشلسٹ نہیں" یہ بیان درحقیقت مبالغہ آمیز اور دی بُووا کی عینیت کی شکست کی آواز ہے۔

سیمون نے فلسفے کی تعلیم حاصل کی تھی لیکن فلسفیانہ موضوعات پر اس نے جو کچھ لکھا تھا، اُسے وہ کمتر درجے کی چیز سمجھتی تھی۔ اس نے ناول بھی لکھے جو خاصے مقبول ہوئے تھے۔ لیکن اُسے زندہ رکھیں گی تین چیزیں، ایک سارتر سے اس کا تعلق، دوسرے اس کی خود نوشت سوانح اور تیسرے اس کی کتاب دی سکنڈ سیکس۔ آخر الذکر تو دوسری جنگ عظیم کے بعد کے عالم نسواں کا عہد نامۂ جدید ثابت ہوئی ہے اپنی زندگی کے آخری برسوں میں اس نے حقوقِ نسواں کی تحریک کو بہت بڑھاوا دیا، اس طرح شروع سے آخر تک بنیادی طور پر اس کا قلم، اس کی سخاوت، اس کا صبر اور اس کی توجہ حقوقِ نسواں کے لیے وقف رہی۔ پچھلے کئی برس سے وہ پیرس میں ایک سادہ سے اپارٹمنٹ میں رہتی تھی۔ بس ایک بڑا کمرہ، یہی اس کا مکان تھا، سکریٹری وغیرہ کچھ نہیں، فون پر اس سے آسانی سے بات ہو سکتی تھی اس لئے کہ اس کا زیادہ وقت اپارٹمنٹ ہی میں گزرتا تھا۔ اس کی ایک امریکی عقیدت مند خاتون نے لکھا ہے کہ "جب میں نے انہیں دیکھا تو محسوس ہوا کہ کوئی اصلی چیز دیکھ رہی ہوں ___ یہاں میں نے فرانس ہی کا نہیں بلکہ مغرب کا ضمیر دیکھا، حقوقِ نسواں کی علمبردار اور انسان دوست، دی بُووا کے یہاں یہ دونوں چیزیں ایک ہی تھیں۔"

ہماری اپنی معاشرتی اور اخلاقی اقدار کے لحاظ سے دیکھا جائے تو سارتر، کامیو، کوئسلر اور سیمون وغیرہ کی زندگی برباد زندگی تھی، لیکن ہمیں ان کے اپنے اخلاقی معیار سے دیکھنا چاہیئے خاص طور پر اُس معیار سے جو دوسری جنگِ عظیم کی لائی ہوئی تباہی اور انتشار سے بہت زیادہ متاثر تھا، اِن مصنفوں کی اکثر تحریریں اس انتشار کی آئینہ دار ہیں۔ ان کے باہمی تعلقات کا معیار بھی یہی بکھری ہوئی اخلاقی قدریں تھیں، اور اسی لئے کبھی کبھی ان کے جھگڑوں کی سنسنی خیز خبریں وقت کا اہم موضوعِ گفتگو بن جاتی تھیں۔ سیمون ڈی بُوا نے بیان کیا ہے کہ مے نوشی کی ایک ہنگامہ خیز صحبت میں کوئسلر نے اسکوچ کا ایک پیالہ سارتر کے سر پر دے مارا کیونکہ سارتر اس کی بیوی سے فلرٹ کر رہا تھا۔ یہ تھا وقت کے ایک وجودی فلسفی کا طرزِ زندگی۔ سیمون کے دل میں سارتر کے لئے بڑی جگہ تھی، لیکن کہیں اس تعلق میں ایسی کمی ضرور تھی کہ اُس کے جذبات و احساسات کی پوری تسلی نہیں ہو پاتی تھی، اور شاید اسی بات نے سیمون کو حقوقِ نسواں کا علمبردار بنا دیا تھا۔ ایک موقع پر اس نے لکھا ہے کہ "میں اس دنیا میں رہنے کی عادی ہو چکی ہوں جہاں مرد جیسے کہ وہ ہوتے ہیں، ہیں ——— ظالم۔"

سیمون ڈی بُوا کو ہمیشہ بڑھاپے اور موت کا خوف لگا رہا۔ سارتر تو بڑی آسانی سے یہ کہہ کر خوش رہ سکتا تھا کہ وجود سے متعلق اس کا اضطراب محض ایک فلسفیانہ خود آرائی ہے، لیکن ڈی بُوا کا اضطراب حقیقی تھا، اس نے اپنی خود نوشت سوانح کی تیسری جلد میں جب وہ اپنی ادھیڑ عمر کے آخری مرحلے میں تھی، ایک جگہ بیان کیا ہے کہ وہ کیوں اور کیسے یہ محسوس کرتی ہے کہ زندگی نے اسے دھوکہ دیا ہے۔ بہرحال سارتر کی وفات سے ایک برس پہلے وہ شاید قدرے مطمئن ہو گئی تھی، اس نے کہیں لکھا تھا کہ "میری زندگی کی مسرتوں اور مایوسیوں کے نشیب و فراز میں کسی حد تک ہمواری آ گئی ہے۔ میں اس خدا کی شناکی نہیں جس پر میرا ایمان نہیں، اور نہ ہی مجھے اپنے جسم کے خلیوں سے کوئی گلہ ہے جو ویسے ہی ہیں جو میری عمر کے سبھی لوگوں میں ہوتے ہیں۔"

محمد بدیع الزماں

صاحبِ لولاکؐ

بالِ جبریل کے درج ذیل دو اشعار کا تجزیہ قرآن اور حدیث کی روشنی میں اس مضمون میں کیا جا رہا ہے:۔

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے! (غزل ۱۰)

جہاں تمام ہے میراث، مردِ مومن کی
میرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ لولاک! (غزل ۴۶)

دونوں اشعار ہم معنی ہیں۔ دونوں کے پہلے مصرعوں میں اقبال نے یہ تلقین کرائی ہے کہ یہ عالم، یہ جہاں جس پر ہم بستے ہیں صرف "مومن جانباز" اور "مردِ مومن" کی میراث ہے۔ مگر مومن کہلائے جانے کی شرط انھوں نے پہلے شعر کے دوسرے مصرعہ میں "صاحبِ لولاک" ہونے کی لگا دی ہے اور دوسرے شعر کے دوسرے مصرعہ میں اپنے سارے کلام کو صرف "نکتۂ لولاک" کی حجت بتایا ہے۔

جناب محمد بدیع الزماں صاحب، ہارون نگر کالونی۔ فرسٹ سیکٹر، پھلواری شریف پٹنہ۔ ۸۰۱۵۰۵

ان دونوں اشعار کو اس مضمون کا موضوع بنائے جانے کے دو وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ اقبال کے اردو کلام کے سب سے مشہور شارح پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے ان دونوں اشعار کے پہلے مصرعوں کو قرآن کی ایک ایسی آیت کی تلمیح بتایا ہے جسے اگر سیاق و سباق کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کا اطلاق ان مصرعوں پر نہیں ہوتا بلکہ ان مصرعوں کا اطلاق دوسری آیات پر ہوتا ہے جس کا ذکر اس مضمون کے پہلے حصہ میں آئیگا۔ سیاق و سباق کے ساتھ نہ پڑھے جانے پر یہ غلط فہمی عام طور پر مسلمانوں کو ہوتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہم ان اشعار کا تجزیہ قرآن اور احادیث کی روشنی میں کر سکیں اور خاص کر اس نکتہ کا کہ "مومن" کہلائے جانے کے لئے "صاحب لولاک" ہونا اقبال نے کیوں لازمی قرار دیا ہے۔

اقبال کی شاید ہی کوئی ایسی اصطلاح ہو جس کا قرآنی جواز نہ ہو۔ ایسی ہی اصطلاح "مومن" بھی ہے — یہ اشعار ہماری گرفت میں آسکیں۔ اسکے لئے ضروری ہے کہ ہم اس اصطلاح کو قرآن اور حدیث کی روشنی میں ذہن نشیں کرلیں کیونکہ جب اقبال کسی اصطلاح کا ذکر کرتے ہیں تو ان کے ذہن میں ایسی اصطلاحات کا رشتہ اُس معیار انسانیت سے ہوتا ہے جو رسول اکرمؐ کی ذات گرامی سے منسوب ہے۔ انہوں نے اپنے اردو کلام میں لفظ "مسلمان" بہت کم استعمال کیا ہے اور اگر کیا ہے تو زیادہ تر بانگ درا کے دور میں۔ اِس لئے کہ اُس دور تک اُن کے افکار اُتنے پختہ نہ تھے جو بعد میں بال جبریل اور ضرب کلیم میں شعلہ بن کر سامنے آئے۔

قرآن مجید میں بھی "مسلمان" اور "مومن" کے فرق کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ صرف کلمہ طیبہ پڑھ لینے سے ایک انسان اصطلاحاً مسلمان کہے جانے کا مستحق ضرور ہو جاتا ہے لیکن "مومن" کہلائے جانے کے لئے ایمان کا اُس کے دل میں داخل ہونا ضروری ہے۔ اسی لئے قرآن میں ہر جگہ "مومن" کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے کیونکہ یہ مسلّم ہے کہ قرآن میں جتنے احکامات یا ارشادات ہیں وہ صرف ایمان لانیوالوں

(مومنین) کے لئے ہیں۔ اس باریک سے فرق کو قرآن کی سورۃ الحجرات، ۴۹۔ رکوع ۲
میں اس طرح واضح کیا گیا ہے:-

"یہ بدوی کہتے ہیں کہ "ہم ایمان لے آئے" (قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا)۔
ان سے کہو، تم ایمان نہیں لائے (قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا)۔ بلکہ یوں کہو کہ "ہم
مطیع ہو گئے" (وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا)۔ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں
داخل نہیں ہوا ہے۔ (وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ)۔ اگر تم اللہ اور
اس کے رسولؐ کی فرمانبرداری اختیار کرلو تو وہ تمہارے اعمال کے اجر
میں کوئی کمی نہ کرے گا۔ یقیناً اللہ بڑا درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔
حقیقت میں تو مومن وہ ہے جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے
ہیں۔ (اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ) پھر انہوں
نے کوئی شک نہ کیا اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد
کیا۔ وہی سچے لوگ ہیں۔ (اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ)۔
"اے نبیؐ، ان (مدعیان ایمان) سے کہو، کیا تم اللہ کو اپنے دین کی اطلاع
دے رہے ہو؟ حالانکہ اللہ زمین اور آسمان کی ہر چیز کو جانتا ہے اور ہر چیز
کا علم رکھتا ہے۔ یہ لوگ تم پر احسان جتاتے ہیں کہ انہوں نے اسلام قبول
کرلیا۔ ان سے کہو اپنے اسلام کا احسان مجھ پر نہ رکھو۔ بلکہ اللہ تم پر اپنا
احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت دی اگر تم واقعی اپنے
دعوائے ایمان میں سچے ہو۔"

ان آیات کے پیشِ نظر صرف کلمہ طیبہ پڑھ لینا "اللہ کو اپنے دین کی اطلاع دینا"
قرار پایا جس کا یہ مطلب نہیں کہ "ایمان" بھی اس کے "دل" میں داخل ہو چکا ہے۔ ان
آیات کی رو سے ایمان "دل" میں تب داخل ہوتا ہے جب وہ اللہ اور اس کے
رسولؐ کی فرمانبرداری اختیار کرے اور اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لا چکنے کا
تقاضہ یہ ہو کہ:-

"پھر انہوں نے کوئی شک نہ کیا اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔"

حدیث قدسی ہے:۔

"مومن وہ ہے جس کے اوپر لوگ اپنی جان اور مال کے سلسلہ میں اعتماد کریں اور مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں اور مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے (اللہ کی اطاعت میں) اور مہاجر وہ ہے جو خطاؤں اور گناہوں کو چھوڑ دے۔"

اقبالؔ نے مندرجہ بالا آیات، جن میں "ایمان" کے "دل" میں اترنے کی باتیں کہی گئی ہیں، ان اشعار میں ترجمانی کی ہے:۔

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں (ضربِ کلیم "تصوف")

تو عرب ہو یا عجم ہو ترا لا الٰہ الا !
لغتِ غریب جب تک ترا دل نہ دے گواہی (بالِ جبریل۔ غزل ۲۲)

رہے گا تو ہی جہاں میں یگانہ و یکتا (ضربِ کلیم۔ "محراب
اتر گیا جو ترے دل میں لاشریک لہٗ ! گل افغان کے افکار ۲۰")

ان ہی ساری باتوں کو رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہرؔ نے کیا خوب منظوم کیا ہے ۔

یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

پہلے شعر کے "مومن جانباز" کی اصطلاح درج ذیل قرآنی آیات پر مبنی ہے:۔

"اللہ کو تو پسند وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں اس طرح صف بستہ ہو کر لڑتے ہیں گویا کہ وہ ایک سیسہ پلائی دیوار ہیں۔" (سورۃ الصف ۶۱۔ رکوع ۲)

"ان پیچھے چھوڑے جانے والے بدوی عربوں سے کہنا کہ عنقریب تمہیں ایسے لوگوں سے لڑنے کے لئے بلایا جائے گا جو بڑے زور آور ہیں۔

تم کو ان سے جنگ کرنی ہو گی۔ یا وہ مطیع ہو جائیں گے۔ اس وقت اگر تم نے حکم جہاد کی اطاعت کی تو اللہ تمہیں اچھا اجر دے گا، اور اگر تم پھر اُسی طرح منہ موڑ گئے، جس طرح پہلے موڑ چکے ہو تو اللہ تم کو دردناک سزا دے گا۔" (سورۃ الفتح ۴۸۔ رکوع ۲)

"ہم ضرور تم لوگوں کو آزمائش میں ڈالیں گے تاکہ تمہارے حالات کی جانچ کریں اور دیکھ لیں کہ تم میں مجاہد اور ثابت قدم کون ہے۔"
(سورۃ محمد ۴۷۔ رکوع ۴)

"جو لوگ اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہیں تو کبھی تم سے یہ درخواست نہ کریں گے کہ انہیں اپنی جان اور مال کے ساتھ جہاد کرنے سے معاف رکھا جائے۔ اللہ متقیوں کو خوب جانتا ہے۔ ایسی درخواستیں تو صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو اللہ اور روز آخر پر ایمان نہیں رکھتے، جن کے دلوں میں شک ہے اور وہ اپنے شک میں متردد ہو رہے ہیں۔"

(سورۃ التوبہ ۹۔ رکوع ۷)

"مومن جانباز" سے اقبال کی مراد جنگیں جیتنے والے مومن نہیں بلکہ وہ مومن مراد ہیں جو حق و باطل کی جنگ میں اپنی جان و مال سے جہاد کرنے کو تیار ہوں اور جہاں ایسی بات آتی ہے وہاں بقول اقبال ع

رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

اقبال نے خود اس کی وضاحت کی ہے:۔

"میں روحانی قوت کا تو قائل ہوں لیکن جسمانی قوت پر یقین نہیں رکھتا جب ایک قوم کو حق و صداقت کی حمایت میں دعوت پیکار دی جاتی ہے تو میرے عقیدے کی رو سے اس دعوت پر لبیک کہنا اس کا فرض ہے۔ لیکن ان تمام جنگوں کو مردود سمجھتا ہوں جن کا مقصد کشور کشائی اور ملک گیری ہو۔"

(اقبال کا نظریہ اخلاق)

دوسرے شعر میں اقبال نے "مردِ مومن" کی اصطلاح استعمال کی ہے جس پر بے شمار قرآنی آیات ہیں۔ ذیل میں چند آیات درج کیے جارہے ہیں جن میں مومن کی شان، اُس کی خصوصیات اُس کے عادات و اطوار اور ایمان کے صحیح طور پر اُس کے دل میں اترنے کی باتیں ملتی ہیں تاکہ ہم یہ تجزیہ کرسکیں کہ خدا نے اس عالم کی وراثت اور نیابتِ الٰہی کا مستحق کیسے انسانوں کو قرار دیا ہے اور جسے اقبال نے فقط "مومن جانباز" اور "مردِ مومن" کی میراث کہہ کر ان قرآنی آیات کی ترجمانی کی ہے:۔

"حقیقت یہ ہے کہ جو مجرم بن کر اپنے رب کے حضور حاضر ہوگا اس کیلئے جہنم ہے جس میں وہ نہ جئے گا نہ مرے گا۔ اور جو اس کے حضور مومن کی حیثیت سے حاضر ہوگا جس نے نیک عمل کئے ہوں گے ایسے سب لوگوں کے لئے بلند درجے ہیں" — (سورۃ طٰہٰ ۲۰۔ رکوع ۳)

"خوب جان رکھو کہ تمہارے درمیان اللہ کا رسول موجود ہے۔ اگر وہ بہت سے معاملات میں تمہاری بات مان لیا کرے تو تم خود ہی مشکلات میں مبتلا ہو جاؤ۔ مگر اللہ نے تم کو ایمان کی محبت دی اور اس کو تمہارے لئے دل پسند بنا دیا۔ اور کفر و فسق اور نافرمانی سے تم کو متنفر کر دیا۔ ایسے ہی لوگ اللہ کے فضل و احسان سے راست رو ہیں اور اللہ علیم و حکیم ہے" — (سورۃ الحجرات ۴۹۔ رکوع ۱)

"جو کچھ بھی تم لوگوں کو دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی چند روزہ زندگی کا سرو سامان ہے۔ اور جو کچھ اللہ کے ہاں ہے وہ بہتر بھی ہے اور پائیدار بھی۔ وہ ان لوگوں کے لئے ہے جو ایمان لائے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔ جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور اگر غصہ آجائے تو درگزر کر جاتے ہیں۔ جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں۔ ہم نے جو کچھ بھی رزق انہیں دیا ہے اُس میں سے خرچ کرتے

ہیں اور جب ان پر زیادتی کی جاتی ہے تو اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔"
(سورۃ الشوریٰ ۴۲۔ رکوع ۴)

"ہماری آیات پر تو وہ لوگ ایمان لاتے ہیں جنہیں یہ آیات سنا کر جب نصیحت کی جاتی ہے تو سجدے میں گر پڑتے ہیں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کرتے ہیں اور تکبر نہیں کرتے۔ ان کی پیٹھیں بستروں سے الگ رہتی ہیں، اپنے رب کو خوف اور امید کے ساتھ پکارتے ہیں اور جو کچھ رزق ہم نے انہیں دیا ہے اُس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ پھر جیسا آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان اُن کے اعمال کی جزا میں ان کے لئے چھپا رکھا گیا ہے اُس کی کسی متنفس کو خبر نہیں ہے۔ بھلا کہیں یہ ہو سکتا ہے کہ جو شخص مومن ہو وہ اس شخص کی طرح ہو جائے جو فاسق ہو؟ یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔" (سورۃ السجدہ ۳۲۔ رکوع ۲)

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لئے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے اور مارتے اور مرتے ہیں۔ اُن سے (جنت کا وعدہ) اللہ کے ذمے ایک پختہ وعدہ ہے توراۃ اور انجیل اور قرآن میں۔ اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کا پورا کرنے والا ہو؟ پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے خدا سے چکا لیا ہے۔ یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ اللہ کی طرف بار بار پلٹنے والے، اُس کی بندگی بجا لانے والے، اُس کی تعریف کے گن گانے والے، اُس کی خاطر زمین میں گردش کرنے والے، اُس کے آگے رکوع اور سجود کرنے والے، نیکی کا حکم دینے والے، بدی سے روکنے والے اور اللہ کے حدود کی حفاظت کرنے والے، (اس شان کے ہوتے ہیں وہ مومن جو اللہ سے بیع کا یہ معاملہ طے کرتے ہیں) اور اے نبیؐ! ان مومنوں کو خوشخبری دے دو۔" (سورۃ التوبہ ۹۔ رکوع ۱۴)

"سچے اہل ایمان تو وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سن کر لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر اعتماد رکھتے ہیں، جو نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اُس میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ حقیقی مومن ہیں۔" (سورۃ الانفال ۸۔ رکوع ۱)

"ایمان لاؤ اللہ اور اُس کے رسولؐ پر، اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے۔ یہی تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو اے نبیؐ، اہل ایمان کو اس کی بشارت دے دو۔" (سورۃ الصف ۶۱۔ رکوع ۲)

تو ایسے ہوتے ہیں "مومن جانباز" اور "مرد مومن" جن کے لئے اقبال نے اس جہان کو ان کی میراث بتایا ہے۔ اس میراث کا جواز اقبال کے دونوں اشعار کے پہلے مصرعوں میں ان قرآنی آیات سے ماخوذ ہے:-

"اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ اُن کو اُسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح اُن سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے، اُن کے لئے ان کے اُس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر دے گا جسے اللہ تعالیٰ نے اُن کے حق میں پسند کیا ہے۔ اور اُن کی (موجودہ) حالتِ خوف کو امن سے بدل دے گا۔ پس وہ میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں۔"

(سورۃ النور ۲۴۔ رکوع ۷)

"اور کیا ان لوگوں کو جو سابق اہلِ زمین کے بعد زمین کے وارث ہوئے ہیں، اس امرِ واقعی نے کچھ سبق نہیں دیا کہ اگر ہم چاہیں تو اُن کے قصور پر انہیں پکڑ سکتے ہیں۔" — (سورۃ الاعراف ۷۔ رکوع ۱۳)

"موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا۔ "اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو، زمین اللہ

کی ہے، اپنے بندوں میں جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے اور آخری کامیابی انہی کے لئے ہے جو اس سے ڈرتے ہوئے کام کریں۔"
(سورۃ الاعراف ۷۔ رکوع ۱۵)

دنیا کی امامت سونپے جانے اور اس کی امامت ورہنمائی اور اقوام عالم پر تاجدارانہ اقتدار کے متعلق ارشاد ربانی ہے:۔

"اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو (کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ) جسے انسانوں کی ہدایت اور اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو"۔
(سورۃ آل عمران ۳۔ رکوع ۱۱)

سورۃ الاعراف کی مندرجہ بالا آیات کی ترجمانی اقبال کے اس شعر میں ملتی ہے ؎

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا (بانگ درا۔
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا "طلوع اسلام")

پھر اس کی وراثت پر ارشاد ربانی ہے:۔

"انہیں (منکروں کو) معلوم ہو کہ ہم نے تو ابراہیمؑ کی اولاد کو کتاب اور حکمت عطا کی اور ملک عظیم بخش دیا۔ مگر اُن میں سے کوئی اس پر ایمان لایا اور کوئی اُس سے منہ موڑ گیا۔" (سورۃ النساء ۴۔ رکوع ۵)

مندرجہ بالا آیات کی ترجمانی اقبال نے بانگ درا کی نظم "طلوع اسلام" ہی میں اس طرح کی ہے:۔

حنا بند عروس لالہ ہے خون جگر تیرا
تری نسبت براہیمی ہے، معمار جہاں تو ہے

اقبال نے اپنے دونوں اشعار کے پہلے مصرعوں میں، جو اس مضمون کا موضوع ہیں، اس دنیا کی وراثت سونپے جانے کی جو باتیں کہی ہیں وہ اُن ساری آیات پر مبنی ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا اور یہ اظہر من الشمس ہے کہ جس وراثت کا ذکر انھوں نے کیا ہے یہ

وہی کُرّۂ زمین ہے جس پر ہم بستے ہیں نہ کہ قیامت کے بعد قائم ہونے والی زمین۔ مگر اقبال کے اردو کلام کے سب سے مشہور شارح پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے اپنی تصنیف "شرح بالِ جبریل" (ناشر اعتقاد پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی، سن اشاعت اپریل ۱۹۷۷ء) کے صفحہ ۲۱۴ پر پہلے شعر کے پہلے مصرعے اور صفحہ ۳۱۴ پر دوسرے شعر کے پہلے مصرعہ، یعنی دونوں اشعار کے پہلے مصرعوں کو درج ذیل آیت سے ماخوذ بتایا ہے جو صحیح نہیں:۔

"زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہوں گے۔ (اِنَّ الْاَرْضَ یَرِثُھَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ)"۔۔ (سورۃ الانبیاء ۲۱۔رکوع ۷)

پروفیسر موصوف نے اس آیت کو سیاق و سباق سے الگ کرکے اقبال کے ان دونوں اشعار کے پہلے مصرعوں کو مندرجہ بالا آیت سے ماخوذ بتایا ہے اور ایسا کرنے پر یہ غلط فہمی عام طور سے ہر شخص کو ہوتی ہے۔ قرآن مجید کی متذکرہ بالا سورۃ الانبیاء ۲۱۔رکوع ۷ میں قیامت کا منظر پیش کر چکنے کے بعد ارشادِ ربّانی ہے:۔

"وہ دن جب کہ آسمان کو ہم یوں لپیٹ کر رکھ دیں گے جیسے طومار میں اوراق لپیٹ دیے جاتے ہیں۔ جس طرح ہم نے تخلیق کی ابتدا کی تھی اسی طرح پھر اس کا اعادہ کریں گے۔ یہ ایک وعدہ ہے ہمارے ذمے اور یہ کام ہمیں بہر حال کرنا ہے۔ اور زبور میں ہم نصیحت کے بعد یہ لکھ چکے ہیں کہ زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہوں گے (اِنَّ الْاَرْضَ یَرِثُھَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ)۔ اس میں ایک بڑی خبر ہے عبادت گزار لوگوں کے لئے۔"

اس آیت کا اطلاق قیامت کے بعد قائم ہونے والی زمین پر ہوتا ہے جیسا کہ سورۃ الزمر ۳۹ رکوع ۸ سے اور بھی واضح ہو جاتا ہے:۔

"(قیامت کے دن فیصلہ کے بعد) اور جو لوگ اپنے رب کی نافرمانی سے پرہیز کرتے تھے انہیں گروہ در گروہ جنت کی طرف لے جایا جائے گا۔

یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے اور اس کے دروازے پہلے ہی کھولے جا چکے ہوں گے، تو اس کے منتظمین اُن سے کہیں گے کہ "سلام ہو تم پر، بہت اچھے رہے، داخل ہو جاؤ اس میں ہمیشہ کے لئے" اور وہ کہیں گے ——"شکر ہے اُس خدا کا جس نے ہمارے ساتھ اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور ہم کو زمین کا وارث بنا دیا (وَ اَوْرَثَنَا الْاَرْضَ) اب ہم جنت میں جہاں چاہیں اپنی جگہ بنا سکتے ہیں۔ پس بہترین اجر ہے عمل کرنے والوں کے لئے"

قیامت کے بعد کی زمین کا اجمالی خاکہ تو بہت سی آیات میں ہے مگر ایک درج ذیل ہے:۔

"یہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ آخر اُس دن یہ پہاڑ کہاں چلے جائیں گے؟ کہو، کہ میرا رب اُن کو دھول بنا کر اُڑا دے گا اور زمین کو ایسا ہموار چٹیل میدان بنا دے گا کہ اس میں تم کوئی بل اور سلوٹ نہ دیکھو گے"
(سورۃ طٰہٰ ۲۰۔ رکوع ۶)

لہٰذا اقبال نے اِن دونوں اشعار کے پہلے مصرعوں میں سورۃ النور ۲۴، رکوع ۷۔ سورۃ آل عمران ۳، رکوع ۱۱۔ سورۃ الاعراف ۷، رکوع ۱۵ اور سورۃ النمل ۲۴، رکوع ۸ کی ترجمانی کی ہے جن کا ذکر اِس مضمون میں کیا گیا نہ کہ سورۃ الانبیاء ۲۱، رکوع ۷ کی جیسا پروفیسر موصوف نے بتایا ہے۔ جب اقبال یہ کہتے ہیں کہ یہ عالم مرد مومن کی میراث ہے تو ان کی مراد ایک مومن کے اعتقاد کی وہ منزل ہے جسے اُس نے اتباعِ رسولؐ کے ذریعہ شریعت محمدی کو اپنا مزاج بنا لیا ہے۔ جس نے اپنی شخصیت کو اس اتباع کے ذریعے ارتقا کے اُن اعلیٰ ترین مدارج سے ہمکنار کر دیا ہے جہاں وہ قوت وحیات کا سرچشمہ بن کر اپنا رشتہ ملت سے استوار کر کے اپنے نصب العینی معاشرے کے لئے باعث رحمت بن کر خلیفۃ اللہ فی الارض کا فریضہ انجام دینے کا مستحق ہو جاتا ہے۔ ایک مومن کی زندگی میں ارتقار کی اس منزل کی وضاحت خود اقبال نے ڈاکٹر

نکلسن کو لکھے گئے درج ذیل خط میں کی ہے:۔

"نیابت الٰہی اس زمین پر انسانی نشوونما کا تیسرا اور آخری درجہ ہے۔ نائب کی حیثیت کرۂ زمین پر خلیفۃ اللہ کی ہے۔ وہ کامل ترین انا ہے۔ وہ انسانیت کا مقصد اور ذہنی و جسمانی دونوں قسم کی حیات کا منتہی ہے۔ اس میں ہماری اعلیٰ ترین طاقت اعلیٰ ترین علم کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے۔ اُس کی زندگی میں خیال و عمل، استدلال اور فکری علم سب ایک ہو جاتے ہیں۔ نخل انسانیت کا وہ آخری ثمر ہے ..... نوع انسانی کا وہ حقیقی حاکم ہے۔ اُس کی حکومت خدا کی حکومت ہے۔ وہ اپنی متاع فطرت میں سے دوسروں پر حیات کی دولت لٹاتا ہے اور اُن کو تدریجاً اپنے آپ سے قریب لاتا رہتا ہے۔"

اقبال نے پہلے شعر کے دوسرے مصرعہ میں مومن کہلائے جانے کے لئے "صاحب لولاک" ہونے کی شرط لگائی ہے اور دوسرے شعر کے دوسرے مصرعہ میں اپنے سارے کلام کو "نکتۂ لولاک" کی حجت بتایا ہے۔ لفظ "لولاک" درج ذیل حدیث سے ماخوذ ہے:۔

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہؐ سے فرمایا

لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ

(اگر تو نہ ہوتا تو میں کائنات کو پیدا نہ کرتا)

مومن کی شان اور اُس کی خصوصیات پر ہم قرآن کی روشنی میں تجزیہ کر چکے ہیں جس میں سورۃ الحجرات ۴۹ رکوع ۲ میں خدا نے یہ فرمایا:۔

"حقیقت میں تو مومن وہ ہے جو اللہ اور اُس کے رسولؐ پر ایمان لائے۔ اُنہوں نے کوئی شک نہ کیا اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ وہی سچے لوگ ہیں۔"

دوسری جگہ ارشاد ہے :-

"تم لوگ اللہ سے ڈرو اور اپنے آپس کے تعلقات درست کرو اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو اگر تم مومن ہو" — (سورۃ الانفال ۸۔ رکوع ۱)

"یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ اور رسولؐ پر اور ہم نے اطاعت قبول کی۔ مگر اس کے بعد ان میں سے ایک گروہ (اطاعت سے) منہ موڑ جاتا ہے۔ ایسے لوگ ہرگز مومن نہیں ہیں۔ جب ان کو بلایا جاتا ہے اللہ اور رسولؐ کی طرف، تاکہ رسولؐ اُن کے آپس کے مقدمے کا فیصلہ کرے تو اُن میں سے ایک فریق کترا جاتا ہے۔ البتہ اگر حق ان کی موافقت میں ہو تو رسولؐ کے پاس بڑے اطاعت کیش بن کر آجاتے ہیں۔۔۔ کامیاب وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی فرماں برداری کریں اور اللہ سے ڈریں اور اس کی نافرمانی سے بچیں" — (سورۃ النور ۲۴۔ رکوع ۶)

"اے محمدؐ، تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں تنگی محسوس نہ کریں بلکہ سر تسلیم خم کر لیں"

(سورۃ النساء ۴۔ رکوع ۹)

"اے نبیؐ، ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ جو راہ راست اللہ نے تمہیں دکھائی ہے۔ اُس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو" — (سورۃ النساء ۴۔ رکوع ۱۶)

متذکرہ بالا آیات میں ہر معاملہ میں رسولؐ کی طرف رجوع کرنے کا حکم جیسا قرآن نازل ہونے کے وقت تھا وہ آج بھی ہے اور یہ حکم ہر زمانہ کے لئے ہے۔ ان آیات سے یہ روشن ہے کہ اللہ کے ساتھ رسولؐ کی اطاعت لازمی قرار دی گئی ہے۔ چونکہ خدا اعلیٰ کی گرفت میں نہیں آسکتا اس لئے نیابت الٰہی کا مستحق ہونے کے لئے ایک مومن رسولؐ پاک کے اسوۂ حسنہ کو اپنی بصیرت کی بنا اور اُن کے اعمال و افکار و احادیث کو اپنی فراست

کی بنیاد بنا تا ہے۔ اقبال انہی معنوں میں ایک مومن کا "صاحب لولاک" ہونا لازمی قرار دیتے ہیں۔ خدا یہ ضرور کہتا ہے:۔

"ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں (وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ")۔ (سورۃ البقرہ ۲۔ رکوع ۲۰)

مگر شرط "صاحب لولاک" ہونے کی لگادی ہے جس کی ترجمانی اقبال نے کی ہے:۔

"اے نبیؐ، لوگوں سے کہہ دو کہ — "اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو۔ (قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ)۔ اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا۔ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔" ان سے کہو کہ۔

"اللہ اور رسولؐ کی اطاعت قبول کرو۔ پھر اگر وہ تمہاری یہ دعوت قبول نہ کریں تو یقیناً یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ ایسے لوگوں سے محبت کرے، جو اس کی اور اس کے رسولؐ کی اطاعت سے انکار کرتے ہوں۔" (سورۃ آل عمران ۳۔ رکوع ۴)

"(انہیں بتاؤ کہ) ہم نے جو رسولؐ بھیجا ہے اس لئے بھیجا ہے کہ اذنِ خداوندی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے۔" — (سورۃ النساء ۴۔ رکوع ۹)

"اے محمدؐ، ہم نے تم کو لوگوں کے لئے رسولؐ بنا کر بھیجا ہے اور اس پر خدا کی گواہی کافی ہے۔ جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے دراصل خدا کی اطاعت کی، اور جو منہ موڑ گیا، تو بہر حال ہم نے تمہیں اُن لوگوں پر پاسبان بنا کر تو نہیں بھیجا ہے۔" — (سورۃ النساء ۴۔ رکوع ۱۱)

"درحقیقت تم لوگوں کے لئے اللہ کے رسولؐ میں ایک بہترین نمونہ ہے (لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ)۔ ہر اُس شخص کے لئے جو اللہ اور یوم آخر کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے۔" (سورۃ الاحزاب ۳۳۔ رکوع ۳)

"مومن تو اصل وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ کو دل سے مانیں.....

رسولؐ کی خلاف ورزی کرنے والوں کو ڈرنا چاہیئے کہ وہ کسی فتنہ میں گرفتار نہ ہو جائیں یا اُن پر دردناک عذاب نہ آجائے۔" (سورۃ النور ۲۴۔ رکوع ۹)

"تم کبھی نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہوں وہ اُن لوگوں سے محبت کرتے ہوں جنھوں نے اللہ اور اُس کے رسولؐ کی مخالفت کی ہو..... یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کر دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک روح عطا کر کے ان کو قوت بخشی ہے۔"
(سورۃ المجادلہ ۵۸۔ رکوع ۳)

"جو شخص اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرے اس نے بڑی کامیابی حاصل کی۔" — (سورۃ الاحزاب ۳۳۔ رکوع ۹)

"رسولؐ اس ہدایت پر ایمان لایا ہے جو اس کے رب کی طرف سے اس پر نازل ہوئی ہے، اور جو لوگ رسولؐ کے ماننے والے ہیں، انھوں نے بھی اُس ہدایت کو دل سے تسلیم کر لیا ہے۔" — (سورۃ البقرہ ۲۔ رکوع ۴۰)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تم اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو برباد نہ کر لو۔" — (سورۃ محمد ۴۷۔ رکوع ۴)

"کہو، اللہ کے مطیع بنو اور رسولؐ کے تابع فرمان بن کر رہو۔ لیکن اگر تم منہ پھیرتے ہو تو خوب سمجھ لو کہ رسولؐ پر جس فرض کا بار رکھا گیا ہے اس کا ذمہ دار وہ ہے اور تم پر جس فرض کا بار ڈالا گیا ہے اس کے ذمہ دار تم۔ اُس کی اطاعت کرو گے تو خود ہی ہدایت پاؤ گے ورنہ رسول کی ذمہ داری اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ صاف صاف حکم پہنچا دے۔"
(سورۃ النور ۲۴۔ رکوع ۷)

"نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور رسولؐ کی اطاعت کرو۔ امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔" — (سورۃ النور ۲۴۔ رکوع ۷)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے رسولؐ پر اور

اس کتاب پر جو اللہ نے اپنے رسولؐ پر نازل کی ہے۔" (سورۃ النساء ۴، رکوع ۲۰)

"جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ کو اذیت دیتے ہیں اُن پر دُنیا اور آخرت میں اللہ نے لعنت فرمائی ہے۔" (سورۃ الاحزاب ۳۳۔ رکوع ۷)

"وہی تو ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے پورے کے پورے دین پر غالب کر دے خواہ مشرکین کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔" (سورۃ الصف ۶۱۔ رکوع ۱)

نظم "جوابِ شکوہ" کا درج ذیل آخری شعر انہی ساری آیات کا ترجمان ہے ؎

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

مندرجہ بالا آیات سے یہ اظہر من الشمس ہے کہ مشیت ایزدی کی پیروی صرف اتباعِ رسولؐ میں مضمر ہے اور اقبال کا یہ کہنا کہ "مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے" پر مزید روشنی درج ذیل حدیث میں ملتی ہے۔

فرمایا رسول اللہؐ نے "تم میں سے کوئی صاحبِ ایمان نہیں ہو سکتا جبتک کہ اپنی اولاد، اپنے والد اور تمام لوگوں سے زیادہ مجھ سے محبت نہ کرے۔"

روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہؐ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا "اے عمر! جب تک میں تجھ کو تیری جان سے زیادہ عزیز نہ ہوؤں گا، اُس وقت تک تو کامل انسان نہ ہو گا۔"

ایک مومن کے "صاحبِ لولاک" ہونے کی شرط خود رسول اللہؐ کی بعثت کے مقاصد سے ظاہر ہے جن پر چند آیات درج ذیل ہیں:۔

"دیکھو! تم لوگوں کے پاس ایک رسولؐ آیا ہے جو خود تم ہی میں سے ہے، تمہارا نقصان میں پڑنا اُس پر شاق ہے، تمہاری فلاح کا وہ حریص ہے، ایمان لانے والوں کے لیئے وہ شفیق اور رحیم ہے۔ اب اگر یہ لوگ تم سے منہ پھیرتے ہیں تو اے نبیؐ، ان سے کہدو کہ میرے لیئے اللہ بس کرتا ہے،

کوئی معبود نہیں مگر وہ، اُسی پر میں نے بھروسہ کیا، اور وہ مالک ہے عرش عظیم کا۔" ــــ (سورۃ التوبہ ۹۔ رکوع ۱۶)

"اے نبیؐ، ہم نے تمہیں بھیجا ہے گواہ بنا کر، بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر، اللہ کی اجازت سے اس کی طرف دعوت دینے والا بنا کر اور روشن چراغ بنا کر۔ بشارت دے دو اُن لوگوں کو جو (تم پر) ایمان لائے ہیں کہ ان کے لئے اللہ کی طرف سے بڑا فضل ہے۔" ـ (سورۃ الاحزاب ۳۳۔ رکوع ۶)

"تم یہ حکایات ان کو سناتے رہو، شاید یہ کچھ غور و فکر کریں۔"
(سورۃ الاعراف ۷۔ رکوع ۲۲)

"رسولوں کو ہم اس کام کے سوا اور کسی غرض کے لئے نہیں بھیجتے کہ وہ بشارت اور تنبیہہ کی خدمت انجام دیدیں۔" ــــ (سورۃ الکہف ۱۸۔ رکوع ۸)

"اے نبیؐ، ہم نے تم کو دنیا والوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے (وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ)" ــــ (سورۃ الانبیاء ۲۱۔ رکوع ۷)

"لوگو، یہ رسولؐ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے حق لے کر آگیا ہے۔ ایمان لے آؤ تمہارے ہی لئے بہتر ہے، اور اگر انکار کرتے ہو تو جان لو کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے اور اللہ علیم بھی ہے اور حکیم بھی۔" ــــ (سورۃ النساء ۴۔ رکوع ۲۳)

"پھر سوچو کہ اُس وقت (قیامت کے وقت) یہ (کافر نعمت) کیا کریں گے جب ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور اِن لوگوں پر تمہیں (یعنی محمدؐ کو) گواہ کی حیثیت سے کھڑا کریں گے۔ اُس وقت وہ سب لوگ جنھوں نے رسولؐ کی بات نہ مانی اور اُس کی نافرمانی کرتے رہے تمنّا کریں گے کہ کاش زمین پھٹ جائے اور وہ اُس میں سما جائیں۔" (سورۃ النساء ۴۔ رکوع ۶)

"اے نبیؐ، اُنہیں اُس دن سے خبردار کر دو جب کہ ہر اُمت میں خود اس کے اندر سے ایک گواہ اٹھا کر کھڑا کریں گے جو اس کے مقابلہ میں شہادت

دے گا، اور ان لوگوں کے مقابلے میں شہادت دینے کے لئے ہم تمہیں لائیں گے۔ اور (یہ اُسی شہادت کی تیاری ہے کہ) ہم نے یہ کتاب تم پر نازل کر دی ہے۔" (سورۃ النحل ۱۶۔ رکوع ۱۲)

"اللہ جسے چاہتا ہے سیدھی راہ دکھا دیتا ہے اور اسی طرح تو ہم نے تم مسلمانوں کو ایک "امت وسط" بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسولؐ تم پر گواہ ہو"۔ (سورۃ البقرۃ ۲۔ رکوع ۱۷)

انہی آیات کی ترجمانی اقبال نے بانگ درا کی نظم "ترانۂ ملّی" میں کی ہے ؎

سالار کارواں ہے میر حجازؐ اپنا
اس نام سے ہے باقی آرام جاں ہمارا

رسول اللہؐ کی بعثت کا مقصد صرف اس دنیا کی رہنمائی ہی نہیں تھی بلکہ اُن سب ایمان لانے والوں کو جنھوں نے اُنؐ کی باتیں مانیں اور اُن کی پیروی کی اُنہیں اس جہانِ آب و گل سے اٹھا کر قیامت کے روز خدا کے سامنے بطور تحفہ پیش کرنے والے اور عالم جاوید یعنی جنت میں پہنچانے کا شرف بھی حاصل ہے۔

فرمایا رسول اللہؐ نے "میں تمہاری وجہ سے (قیامت کے دن) دوسری اُمتوں پر فخر کروں گا۔"

اسی حدیث کی ترجمانی بانگ درا کی نظم "طلوع اسلام" کے اس شعر میں ملتی ہے ؎

جہانِ آب و گل سے عالم جاوید کی خاطر
نبوّت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے

ان ساری آیات اور احادیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وجہ آفرینش اور مقصدِ حیاتِ انسانی صرف عشق رسولؐ میں پنہاں ہے اور یہ بھی کہ خدا خود عاشق رسولؐ ہے اور رسولؐ کے عاشقوں کا عاشق۔ یہ کہ خدا خود عاشق رسولؐ ہے اس کا ثبوت جہاں سارا قرآن ہے وہاں سورۃ یٰسٓ ۳۶، رکوع ۱ کی درج ذیل آیات ہیں۔ جہاں خدا خود قسم کھا کر، اور وہ بھی قرآن کی، کہتا ہے کہ:۔

"ویٰسٓ، قسم ہے قرآن حکیم کی کہ تم (محمدؐ) یقیناً رسولوں میں سے ہو۔ (یٰسٓ ۝
وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۝ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝)"

دوسری جگہ خدا پھر قسم کھا کر کہتا ہے کہ:۔

"قسم ہے قلم کی اور اس چیز کی جسے لکھنے والے لکھ رہے ہیں، تم (محمدؐ) اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہو۔ اور یقیناً تمہارے لئے ایسا اجر ہے جس کا سلسلہ کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو (وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ) ۔۔ (سورۃ القلم ۶۸۔ رکوع ۱)

مندرجہ بالا آیات پر رسول اللہؐ نے اپنی بعثت پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا:۔

"میں اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ بہترین قسم کے اخلاق کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دوں۔"

بال جبریل کی نظم "مسجد قرطبہ" کے درج ذیل اشعار انہی آیات پر مبنی ہیں:۔

آہ وہ مردانِ حق! وہ عربی شہسوار
حاملِ "خُلقِ عظیم"، صاحبِ "صدق و یقین"
جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمز غریب
سلطنت اہل دل فقر ہے، شاہی نہیں!

اللہ کے ساتھ رسولؐ کی اطاعت ایک مومن کو، جو "صاحب لولاک" ہے، درجات کی کس منزل پر پہنچا دیتی ہے اس پر ارشاد ربانی ہے:۔

"جو لوگ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کریں گے وہ اُن لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین۔ کیسے اچھے ہیں یہ رفیق جو کسی کو میسر آئیں۔ یہ حقیقی فضل ہے جو اللہ کی طرف سے ملتا ہے۔" ۔ (سورۃ النساء ۴۔ رکوع ۹)

خدا کے عاشقِ رسولؐ ہونے کے جہاں لاتعداد ثبوت قرآن میں ملتے ہیں اور جن میں کچھ کا ذکر اس مضمون میں کیا گیا ہے، وہاں خدا اور اس کے فرشتوں کا خود رسولؐ

پر درود بھیجنا اور دوسروں کو درود بھیجنے کی تاکید کرنا ایک "صاحب لولاک" مومن کے جذبۂ ایمانی کی وہ منزل ہے جہاں وہ رسول اللہؐ سے روحانی اتصال حاصل کر لیتا ہے ۔ ارشادِ ربانی ہے :-

"اللہ اور اس کے ملائکہ نبیؐ پر درود بھیجتے ہیں، اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تم بھی اُنؐ پر درود بھیجو"۔ (سورۃ الاحزاب ۳۳۔ رکوع ۷)

"سورۃ الاحزاب" ۵ھ میں مدینہ میں نازل ہوئی تھی اور یہ آیت اُس وقت اتری جب مدینہ کے کافر اور مشرکین نبیؐ کی خانگی زندگی اور نکاح پر چہ میگوئیاں کر رہے تھے اور انہیںؐ مدینہ سے نکل جانے تک کی دھمکی دی جا رہی تھی۔ اس آیت میں خدا نے یہ بتلایا کہ یہ تو ایسا شخص ہے کہ اس پر فرشتے ہی نہیں ہم بھی درود بھیجتے ہیں۔ اس سے زیادہ اس کی پاکیزگی اخلاق کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے اور اس لئے ہر ایمان لانے والے کو تاکید کی گئی کہ وہ بھی ایسا ہی کرے۔

"صلوٰۃ" کے معنی ہیں کسی سے انتہائی محبت، اس کی مدح و ثنا اور اس کے حق میں دعا کرنا۔ ظاہر ہے کہ رسولؐ سے انسان محبت کر سکتا ہے۔ اس کی مدح و ثنا کر سکتا ہے مگر وہ صلوٰۃ کا حق اس لیے ادا نہیں کر سکتا چونکہ جس برگزیدہ نبی پر خدا صلوٰۃ (درود) بھیجتا ہو اس پر ایک انسان کی کیا ہستی۔ اس لئے رسول اللہؐ سے جب لوگوں نے پوچھا کہ آپؐ پر درود کیسے بھیجا جائے تو آپؐ نے فرمایا کہ چونکہ تم مجھ پر صلوٰۃ کا حق ادا نہیں کر سکتے اس لئے تم مجھ پر صلوٰۃ بھیجے جانے کی دعا خدا سے کرو۔ انھوں نے بہت سے درود لوگوں کو بتلائے اور یہی وجہ ہے کہ ہم جب درود پڑھتے ہیں تو شروع میں اس طرح کرتے ہیں:-

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ (اے اللہ محمدؐ پر درود بھیج)

اس درود کی فضیلت کے متعلق فرمایا رسول اللہؐ نے۔

"جو شخص مجھ پر درود بھیجتا ہے ملائکہ اس پر درود بھیجتے رہتے ہیں جب تک وہ مجھ پر درود بھیجتا ہے"۔ (احمد ابن ماجہ)

"جو مجھ پر ایک بار درود بھیجتا ہے اللہ اس پر دس بار درود بھیجتا ہے"۔ (مسلم)

"قیامت کے روز میرے ساتھ رہنے کا سب سے زیادہ مستحق وہ ہوگا جو مجھ پر سب سے زیادہ درود بھیجے گا۔" (ترمذی)

اسی صلوٰۃ و درود پر اقبال کے عشقِ رسولؐ میں گرویدگی نے اُن سے یہ شعر کہلوایا جو ایک "صاحبِ لولاک" کے ذوق و شوق کا مظہر ہے ۔

کافرِ ہندی ہوں میں، دیکھ مرا ذوق و شوق
دل میں صلوٰۃ و درود لب پہ صلوٰۃ و درود

(بالِ جبریل "مسجدِ قرطبہ")

ان ساری آیات و احادیث سے جو اس مصرعہ "مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے" کی وضاحت میں درج کی گئی ہیں اس سرزمین کی وراثت کا مستحق ہونے کے لئے مردِ مومن کو اپنے ایمان کی پختگی کے ساتھ "صاحبِ لولاک" ہونے کے لئے اپنی انا کو اعمالِ صالح کے ذریعے جِلا دینا ہے۔ چونکہ ایمان کا تعلق اعمالِ صالح سے ہے اس لئے دنیاوی اور ذاتی سارے معاملات میں اُسے اپنے اعمال کو احکامِ الٰہی کا تابع بنانا ہے۔ رسول اللہؐ کی ذات بابرکات چونکہ مجسّم قرآن ہے اس لئے احکامِ الٰہی کی پابندی کے لئے اس کا رسول اللہؐ کا فرمانبردار ہونا ضروری ہے۔ جب وہ آپؐ کے نقشِ قدم کو نشانِ راہ تصوّر کرے گا تو صرف یہی نہیں کہ وہ نیابتِ الٰہی کے فرائض کو خوش اسلوبی سے انجام دے سکے گا بلکہ وہ خود تقدیرِ الٰہی بن جائے گا۔

یہ کہ "اسوۂ حسنہ" مجسم قرآن ہے اس پر روایت ہے کہ حضرت سعد بن ہشامؓ ایک روز ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ نبی کریمؐ کے اخلاقِ کریمہ بیان فرمائیے۔ ام المومنینؓ نے فرمایا کہ تم قرآن نہیں پڑھتے۔ انہوںؓ نے عرض کیا "الحمد للہ قرآن تو روز پڑھتا ہوں۔" حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا "پس قرآن ہی آپ کا خُلق ہے اور اسی قرآن میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ رسول اللہؐ کی ذات بابرکات میں تمہارے لئے بہترین نمونۂ زندگی ہے" (دیکھیں سورۃ الاحزاب ۳۳۔ رکوع ۲۱ اور سورۃ القلم ۶۰۔ رکوع ۱) انہی دونوں سورتوں کی آیات اور مذکورہ بالا حدیث کی ترجمانی اقبال

نے اس شعر میں کی ہے ؎

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰس وہی طٰہٰ

(بالِ جبریل۔ غزل ۱)

اقبال کے نصب العینی معاشرہ کے لئے اُس معاشرے کا نصب العینی انسان ایسا "صاحبِ لولاک" "مومن" ہی ہو سکتا ہے کیونکہ سورۃ النور ۲۴ کے رکوع ۷ میں ارشاد ہے کہ "اللہ کے مطیع بنو اور رسولؐ کے تابعِ فرمان رہو"۔ اور اسی سورہ کے رکوع ۹ میں ارشاد ہے کہ "مومن تو اصل میں وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ کو دل سے مانیں"۔ "صاحبِ لولاک" کہہ کر اقبال نے سورۃ الانفال ۸۔ رکوع ۳ کے ان ارشادات کو بھی یاد دلایا ہے:۔

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ اور اس کے رسولؐ کی پکار پر لبیک کہو جب رسولؐ تمہیں اس چیز کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہے اور جان رکھو کہ اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہے اور اُسی کی طرف تم سمیٹے جاؤ گے۔"

رسول اللہؐ کی اسی پکار پر لبیک کہنے والوں اور ان کا تابعِ فرمان رہنے اور اُنہیںؐ دل سے ماننے والوں کو ہی اقبال نے "صاحبِ لولاک" سے موسوم کیا ہے اور ایسے ہی ایمان رکھنے والوں کے لئے یہ جہان میراث بنایا ہے اس لئے کہ ایمان لانے والوں کو یہ امانت اس لئے سونپی گئی کہ وہ حضورؐ کے سانچے میں اپنی زندگیوں کو ڈھال کر اُن کی نیابت میں انسانیت کا نجات دہندہ بنیں۔ قرآن کو ضابطۂ ہدایت اور روشنی و حکمت بنانا ہی "صاحبِ لولاک" ہونے کے مترادف ہے جیسا کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت میں بھی اوپر گذر چکا ہے اور جسے اقبال نے اس طرح نظم کیا ہے ؎

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن — قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے — دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان

(ضربِ کلیم "مردِ مسلماں")

یہ دوسری بات ہے کہ انکار کی نعمت خداداد کی وجہ سے

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں　　　ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق!

(ضربِ کلیم ”اجتہاد“)

قرآن کو بازیچۂ اطفال بنا کر　　　چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد!

(ضربِ کلیم ”آزادی“)

رسول اللہؐ کے انتقال کے فوراً ہی بعد حضرت ابوبکرؓ مسجد شریف میں تشریف لائے اور کہا کہ:-

”واضح ہو کہ جو کوئی شخص تم سے محمدؐ کی عبادت کرتا تھا وہ تو رحلت فرماگئے اور جو کوئی اللہ کی عبادت کرتا تھا تو بے شک اللہ تعالیٰ زندہ ہے۔ اُسے موت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے:-

”محمدؐ اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں، ان سے پہلے اور رسول بھی گزر چکے ہیں، پھر کیا اگر وہ مرجائیں یا قتل کردئے جائیں تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ یاد رکھو! جو الٹا پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا۔ البتہ جو اللہ کے شکرگذار بن کر رہیں گے اُنہیں وہ اس کی جزا دے گا“ — (سورۃ آلِ عمران ۳۔ رکوع ۱۵)

اقبال نے اِنہی ساری آیات اور احادیث کے پیشِ نظر مسلمانوں پر یہ طنز کیا ہے

خوب ہے تجھکو شعارِ صاحبِ یثربؐ کا پاس
کہہ رہی ہے کہ زندگی تیری کہ تو مسلم نہیں

(بانگِ درا۔ ”تضمین بر شعر ابوطالب کلیم“)

اقبال کا یہ کہنا کہ اُن کے کلام میں نکتۂ لولاک کی حجّت ہے تو اس سے اُن کی مراد یہ ہے کہ اُن کے کلام میں وہی جامعیت ہے جو اسلام اور اُس کے پیغام کی خصوصیت ہے۔ اور اسلام کا یہ سارا پیغام رسول اللہؐ سے انتہائی گرویدگی، عقیدت مندی اور انؐ کے اعمال و اقوال کو رشد و ہدایت کا آخری مینار قرار دینا ہے۔ ان کا ارادہ یا

[redacted]

فارسی کا سارا کلام اٹھا جائیے ورنہ ایک شعر نکتۂ لولاک پر ضرور ملیں گے۔ علاوہ ازیں نعتیہ نظمیں اور غزلیں تو لاتعداد ہیں۔ اگر صرف اُن نعتیہ کلام کو یکجا کیا جائے تو ایک مختصر سا دیوان مرتب ہو سکتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنی آخری تصنیف ارمغانِ حجاز کی نظم "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" میں بھی روحِ محمدی سرایت نظر آتی ہے۔ ابلیس کو بظاہر تو اپنی ریشہ دوانیوں سے اطمینانِ کُلّی ہے کہ یہ اُمّت اب پھر سر اٹھانے والی نہیں مگر وہ اپنے مشیروں کو اِس خارشہ سے آگاہ کیے بغیر نہیں رہتا کہ ؎

جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں | ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں | بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں!
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف | ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں
الحذر آئینِ پیغمبرؐ سے سو بار الحذر | حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب | یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں

مدحتِ رسولؐ کا موضوع اختصار و اجمال کا نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ شرح و اطناب کا مقتضی ہے جو نہ تو اِس مختصر سے مضمون میں ممکن ہے اور نہ ہی کسی کتاب ہی میں کیونکہ یہ مقدس داستان کتنا بھی اختصار سے کام لیا جائے طویل ہی ہوتی چلی جائے گی۔ بقول غالب ؎

غالب ثنائے خواجہؐ بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

اس مضمون سے مراد اقبال کے ان دو اشعار کا جو اس کے موضوع ہیں قرآن اور احادیث کی روشنی میں مطالعہ کرنا اور ایک کا فرہنگی کے ذوق و شوق کا تجزیہ کرنا تھا۔ اسلامیات پر اردو زبان میں جب بھی کسی کا قلم اٹھے گا یا منبر و محراب سے جو بھی خطبے دیے جائیں گے اُن کا عنوان اقبال کا کوئی شعر ضرور ہوگا اور آج بھی ہے۔ صرف اس لئے کہ یہ قرآن کی منظوم تفسیر اور نکتۂ لولاک کی حجت ہے اس مضمون کے عنوان سے مطابقت رکھنے کی وجہ سے اسے "جواب شکوہ" کے

ذیل اشعار پر ختم کرنا زیادہ مناسب ہوگا جو اس ساری بحث کا لب لباب بھی کہا جاسکتا ہے:۔

عقل ہے میری سپر، عشق ہے شمشیر تری
مرے درویش! خلافت ہے جہانگیر تری

مگر عشق بھی کیسا؟

گرمیٔ مہر کی پروردہ ھلالی دنیا
عشق والے جسے کہتے ہیں بلالی دنیا

اور ان سب کا انجام یہ کہ:۔

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسم محمدؐ سے اجالا کر دے

محمد سالم قدوائی

تذکرہ گلشنِ کرم

یہ کتاب مولوی حافظ تقی انور علوی کاکوروی کی تصنیف ہے، جس میں کاکوری کے سجادہ نشین بزرگوں کے حالات و کرامات اور علمی کاوشوں کا تذکرہ ہے۔ قصبہ کاکوری لکھنؤ سے آٹھ نو میل کے فاصلہ پر ہے، یہ اودھ کے مشہور اور اہم قصبات میں شمار ہوتا رہا ہے، اس قصبہ کے بڑی بڑی علمی و ادبی ہستیوں کے ساتھ ساتھ بہت سے بزرگان دین بھی پیدا کئے جنھوں نے اس کی عظمت کو جلا دی۔ سیاسی نقطۂ نظر سے بھی اس کی اہمیت ہے، جنگ آزادی میں یہاں کے لوگوں نے نمایاں حصہ لیا اور اپنے وطن کی آبیاری اپنے خون سے کی۔ یہاں کی مشہور ہستیوں میں مفتی عنایت احمد، ملا محمد غوث، قاضی نبی الدین علی خاں ثاقب، رضا حسن خان، ڈپٹی امیر احمد، سجاد حسین، مفتی رسول بخش، خلیل الدین خان، مشیر احمد علوی ناظر، غلام احمد فرقت وغیرہ اسی سرزمین کے رہنے والے تھے جنھوں نے اپنے اپنے زمانہ میں غیر معمولی شہرت اور عزت حاصل کی اور اس علاقہ کے لئے ہی نہیں بلکہ اپنے وطن کے لئے بھی باعث فخر رہے۔

اس کتاب کی ابتدا عارف باللہ شاہ کاظم قلندر کے حالات سے ہوتی ہے۔ کاظم کے اجداد زمانہ کی چیرہ دستیوں اور چنگیزی و تاتاری حملوں کی تباہ کاری

ڈاکٹر محمد سالم قدوائی، ریڈر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ — ۲۰۰۱

سے پریشان ہوکر اپنا وطن جو سرزمین حجاز میں تھا چھوڑنے پر مجبور ہوئے، ان
کے جد امجد قاری امیر سیف الدین سکندر لودی کے عہد حکومت میں ہندوستان
آئے اور کاکوری میں مستقل طور پر سکونت اختیار کی۔ ان کے بیٹے مخدوم نظام الدین
قاری اپنے دور کے اہم علماء میں شمار ہوتے تھے۔ تذکرۃ الاصفیاء، ثمرات الآخرۃ، منتخب
التواریخ اور بحر ذخار وغیرہ میں ان کا تفصیلی تذکرہ اور ان کے ظاہری و باطنی کمالات
کو بیان کیا گیا ہے۔ ملا نظام الدین قاری کے بیٹے حافظ شہاب الدین کم عمری ہی میں
انتقال کر گئے ان کے بیٹے ملا عبد الکریم اپنے دادا کے زیر تربیت رہے اور ان ہی
سے بہت سے علوم حاصل کئے، پھر دادا کے حکم سے مزید تعلیم کے لئے دہلی روانہ
ہوئے، راستہ ہی میں دادا کی خرابی صحت کی اطلاع ملی، ان کے حکم سے واپس آئے
دادا نے ان کو تصوف کی منزلیں سر کرائیں۔ دادا کے انتقال کے بعد ان کی مسند
ارشاد پر متمکن ہوئے اور ایک طویل عرصہ تک خدمت خلق اور رشد و ہدایت
کے کاموں میں لگے رہے۔

شاہ محمد کاظم قلندر اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھے، جو کافی عرصہ تک کسی قطب
وقت کی تلاش میں بھٹکتے پھرے۔ شاہ باسط قلندر الٰہ آبادی کی نگاہ دوررس اور
ذہن باصفا کی نوازشوں سے بہرہ اندوز ہوئے، انہیں کے حکم سے کاکوری واپس
آئے اور سجادہ نشین ہوئے، ان سے جو سلسلہ شروع ہوا وہ آج تک قائم ہے اور
اس کا فیضان جاری ہے۔ اس سلسلہ کے تمام بزرگ ذکر و فکر کی مصروفیات کے
ساتھ ساتھ لوگوں کی اصلاح اور رہنمائی کا کام برابر کرتے رہے ہیں۔ ان لوگوں
نے کبھی حب دنیا اور جاہ و حشمت کی طلب نہ کی، حاکموں اور امراء و رؤساء کی
محفلوں سے احتراز کیا، ضرورتمندوں کے لئے ان کے دروازے ہمہ وقت کھلے
رہے۔ اس کتاب میں ان بزرگوں کے ایسے بہت سے واقعات بیان کئے گئے
ہیں جنہیں پڑھ کر آنکھیں کھل جاتی ہیں اور ان کی عظمت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔
خانقاہ کاظمیہ کے بانی شاہ محمد کاظم قلندر کے حالات میں لکھا ہے کہ آپ نے
اپنے دشمن تک کو برا نہ کہا اور نہ بد دعا دی۔ خود شاعر تھے اپنے کلام میں بھی اس

اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ "ہم دوست و دشمن دونوں کو سلام کرتے ہیں اور سلامتی چاہتے ہیں"۔ ان کی علمی خدمات کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ درس و تدریس رشد و ارشاد کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف میں بھی مشغول رہے۔ کئی کتابیں تصنیف کیں اور حقائق و معارف کے بہت سے رموز اپنے اشعار میں پیش کیے۔

اس سلسلہ کے دوسرے بزرگ شاہ تراب علی قلندر ہیں۔ ان کی ولادت ۱۷۶۹ء میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر پائی۔ ملا قدرت اللہ بلگرامی، مولوی معین الدین بنگالی اور ملا حمید الدین محدث کاکوروی سے حاصل کی۔ جس ماحول میں آنکھ کھولی اور ہوش و خرد کی منزلیں طے کیں وہ متبرک اور پاکیزہ تھا۔ دنیا کی بے ثباتی اور فنائیت کی صدائیں فضا میں گونج رہی تھیں۔ والد محترم نے ان کی طرف پوری توجہ کی اور تصوف کی تعلیم دینا شروع کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں اس فن کے ماہر ہو گئے۔ والد بزرگوار نے خانقاہ کا کاروبار ان کے سپرد کر دیا۔ اسی زمانہ میں ان کی شادی بھی ہوئی۔ آپ نے بہت سے علمی اور اصلاحی کام کیے۔ ان کی پہلی تصنیف مثنوی اصول المعارف ہے جس میں طریقت کے دس مقامات نظم کیے۔ دوسری تصنیف اصول المقصود ہے جس میں حضرت شاہ کاظم قلندر کے ملفوظات کو جمع کیا ہے اور اس ضمن میں بہت سے دوسرے بزرگوں کے حالات بھی بیان کیے ہیں۔ تیسری تصنیف مجمع الفوائد ہے جس میں سلوک و تصوف کے مضامین اور اعمال و ادعیہ ہیں۔ چوتھی تصنیف فتح الکنوز ہے اس میں شیخ و مرید کے آداب اور حقائق و معارف کی باتیں بیان کی ہیں۔ پانچویں تصنیف مقالات صوفیہ ہے اس میں آپ نے بہت سے اولیاء اللہ کے ارشادات مختلف کتابوں سے جمع کیے ہیں۔ چھٹی تصنیف شرائط الوسائط ہے جس میں پیر و مرید کے آداب اور بیعت و خلافت کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ ساتویں تصنیف کشف المتواری فی حال نظام الدین قاری ہے جس میں آپ نے حضرت نظام الدین کاکوروی کے خاندان کے حالات وغیرہ بیان کیے ہیں۔ آٹھویں تصنیف مطالب رشیدی ہے جس میں شریعت و طریقت اور معاش و معاد وغیرہ کا ذکر ہے۔ یہ ایک طرح کا دستور العمل ہے جسے آپ نے اپنے مخصوص مرید مولوی رشید الدین خاں کی تعلیم کے لیے لکھا تھا۔ یہ بہت

کی مقبول تصنیف ہے جو متعدد بار شائع ہو چکی ہے۔ دوسری تصنیف مجاہدات الاولیاء ہے جس میں بہت سے متقدمین اور متأخرین اولیاء سلسلۂ قلندریہ کی ریاضتوں اور مجاہدوں کے واقعات بیان کئے ہیں۔ اسرار المشیخت ان کی تیسری تصنیف ہے جس میں بیعت و خلافت کے اقسام و احکام اور خرقہ پوشی کا تفصیلی بیان ہے۔ چوتھی تصنیف تعلیم الاسرار ہے جس میں اعمال و اوراد اور وظائف و تعویذات قرآنی وغیرہ کو بیان کیا گیا ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ آپ کے بہت سے مکاتیب بھی شائع ہو چکے ہیں۔

شاہ تراب علی کو شعر کہنے کا بھی بہت شوق تھا۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، ان کی شاعری میں زیادہ تر صوفیانہ خیالات کا اظہار ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمدردی، اخوت، خودداری اور حب وطن وغیرہ کا بھی سبق ملتا ہے۔ اردو اور فارسی کے علاوہ ہندی میں بھی ان کا تمام کلام موجود ہے۔ ان کی بہت سی حیرت انگیز کرامات کا ذکر بھی ان کے حالات میں ملتا ہے۔ [illegible]ھ میں چورانوے (۹۴) سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔

شاہ حیدر علی قلندر اس سلسلہ کی تیسری کڑی ہیں۔ انھوں نے بھی تمام عمر بہت فقہ، منطق اور اخلاق و تصوف کی تعلیم [illegible] خانقاہ کا کام اپنی پیرانہ سالی کے زمانہ میں ان کے سپرد کر دیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد مسند خلافت پر متمکن ہوئے اور اس سلسلہ کی خدمت کو مستحکم کیا۔ ان کے حالات، کارناموں اور کرامات کا ذکر ان کے حالات میں بیان کیا گیا ہے۔ ان کے اقوال سنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ مثلاً آپ فرماتے تھے کہ "افراط و تفریط ہر چیز کی [illegible] امر میں معیوب ہے [illegible] خیر الامور اوسطہا پر عمل کرنا چاہئے"۔ لفظ فقر کی تشریح آپ نے اس طرح کی "ف سے مطلب فاقہ، ق سے قرب، اور ر سے رافت، فقیر کو چاہئے کہ قرب و رافت حق میں فنا کا طالب رہے"۔ فرماتے تھے کہ "پکا دیندار وہ ہے جیسے حضرت سرور کائنات ﷺ سے کمال [illegible] ہو"۔ فرماتے تھے کہ "شکر ہر حال میں خواہ ذاتی ہو یا [illegible] سرمایۂ حصول جاذبیہ [illegible] ہے"۔

مولانا شاہ علی اکبر قلندر ''تذکرہ گلشن کرد'' کے چوتھے بزرگ ہیں ان کو بھی اپنے سلسلہ کے دوسرے بزرگوں کی طرح درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کا شوق تھا، ان کے دو رسالے خاص طور سے مشہور ہیں، ایک اصل الاصول فی بیان السلوک اور دوسرا ہدیۃ المتکلمین۔ ان کی تعلیم وتربیت ان کے چچا شاہ تقی علی قلندر نے کی تھی، بعد میں اپنے والد صاحب سے بھی تصوف وسلوک کا علم حاصل کیا۔ ان کا مزاج بہت سادہ تھا کسی کو برا نہ کہتے تھے، ہر عقیدہ اور خیال کے لوگوں کے ساتھ اخلاق محبت سے پیش آتے، جس بات کا تعلق ان کی ذات سے نہ ہوتا اس میں کبھی دخل اندازی نہ کرتے۔ جو لوگ ان کے مخالف تھے اور ان پر اعتراضات کرتے تھے ان کی باتوں کو بھی ہنس کر ٹال دیتے اور برا نہ مانتے تھے۔

مولانا حافظ شاہ علی انور قلندر اس سلسلہ کی پانچویں مقدس ہستی ہیں جن کے ذکر سے یہ کتاب مزین ہے، ان کی تعلیم وتربیت بھی خاندان کے بزرگوں ہی نے کی خاص طور سے والد محترم اور جد بزرگوار نے۔ ان کو بھی درس وتدریس سے والہانہ لگاؤ تھا۔ علمی مسائل پر غور وفکر بھی کرتے اور سوال وجواب میں بھی حصہ لیتے انھوں نے پچیس کتابیں تصنیف کیں جو مختلف مضامین پر مبنی ہیں اور جن میں فلسفہ ومنطق، تصوف واخلاق تذکرہ وسوانح وتفسیر وغیرہ شامل ہیں۔ یہ تصانیف ان کے علمی تبحر اور جامعیت کا پتہ دیتی ہیں۔ ان کے بہت سے ارشادات ان کے حالات میں درج ہیں جو ان کے مزاج کے آئینہ دار ہیں، مثلاً فرماتے تھے کہ ''طالب کو صبر وتحمل سے کام لینا چاہیئے نہ کہ پریشانی وانتشار سے،، ''عاقل وہ ہے جو لایعنی باتوں کو اپنے میں راہ نہ دے اور نہ خدا طلبی کی فکر میں رہے،، ''ہمیشہ اس کی کوشش کرتے رہنا چاہیئے کہ حقوق العباد میں سے کوئی حق فوت نہ ہونے پائے۔'' ''انسان کو اپنے معاملہ میں سچا رہنا چاہیئے خواہ وہ معاملت بحق ہو یا بہ خلق''۔۔۔۔ ان سے بھی سلسلہ کے اور بزرگوں کی طرح بہت سی کرامات منسوب ہیں، جو ان سے دلچسپی رکھتا ہو پڑھ سکتا ہے۔

اس کاروان کے چھٹے عظیم سالار مولانا شاہ حبیب حیدر قلندر رہیں، ان کی شخصیت میں بھی وہ تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں جو ان کے اسلاف واجداد کا طرۂ امتیاز

تھیں۔ تعلیم و تربیت وغیرہ بھی اسی انداز پر ہوئی۔ ان کو بھی درس و تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا شوق تھا۔ بہت سی کتابیں تصنیف کیں اور بعض دوسرے بزرگوں کی کتابوں پر حاشیے لکھے۔ بہت سادہ اور منکسر المزاج تھے، عفو و درگذر اور جود و سخا ان کے مزاج کے نمایاں پہلو تھے۔ ان سے بھی بہت سے ارشادات اور کرامتیں ان کے حال میں لکھی ہیں، بہت سے لوگوں نے اپنے ذاتی مشاہدات کی بنیاد پر ان کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔

اس بزم کے ساتویں مجاہد مولانا شاہ تقی حیدر قلندر رہیں۔ یہ شاہ حبیب حیدر کے مجھلے بھائی تھے۔ ان کی پیدائش ۱۸۱۰ء میں ہوئی۔ ان کی تعلیم و تربیت والد اور چچا نے کی۔ اپنے پیشرووں کی طرح انھوں نے بھی درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور بہت سے لوگوں کو اپنے علم و فضل سے بہرہ ور کیا۔ تصنیف و تالیف ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ان کے حالات میں ان کی تئیس (۲۳) کتابوں کا ذکر ملتا ہے جو مختلف علوم و فنون سے متعلق ہیں اور بیشتر طبع بھی ہو چکی ہیں۔

آٹھویں بزرگ جن کا تذکرہ اس کتاب میں ہے وہ حافظ شاہ علی حیدر قلندر رہے، یہ شاہ تقی حیدر صاحب کے چھوٹے بھائی اور جانشین تھے۔ ان کی پیدائش ۱۸۹۲ء میں ہوئی۔ حسب دستور خاندان انھوں نے بھی اپنی تعلیم اپنے ہی بزرگوں سے حاصل کی اور تمام ضروری علوم میں مہارت پیدا کی، ان کو بھی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف سے گہرا لگاؤ تھا۔ بہت سے لوگوں نے ان سے فیض اٹھایا، ان کی بہت سی تصانیف کا تذکرہ ملتا ہے جن میں "السیرۃ العلویہ فی ذکر مآثر المرتضویہ" بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب اردو میں ہے اور حضرت علیؓ کی مکمل اور مفصل سوانح ہے، جس میں تمام حالات مستند کتابوں کے حوالہ سے لکھے گئے ہیں۔ اس کتاب کی تصنیف سے ان پر طرح طرح کے الزامات لگائے گئے جن میں رفض و تشیع کا بھی الزام تھا لیکن آپ نے کبھی ان بے بنیاد الزامات کی طرف توجہ نہ کی۔ ان کی اور بھی بہت سی خوبیوں کا ذکر تفصیل سے ان کے حالات میں ملتا ہے، ان کا انتقال ۱۹۴۷ء میں ہوا۔

اس سلسلہ کی نویں کڑی مولانا شاہ مصطفےٰ حیدر صاحب ہیں، ان کی ولادت ۱۹۲۴ء میں ہوئی ان کی تعلیم دادا، والد اور چچا کی نگرانی میں ہوئی۔ مولانا عبدالحی بیلی بھیتی

مولانا ظفر الحسن جونپوری اور مفتی ابوذر سنبھلی سے بھی کسب فیض کیا، ۱۹۴۷ء میں جس وقت ملک تقسیم ہو رہا تھا اور ہر طرف افراتفری اور قتل و غارت گری کا سلسلہ جاری تھا ان بزرگوں کی وراثت کا جانشین بنایا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو علم و حکمت اور حلم و تدبر کے ساتھ ایسے قلب و نظر سے نوازا ہے جو اس دور میں شاید و باید۔ انھوں نے مشکلات و پریشانیوں کا سامنا، بڑی ہمت و مستعدی سے کیا جو صرف اللہ کے منتخب بندے ہی کر سکتے ہیں۔ ان کے علم و فضل و فیضان کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ بے شمار لوگ یہاں سے سیراب ہو رہے ہیں، اپنی ظاہری وضع قطع کے ساتھ اس آستانے کے تقدس کو بھی اسی طرح سے باقی رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمر میں برکت دے اور ان کو اپنے بزرگوں کے علم و فن رکھ رکھاؤ اور ذہنی و روحانی تربیت کے سلسلہ کو جاری رکھنے میں مدد دے اور ان کے فیض کو تا دیر برقرار رکھے۔

اس کتاب میں شاہ مجتبیٰ حیدر صاحب کا ذکر جو شاہ مصطفیٰ حیدر صاحب کے چھوٹے بھائی اور دست راست ہیں، حاشیہ پر کیا گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی شخصیت یقینی طور پر ایسی ہے کہ اسے کتاب کا جزو ہی بنانا چاہیئے تھا۔ ان کے علمی کمالات، تصنیف و تالیف میں مہارت، انتظامی صلاحیتیں اور سب سے بڑھ کر روحانی فیوض ایسے ہیں جو اس دور کے بہت سے نام نہاد بزرگوں کے لئے قابل اتباع ہیں، ان کا سب سے عظیم کارنامہ یہ ہے کہ خانقاہ کے تمام امور میں اپنے بڑے بھائی سے اس طرح منسلک رہتے ہیں جیسے یکجان و دو قالب۔

میں کاکوری کی آخر الذکر دونوں باکمال ہستیوں سے کافی مدت سے متعارف ہوں، اپنے علمی کاموں کے سلسلہ میں کئی بار کاکوری گیا ہوں اور ان بزرگوں سے ملا ہوں، میں نے یہاں کے ماحول کو بہت مختلف پایا۔ اوپر کی سطور میں میں نے اس تذکرہ میں شامل تمام بزرگوں کا اجمالی تعارف کرایا ہے، میرا مقصد اس سے یہی ہے کہ ان کی کرامات اور سنی سنائی باتوں سے قطع نظر ان کے علمی و ذہنی افکار کو پیش کرسکوں، اس لئے کہ کرامات کا تعلق محض اعتقاد سے ہے۔ اس تذکرہ

میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو ممکن ہے جدید ذہن کے لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں لیکن علمی نکات اور تصنیفی کارنامے جو ان بزرگوں نے اپنی یادگار چھوڑے ہیں یقینی طور پر ایسے ہیں جو ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

یہ تذکرہ ایک طرف تو اس خاندان کے بزرگوں اور اس کے ضمن میں بہت سے متعلقہ لوگوں کے حالات پر مشتمل ہے اور دوسری طرف اس میں جس انداز سے ان لوگوں کے حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کی صفائی قلب اور ذہنی تعلیم کا تذکرہ کیا گیا ہے اس کا مقصد واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان بزرگوں نے جس طرح سے خود کو اور اپنے متعلقین کو سجایا سنوارا تھا ہم بھی اسی راہ پر گامزن ہوں اور ان کے فیوض و برکات صرف کتب کی زینت نہ بنیں بلکہ اس کو اپنی زندگی کے لئے نمونہ بنائیں۔ تصوف کی تعلیم بھی یہ نہیں رہی ہے کہ ہم اپنے کو دنیا سے الگ رکھیں اور صرف مذہبی امور کی ادائیگی ہی میں لگے رہیں بلکہ تصوف نے ہم کو یہ سکھایا ہے کہ ہم اپنی زندگی کو دوسروں کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کر دیں اور ایسے کام کریں جن سے اپنوں ہی کو نہیں غیروں کو بھی بہت کچھ مل سکے۔

کتاب خاصی توجہ، محنت، دیدہ ریزی اور لگن سے لکھی گئی ہے۔ خاص طور سے حاشیہ پر اور بیچ بیچ میں جن لوگوں کا تذکرہ آگیا ہے اس سے کتاب کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔ چونکہ یہ کتاب ایک سلسلہ کے خاندانی بزرگوں کا تذکرہ ہے اور اس کے لکھنے والے خود بھی اسی خاندان کے ہونہار چشم و چراغ ہیں اس میں عام طور سے روایات پر زیادہ بھروسہ کیا گیا ہے اور علمی کمالات کے مقابلہ میں متصوفانہ کمالات کے بیان پر توجہ زیادہ دی گئی ہے۔ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ بہت سی منتشر اور بکھری ہوئی باتیں سلیقہ کے ساتھ یکجا ہو گئی ہیں اور آئندہ تذکرہ نویسوں کے لئے ایک قابل اعتماد کتاب تیار ہو گئی ہے۔ اس کتاب کو دیکھنے کے بعد اردو کی زبوں حالی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اب اردو کے کاتب اور علمی کاموں کو صحیح ڈھنگ سے چھاپنے والے پریس بھی کم ہوتے جا رہے ہیں۔

اس کتاب میں کتابت و طباعت کی بہت سی غلطیاں باوجود کوشش کے باقی رہ گئی ہیں، لیکن اس سے کتاب کی اہمیت وافادیت پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔

اس کتاب کے مصنف کا ہم سب کو اور خاص طور سے اس سلسلہ کے متعلقین کو شکر گذار ہونا چاہیئے کہ انھوں نے مختلف ذرائع سے بہت سے واقعات اور منتشر حالات کو یکجا کر دیا اور ایک مستند تذکرہ تیار کر دیا۔

اس تذکرہ میں چارسو صفحات ہیں، ناشر خود مولف ہیں، قیمت چالیس ۴۰ روپے ہے اور ملنے کا پتہ کتب خانہ انوریہ، تکیہ شریف کاظمیہ، کاکوری ضلع لکھنؤ ہے۔

سید محمد عزیز الدین حسین

مرقعات حسن

عہد شاہ جہاں و اورنگزیب کا ایک ماخذ

ان رقعات کے مرتب ابوالحسن تھے جو کہ صوبہ اڑیسہ کے صوبہ داروں کے منشی تھے۔ انھوں نے اس عہدہ پر ۱۶۵۵ء سے ۱۶۷۰ء تک کام کیا۔ لہٰذا اس دور میں جو بھی خط و کتابت مرکز، صوبہ کے مرکز اور دوسرے امراء اور افسران صوبہ کے درمیان ہوئی اس کو انھوں نے محفوظ رکھا۔ بعد میں ان تمام رقعات کو یکجا کر کے ان کی تدوین کی اور اس کا نام مرقعات حسن رکھا۔ مرقعات حسن کی تدوین ۲۰ صفر ۱۰۸۰ھ مطابق ۱۶۶۹ء کو مکمل ہوئی۔

مرقعات حسن کا اصل نسخہ رضا لائبریری، رام پور میں محفوظ ہے۔ اس کے دوسرے نسخوں کے بارے میں ایس آر شرما، مصنف ببلیوگرافی آف مغل انڈیا اور دوسرے مصنف خاموش ہیں لیکن ہو سکتا ہے کہ اس کا نسخہ کہیں اور بھی موجود ہو۔ اس لئے کہ زیادہ تر مخطوطات کے کیٹلاگ چھپے نہیں ہیں۔ میری اس وقت تک کی تحقیق کے مطابق اس کا دوسرا نسخہ کم از کم مجھے نہیں ملا۔

مرتب مرقعات حسن نے دیباچہ لکھا ہے لیکن اس میں اپنے بارے میں صرف اتنا لکھا ہے کہ وہ منشی کے عہدے پر فائز تھے اس کے علاوہ انھوں نے اپنے سلسلے میں کچھ نہیں لکھا، جس سے ابوالحسن اور ان کے خاندان کے حالات پر کچھ روشنی پڑ سکتی۔

ڈاکٹر سید محمد عزیز الدین حسین، شعبۂ تاریخ، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

یہ معاملہ ابوالحسن کے ساتھ ہی نہیں بلکہ اس دور کے زیادہ تر مرتبین کے ساتھ ہے۔ یہی مشکل مجھ کو عنایت، اللہ خاں کشمیری اور کیول رام کے سلسلے میں پیش آئی۔ ان معلومات کے نہ ہونے کی وجہ سے تحقیق بھی محدود ہو جاتی ہے۔

مجھ کو مرقعات حسن کا مطالعہ کرنا تھا لیکن کیونکہ آج کل رضا لائبریری سربہ مہر ہے اس لئے اس کا اصل نسخہ نہ دیکھ سکا۔ اسی نسخہ کی نقل شدہ ایک کاپی، ریسرچ لائبریری، سنٹر آف ایڈوانسڈ اسٹڈی ان ہسٹری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں موجود ہے جس کی کتابت نسیم اختر بھاگلپوری نے کی ہے۔ میں نے اسی کا مطالعہ کیا۔

مرقعات حسن کے بارے میں ایس، آر، شرما کی رائے ہے کہ یہ اڑیسہ کی مفصل تاریخ ہے۔ حالانکہ رقعات ہی ہیں لیکن اتنے پر از معلومات ہیں کہ اڑیسہ کے تمام ہی پہلوؤں کے بارے میں کافی مواد ہے۔ اس میں وہ تمام خط وکتابت موجود ہے جو اڑیسہ کے صوبہ داروں اور مغل بادشاہوں، صوبائی افسران اور محکمۂ لگان کے درمیان ہوئی۔

یہ رقعات شیخ ابوالخیر، تربیت خاں، شائستہ خاں، شیخ عبدالرشید، فوجدار چکلہ میدنی پور، میر جملہ، راجہ رگھناتھ دیوان، اسد خاں، فوجدار مالوہ، قطب الملک، لشکر خاں، سیف خاں، صوبہ دار کشمیر، مرزا ابوالحسن، فوجدار تلمی، شیخ محمد معصوم، میاں شیخ موسیٰ، شاہ امان اللہ قادری، وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔

یوں تو مرقعات حسن پر از معلومات ہیں ہی لیکن کچھ معلومات کافی اہم ہیں جو حسب ذیل ہیں۔ ایک 'حکم' ہے جس میں صوبہ دار اڑیسہ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ رعایا کا خیال رکھے، شہر آباد کرے اور قصبات کی آبادی اور اس کے مواضعات اور مضافات کی بہتری کی طرف توجہ دے تاکہ ان مقامات پر آبادی بڑھے اور لوگ سکون و اطمینان کے ساتھ زندگی گذار سکیں۔ جو کچھ بھی اس سلسلے میں ضروری ہو اس پر فوراً عمل کیا جائے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ مغل حکمراں کی توجہ صرف شہروں پر ہی نہیں تھی بلکہ وہ مواضعات کو بھی اتنی ہی اہمیت دیتے تھے۔

دوسرے دو خطوط میں محال 'پائے باقی' کے متعلق بھی احکامات ملتے ہیں جس سے

ظاہر ہوتا ہے کہ صوبہ اڑیسہ میں 'پائے باقی' موجود تھی اور اس کی موجودگی ظاہر کرتی ہے کہ مورخین نے 'پائے باقی' کی قلت کے سلسلے میں جو بیانات دیے ہیں وہ ہو سکتا ہے کہ ایک علاقہ کے سلسلے میں ہوں کیونکہ مرقعات حسن میں قلت 'پائے باقی' کے سلسلے میں کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ لہٰذا یہ امر بھی تحقیق طلب ہے کہ اس مسئلہ پر علیحدہ سے کام کیا جائے تاکہ صوبہ اڑیسہ کے سلسلے میں مزید معلومات 'پائے باقی' کے متعلق مل سکے۔

راجہ رگھناتھ کے نام ذو اہم رقعات ہیں جن میں صوبہ اڑیسہ کے محکمہ لگان سے متعلق معلومات موجود ہیں۔ دوسرا خط اڑیسہ کے بچوں کو خواجہ سرا بنانے کے متعلق ہے۔ اس میں ہدایت کی گئی ہے کہ کسی کو بھی اس فعل ناشائستہ کی اجازت نہ دی جائے اور آئندہ یہ فعل قطعی طور پر نہ ہو۔ کیونکہ مغل بادشاہ اور امراء اپنے حرم سرا میں بیگمات کی خدمت کے لئے ایسے مردوں کو رکھتے تھے جو خواجہ سرا ہوں لہٰذا لوگ بچوں کو ہی خواجہ سرا بنا دیتے تھے تاکہ پھر ان کو بڑے ہونے کے بعد اچھی قیمت میں فروخت کیا جا سکے۔ اورنگزیب نے اس فعل کو ممنوع قرار دیا لیکن یہ حرکت قطعی بند نہ ہو سکی۔

ایک 'دستک' انہدام بت خانہ کے سلسلے میں ہے جو کہ فوجداران، متصدیاں، گماشتہای جاگیرداران، کروریان اور عاملان کے نام ہے جو کہ کٹک سے میدنی پور تک تعینات تھے۔ اسد خاں کے حوالہ سے لکھا ہے کہ بادشاہ کو یہ پتہ چلا ہے کہ موضع تلکوٹی، میدنی پور میں ایک بت خانہ تعمیر ہوا ہے۔ بادشاہ کا حکم ہے کہ اس کو منہدم کر دیا جائے۔ اسی کے ساتھ اور ہدایات بھی شامل ہیں۔

(۱) اس صوبہ میں جہاں جہاں بھی کفّار نے بت خانے تعمیر کئے ہوں ان کو بھی منہدم کر دیا جائے۔

(۲) دوسرے اس دس بارہ سال میں جتنے بت خانے تعمیر ہوئے ہوں ان کو بھی منہدم کر دیا جائے۔

(۳) قدیم بت خانوں میں بھی کوئی ترمیم و تعمیر نہ کی جائے۔

(۴) جن بت خانوں کو گرایا جائے اس کی اطلاع دی جائے لیکن اس رپورٹ پر قاضی کی مہر ہو اور مشائخ کی شہادت ہو۔

اس حکم میں صرف انہیں بت خانوں کو شامل نہیں کیا گیا جو حال ہی میں تعمیر ہوئے تھے بلکہ وہ بت خانے بھی شامل کر دیئے گئے جو بارہ سال کے اندر بھی تعمیر ہوئے تھے۔ قدیم بت خانوں میں بھی ترمیم کی مخالفت کر دی گئی۔ کلمات طیبات میں یہ شق شامل نہیں۔ فتاویٰ عالمگیری میں گرجا اور کنیسہ کے سلسلے میں تو بحث کی گئی ہے لیکن مندروں کے متعلق کچھ کہا ہی نہیں گیا کہ مندروں کے متعلق کیا حکم ہوگا اس لئے گرجا تو اہل کتاب لوگوں کا ہے لیکن ہندوؤں کو اہل کتاب نہیں مانا پھر مندروں کی کیا حیثیت رہے گی؟ آخری شق کافی اہم ہے کہ جن بت خانوں کو گرایا جائے اس کی رپورٹ پر قاضی کی مہر ہو اور علماء کی گواہی ہو جب ہی وہ رپورٹ صحیح سمجھی جائے گی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاید امراء اورنگزیب کی انہدام بت خانہ کی پالیسی سے متفق نہیں تھے اور وہ اس کام کو نہیں کر رہے تھے بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بادشاہ کو لکھ دیتے ہوں کہ فلاں بت خانہ گرا دیا اور گرائے نہ ہوں یا یہ کہ کچھ حصہ گرا دیتے ہوں۔ اس لئے اورنگزیب نے یہ ضرورت محسوس کی ہو کہ اس رپورٹ پر قاضی کی مہر مع علما کی گواہی کے ہو۔ یہ امراء پر عدم اعتماد ظاہر کرتا ہے اور امراء پر علماء کو ترجیح ظاہر ہوتی ہے۔ اس کے خلاف امراء میں بے تعلقی کا احساس پیدا ہوا ہوگا نتیجتاً انتظام میں خرابیاں پیدا ہونے لگی ہوں گی اس لئے کہ انتظام حکومت تو امراء کی ذمہ داری ہے نہ کہ علماء کی۔ یہی وجہ ہے کہ جب شیواجی کے سلسلے میں اورنگزیب نے امراء کو مشورہ کے لئے بلایا تو مہابت خاں نے اس وقت اورنگزیب کے اس رویہ کا جواب اس طرح سے دیا کہ شیواجی کے متعلق ہم سے مشورہ کرنے سے کیا مطلب، قاضی سے فتویٰ لکھوا کر دکن بھجوا دیں شیواجی ختم ہو جائے گا۔ جیسا کہ حال ہی میں پاکستان میں مارشل لاء کے دوران کچھ مسائل، ہر محلہ کی مسجدوں کے موذن و امام کی تصدیق حکومت پاکستان نے بھی ضروری کر دی تھی اورنگزیب کے عہد میں یہ رویہ علماء کے حکومت پر اثرات کو ظاہر کرتا ہے جس کو مغل امراء قطعی پسند نہیں کرتے تھے۔

ایک اور دستک، چیزوں پر ٹیکس کے سلسلے میں ہے۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ٹیکس جو اورنگزیب نے منسوخ کر دیئے تھے صوبہ اڑیسہ میں ابھی بھی

وصول کئے جا رہے تھے لہٰذا اب مزید حکم دیا گیا کہ سوائے ان چیزوں پر کہ جن پر زکوٰۃ واجب ہے اس کے علاوہ کوئی اور ٹیکس وصول نہ کیا جائے۔ یہ دستک بھی یہی ظاہر کرتی ہے کہ صوبوں میں مغل بادشاہ کے بنائے ہوئے قوانین پر پوری طرح سے عمل نہیں ہو رہا تھا۔

کٹک میں ایک مسجد سنہ ۱۰۷۶ھ مطابق ۱۶۶۵ء میں تعمیر ہوئی جس کا قطعہ تاریخ بھی ابوالحسن نے لکھا ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ مسجد اب کٹک میں موجود بھی ہے کہ نہیں۔

زہی مروج اسلام خان دوران آنکہ — از و رسید شان دین را عنان پایندہ بنا

بنا نہاد بشہر کٹک بفارغ البال — چنانچہ خانہ کعبہ مکان فیض خدا

بہ منبر دل و جانم قضیب عقل بخواند — بنای اعظم را تاریخ این خجستہ بنا

۱۰۷۶ھ

خاتمہ کے بعد غزلیات کا ایک مجموعہ بھی ہے اور کچھ قصائد اور مثنوی بھی ملتی ہیں۔

مرقعات حسن انتہائی پر از معلومات ذخیرہ ہے۔ حالانکہ یہ سلسلہ شاہ جہاں کے دور سے شروع ہوتا ہے لیکن مرقعات حسن میں شاہ جہاں کے دور سے متعلق کم رقعات ہیں۔ اس مخطوطہ میں زیادہ تر اورنگزیب کے عہد سے متعلق رقعات ہیں جن میں مختلف قسم کی معلومات ملتی ہیں، مثلاً سیاسی، سماجی، معاشی، انتظامی اور خاص طور سے محکمۂ بنگال سے متعلق کچھ صوبیدار کے نام بھی خطوط ملتے ہیں۔ لیکن جتنا یہ ماخذ اہم ہے ابھی تک اس کا مطالعہ دقیق نظری سے نہیں کیا گیا ہے۔ جیسا کہ رقعات عالمگیری، کلمات طیبات اور کلمات اورنگزیب کے ساتھ ہے کہ رقعہ، دستک یا حکم کی تاریخ نہیں دی ہے وہی حال مرقعات حسن کا بھی ہے۔ مثال کے طور پر جن رقعات میں ہاتھی کا ذکر آتا ہے اس رقعہ پر تاریخ نہیں ہے جس سے یہ پتہ نہیں چل سکتا کہ یہ رقعہ اورنگزیب کے ابتدائی دور یا آخری دور سے متعلق ہے۔ اگر تاریخ ہوتی تو یہ مسائل زیادہ واضح ہو جاتے۔ بہرحال مرقعات حسن، مغل تاریخ اور خاص طور سے اڑیسہ کی تاریخ پر تحقیقی کام کرنے والے کے لئے ایک اہم ماخذ ہے۔

محمد اسحاق

تاریخ نگاری میں حقائق اور نقطۂ نظر کی بحث

ہسٹری لاطینی لفظ ہسٹوریا سے ماخوذ ہے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (جلد دوم صفحہ ۵۹۴) میں اس کا مفہوم حقائق کا ریکارڈ اور حقائق بنفسہ، درج ہے تو کیا محض ماضی کے واقعات و حقائق کا نام تاریخ ہے؟ اگر ایسے تمام واقعات کو تاریخ کہا جائے تو کیا ماضی کے واقعات اور تاریخی واقعات میں کوئی فرق باقی رہ جاتا ہے؟ مورخ کو ایک انشاپرداز سے جو ماضی پر ادب کے پھول برساتا ہے اور ایک صحافی سے جو صحافت کے نقطۂ نظر کو اختیار کرتا ہے کیسے الگ کریں گے؟ اس موضوع پر اگر ماہرین کی رائے کا تجزیہ کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ گرانڈ گرنڈ ہارڈ ٹائمس میں لکھتے ہیں کہ "حقائق (FACTS) ہی کی مجھے ضرورت ہے ...... محض واقعات ہی زندگی کے لئے ضروری ہیں" ۹ اویں صدی کے مورخین نے اس خیال کو بے حد پسند کیا ۱۸۳۰ء کے دہے میں رانکے کو اس کی تائید میں کہنا پڑا کہ "مورخ کی ذمہ داری صرف یہ بتانا ہے کہ یہ چیز دراصل کیسی تھی"۔

سی پی، اسکوٹ کے بقول مورخ کے لئے آزادی رائے کے باوجود حقائق مقدس ہوتے ہیں۔ برطانیہ، فرانس اور جرمنی میں اس نظریہ کے علمبردار پوری شد ومد سے

جناب محمد اسحاق صاحب متعلم ایم۔ اے تاریخ سال آخر۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی۔ ۲۵۔ ۱۱

ساتھ اسی بات کو دہراتے رہے کہ حقائق سے معروضی نتائج برآمد ہوتے ہیں، یہ دل و دماغ پر اس طرح اثر انداز ہوتے ہیں جس طرح محسوسات کی دنیا میں حواسِ خمسہ اثرات قبول کرتے رہتے ہیں۔ ایکٹن نے کیمبرج موڈرن ہسٹری کے پہلے ایڈیشن میں اسی بات پر زور دیا ہے کہ حقائق قطعی ہوتے ہیں ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی ان کے بقول ہمارا واٹرلو ایک ہی ہونا چاہیئے جس سے فرانسیسی اور انگریز، جرمن اور ڈچ سبھی مطمئن ہوں کوئی فردِ مصنفین کی فہرست دیکھے بغیر یہ نہ کہہ سکے کہ کہاں آکسفورڈ کے بشپ نے قلم اٹھایا یا فیربین، گیسکوئٹ، لیبرمین اور ہیریشن نے لکھا۔ سر جارج کلارک کی رائے اس سلسلہ میں مختلف ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "حقائق کا مقام گٹھلی کے مانند ہے جس کے چاروں طرف متنازع ترجمانی کے گودے ہیں" غالباً انہیں یہ خیال نہ آیا کہ اصل اہمیت گودے کی ہے نہ کہ گٹھلی کی۔ اس مسلک کو COMMON SENSE VIEW کا نام دیا گیا یعنی ایک عام فہم نظریہ جسے قبولِ عام حاصل ہوا۔

روزانہ کی زندگی میں بے شمار واقعات و حقائق پیش آتے رہتے ہیں۔ کچھ واقعات ایسے ہوتے ہیں جو نہایت ہی اہم ہوتے ہیں اور کچھ ایسے بھی جن سے ہم اغماض برتتے ہیں قتل کی وارداتیں بے شمار ہوتی رہتی ہیں لیکن گاندھی جی اور اندرا گاندھی کے قتل کے سانحوں کو کوئی نظر انداز بھی کرنا چاہے تو ممکن نہیں۔ بسا اوقات ایک واقعہ کسی مخصوص فرد کے لیے بڑا اہم ہوتا ہے لیکن اکثریت اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتی مثلاً سماج کے ایک معمولی فرد کی شادی۔ بظاہر یہ واقعہ نہایت معمولی ہے مگر اس واقعہ کی اہمیت اس شخص اور اس کے اعزہ کے نزدیک نہایت اہم ہے۔ کیا دوسرے افراد بھی اس کی طرف توجہ دیں گے۔ اس کے برعکس برطانیہ کے شہزادے فلپ اور ڈاینا کی شادی بھلا کوئی کیسے نظر انداز کر دے۔ اکبر اجمیر کی زیارت کے لئے جاتا ہے، ہزاروں افراد اس وقت بھی اور آج بھی وہاں جاتے ہیں لیکن تاریخ میں اکبر کا ذکر آتا ہے ان ہزاروں افراد کا کوئی ذکر نہیں جو نہایت عقیدت و احترام کے پھول وہاں نچھاور کرتے ہیں۔ بعض واقعات

کی نوعیت میں تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں ابتداءً اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی لیکن بعد میں آنے والے لمحات اس معمولی واقعہ کو غیر معمولی بنا دیتے ہیں۔ مثلاً ابراہیم لنکن کی پیدائش اور ابتدائی تعلیم کے واقعات معمولی اور فانی تھے مگر بعد میں پیش آنے والے واقعات نے ساری چیزوں کو اہم اور غیر معمولی بنا دیا۔ عہد وسطیٰ کے سلاطین کی ابتدائی زندگی جن میں ان کی حیثیت محض ایک زرخرید غلام سے کہیں زیادہ نہ تھی اگر بعد میں ان کی زندگی کا پانسہ پلٹا نہ ہوتا تو حوادث زمانہ ان کی یاد کو باقی نہ رہنے دیتا۔ بھوپال گیس المیہ کی مثال سامنے ہے اس موقع ایک زہریلی گیس کے اثرات واقعات نے انسانی دنیا پر یہ اثر پڑا کہ اس کے بعد کی معمولی سے معمولی گیس کے اثرات اور ان کے نقصانات کو اہمیت دی جانے لگی۔ بمبئی، کوچین، مدراس، ناگپور اور دہلی میں گیس سے متاثرین پر اہل قلم کی تحریریں نکلنے لگیں۔ حالانکہ بھوپال کے المیہ سے پہلے اس طرح کے معمولی واقعات کی زیادہ اہمیت نہ تھی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر معمولی واقعہ کو تاریخ اہمیت دیتی ہے تو کیا تاریخ صرف بادشاہوں اور امراء کی زندگی پر بحث کرتی ہے؟ غور تاریخ کے صفحات بادشاہوں کی خون آشام جنگوں اور ان کی ثروت و شوکت حرص و ہوس سے تو سیاہ ہیں لیکن ان میں ایک غریب کی زندگی کے حالات ایک غریب کی غربت و افلاس کا کوئی ذکر نہیں۔ تاریخ کا تعلق صرف بادشاہ اور امراء سے نہیں ہوتا ایسی تاریخ بادشاہوں اور امراء کی تاریخ ہو سکتی ہے۔ لیکن تاریخ انسانی کہلانے کی مستحق نہیں۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ انسان کی تاریخ کے لئے بھی ناگزیر ہے کہ ان لوگوں کے حالات و واقعات کو ہوں جن پر وہ حکومت کرتے تھے۔

یہ ایک المیہ ہے کہ تاریخ کی چند کتابوں کے مطالعہ کے بعد یہ ہو جاتا ہے کہ ہمیں تمام واقعات و حقائق کا علم ہو گیا۔ ہم اس عہد سے سے باخبر ہو گئے اور اب کوئی گوشہ پوشیدہ نہ رہا۔ یہ ایک زبردست ہے اور حقیقت اس کے برعکس ہے جو کچھ بھی ہم تک پہنچا ہے وہ

و حقائق کے مقابلے میں نہایت حقیر و کم مایہ ہے بیوری کے لفظوں میں "عہد قدیم
و وسطیٰ کے تاریخی ریکارڈ میں بے حد خلا ہے۔"

تاریخ کے اوراق میں کچھ ایسے بنیادی حقائق و واقعات ہوتے ہیں جو ہر
مورخ کے لئے یکساں ہوتے ہیں ان میں کوئی ترمیم و تنسیخ ممکن نہیں مثلاً ۱۵۲۶ء
میں پانی پت کی جنگ واقع ہوئی۔ یہ ایک اٹل اور ٹھوس حقیقت ہے جس میں
کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ ہاؤس مین کا کہنا ہے کہ صحیح بات کہنا مورخ کا فریضہ ہے
کوئی خوبی نہیں صحیح بات کے لئے اس کی تعریف کرنا تو ایسا ہی ہے جیسے شکر کی
تعریف کرنا کہ وہ میٹھی ہے یا نمک کے بارے میں بتانا کہ وہ نمکین ہے۔ شکر کا
میٹھا پن اور نمک کی نمکینی تو اس کی بقا کے لئے ناگزیر ہے۔ ایک مورخ کو تو علم
آثار قدیمہ، کتبات، سکوں اور تاریخوں وغیرہ پر انحصار کرنا ہوتا ہے۔ ان
سے جو بنیادی نتائج برآمد ہوتے ہیں ان میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں اس کے
بعد کا مرحلہ مورخ کی ذہنی استعداد اور نقطۂ نظر پر موقوف ہوتا ہے۔ وہ ایک
واقعہ کو غیر معمولی سمجھتا ہے۔ اور اسے غیر معمولی انداز میں پیش کرنے
کی جسارت کرتا ہے اسی طرح ایک غیر معمولی واقعہ کو معمولی بنانے کے فن
سے بھی واقف ہوتا ہے۔ بسا اوقات کچھ واقعات کو نظر انداز بھی کر دیتا ہے۔
کسی واقعہ کو قبول کرنا، اسے اہمیت دینا اور اس سے نتائج اخذ کرنا فنی
نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ سی۔ پی اسکاٹ کی رائے میں ہر صحافی
اس بات سے باخبر ہے کہ موزوں حقائق کے انتخاب اور ان کی حسب منشا ترتیب
سے رائے عامہ بنانے کی بہترین راہ ہے۔ اگر مورخ حقائق سے بات نہ کرے تو
وہ گونگے ہوتے ہیں، ان کی حیثیت خالی بورے کی ہوتی ہے جس میں کوئی چیز نہ
ڈالی جائے تو وہ کھڑا نہیں ہوسکتا۔ پروفیسر ٹالکوٹ پارسنس کے لفظوں میں یہ

SELECTIVE SYSTEM OF COGNITIVE ORIENTATION
TO REALITY ہے یعنی مورخ کی نظر انتخاب کس پر پڑتی ہے؟ اسے
... ہی پڑتا ہے۔ وہ حقائق و واقعات کے بحر بیکراں سے محض چند واقعات

وحقائق کا انتخاب کرتا ہے۔ اس کا یہ انتخاب ذاتی ہے۔ جہاں انتخاب کا آغاز ہوا وہیں تاریخ کی معروضیت داغدار ہوئی۔ معروضیت کی وکالت کرنے والے دراصل فریب میں مبتلا ہیں اسے پیدا کرنا بڑا مشکل کام ہے۔

رانکے مکتب فکر کے مطابق واقعات وحقائق ہو بہو نقل کر دینا اور معروضیت کا تقدس برقرار رکھنا ممکن ہے۔ اسی لئے ابتداءً اس نقطۂ نظر کا خوب چرچا رہا۔ لیکن جب اس کا تنقیدی جائزہ شروع ہوا تو ایسا محسوس ہوا کہ اس میں کوئی جان نہ تھی۔ تاریخ میں تو معروضیت ممکن ہی نہیں ہر شخص کسی خاص ماحول میں پروان چڑھتا ہے، کسی خاص فکر سے وابستہ ہوتا ہے۔ سمت سفر اور منزلِ متعین ہوتی ہے، اسی کے مطابق وہ کسی واقعہ کو دیکھتا اور بھلا برا تاثر قائم کرتا ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۱۷ء کا سوویت انقلاب — ایک نظریاتی انقلاب تھا۔ لینن اور اس کے مکتب فکر کے افراد نے اس کو بنظر تحسین دیکھا اس کا خیر مقدم کیا اور انقلاب دشمن طاقتوں کو ناکام بنانے کے لئے ہر طرح کے حربے استعمال کئے۔ اور ان کا یہ کام ان کے نزدیک بجا طور پر قابل تحسین تھا۔ لیکن اس نظریہ سے اختلاف کرنے والوں کا طرز فکر جداگانہ اور مختلف تھا۔ ان کے نزدیک تمام اقدامات قابل تنقید، غیر منصفانہ اور غیر عقلی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مورخین کے متعدد طبقات کسی ایک ہی واقعہ پر مختلف زاویوں سے نظر ڈالتے ہیں۔

ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ میں اکبر کی شخصیت متنازع فیہ واقع ہوئی ہے۔ ابوالفضل اور عبدالقادر بدایونی نے اس کی شخصیت کا مشاہدہ کیا اور ابوالفضل نے اکبر نامہ میں اور عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں اکبر کے حالات قلم بند کئے لیکن دونوں کے نقطۂ نظر کے اختلاف کی وجہ سے طرز تحریر میں اختلاف واقع ہوا ایک اکبر کا اس حد تک معتقد کہ تعریف و توصیف میں رطب اللسان، اور اس کے ہر اقدام کو مقدس اور محترم قرار دیا کہ قاری اس عہد کو عہد زریں اور اس شخص کو خیر کا بہترین

نمونہ قرار دینے پر مجبور ہو جائے۔ جب کہ دوسرے نے اس کے کسی عمل کو تنقید و تنقیص سے بری نہیں کیا۔ اسے ہر جگہ برائی ہی نظر آئی۔ بعد کے مورخین جب ان دو نظریوں کا مطالعہ کریں گے تو یقیناً ایک تیسرا نقطۂ نظر سامنے آئیگا۔

تاریخ نگاری تاریخ نگار کے ذاتی نقطۂ نظر سے بڑی حد تک متاثر ہوتی ہے اور یہ کسی زمانے یا علاقہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ ابن خلدون کے نزدیک تاریخ ہمیشہ "کسی زمانہ یا نسل کے متعلق مخصوص روایات کے بیان کرنے" کا نام ہے۔ اس نے اپنے تاریخی مقدمہ میں مورخ کی غلطیوں کے اسباب کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جانبداری کی نفسیات فیصلہ کی آزادی سے روک دیتی ہے اور وہ اپنے خیال کی وکالت پر مجبور رہتا ہے۔ کسی تاریخ نگار کے ذاتی رجحان و میلان کا علم اس کی تاریخ سے ہوتا ہے۔ کچھ چیزیں صراحت کے ساتھ بیان کردی جاتی ہیں اور کچھ لوگوں کے ذاتی فیصلہ پر چھوڑ دی جاتی ہیں۔ عہد وسطی کی تاریخ ہند پر برطانوی مورخین نے ایک خاص نقطۂ نظر اور مقصد کے تحت قلم اٹھایا۔ سر ہنری ایلیٹ اور پروفیسر ڈاؤسن نے اپنی مشہور کتاب کا نام "ہندوستان کی تاریخ خود اپنے مورخین کی زبانی" ایسا منتخب کیا جس سے ان کا معروضی رویہ ظاہر ہو حالانکہ اس کتاب کے اقتباسات کے انتخاب میں یہ مقصد پیش نظر رہا ہے کہ صرف ایسے حصّوں کو منتخب کیا جائے جن سے عہد وسطی کے حکمرانوں اور ان کے نظام حکومت کی گھناؤنی اور مکروہ تصویر سامنے آئے کہ مسلمانوں کی حکومت انتہائی ظالمانہ و جابرانہ حکومت تھی، انسانی اقدار غیر محفوظ تھیں، انہیں عدل و انصاف سے کوئی سروکار نہ تھا۔ قتل و غارتگری، عیاشی، شراب نوشی اور سازشوں کا بازار گرم تھا۔ عوام بالخصوص غیر مسلم افراد استحصال اور ظلم و تشدد کا نشانہ بنتے تھے۔ ایسی تصویر پیش کرکے ان کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی عوام انگریزوں کی غاصبانہ حکومت کو جائز اور نعمت تصور کریں، اس سے بیزاری اور نفرت کو ذہن میں نہ لائیں

کتاب کے دیباچہ میں پوری صراحت سے یہ باتیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن کچھ دوسرے مقاصد اور محرکات بھی یقیناً ہوں گے جن کا ذکر نامناسب خیال کیا گیا ہے۔ اس تحریر سے فرقہ داریت کا بیج بویا گیا تاکہ یکجہتی اور اتحاد عمل کی راہیں بند ہوں ساتھ ہی مسلم عوام اپنی مسموم تاریخ سے بدظن اور متنفر ہو جائیں۔

تاریخ کا مطالعہ کرتے وقت حقائق و واقعات کی نزاکت اور تاریخ نگار کے ذہنی رویہ کو نظر انداز کر دینا فنی نقطۂ نظر سے نہایت غلط ہوگا۔ تاریخی فہم وہی معتبر ہے جو ان باتوں کا تجزیہ کرے اور ان حقائق کو بے نقاب کرکے واقعات کی معنویت پر غور و فکر کرے۔ تاریخ میں معروضیت وغیر معروضیت کے اس مزاج اور نقطۂ نظر کی یہ اہمیت تاریخ کے طالب علم سے مخفی نہیں ہونی چاہیئے۔

صفحہ ۵۶ کا بقیہ

یادِ رفتگاں (غزلیں)

عندلیب شادانی، ارشد کاکوی، صادق القادری، ادیب کاکوی، سوز حیدرآبادی۔

"دائرہ" میں حسب ذیل کتابوں پر تبصرے ہوئے:۔

۱۔ شہر غزل۔ جمیل یوسف۔ تبصرہ نگار انیس صدیقی

۲۔ تاک جھانک۔ اجد الباقری۔ تبصرہ نگار انیس صدیقی

۳۔ رگ ساز۔ شاہین غازیپوری۔ تبصرہ نگار جمیل یوسف

۴۔ میرے خیال میں۔ نظیر صدیقی۔ تبصرہ نگار جمیل یوسف

"دائرہ" ایک معیاری رسالہ تھا۔

شعیب عظیم

سہ ماہی "دائرہ" ڈھاکا۔ ایک تفصیلی جائزہ

شاہد کامرانی نے سہ ماہی دائرہ ڈھاکا کا پہلا شمارہ اپریل سنہ ۱۹۷۰ء میں ستارۂ پاکستان پریس ڈھاکا سے چھپوا کر دفتر دائرہ ۲۰/۴ شیر شاہ سوری روڈ محمد پور ڈھاکا سے شائع کیا۔ اس کا کوئی دوسرا شمارہ نہیں نکلا۔ رسالہ کی صراحت یوں ہے:۔

مدیر　شاہد کامرانی

ادارہ　شبنم یزدانی، احمد زین الدین، صبا اکرام، نور الہدیٰ

سائز　ڈبل کراؤن ۱/۸ (۲۰×۳۰/۸)

ضخامت　۲۵۶ صفحات

کاغذ　نیوز پرنٹ

چھپائی　آفسیٹ

سرورق　نجمی

کتابت و تزئین　محمد اللہ

قیمت　ڈھائی روپے

ادارہ نے رسالہ نکالنے کا مقصد اپنے اداریہ "پرتو" میں تحریر کیا ہے:۔

"آوازوں کے دائرے بڑھتے پھیلتے گنبد گردوں تک جاتے ہیں۔ آوازیں وہیں مقیم ہو جاتی ہیں۔ فکر و احساس کی زبان سے نکلی ہوئی آوازیں ہمیشہ زندہ

جناب شعیب عظیم۔ ۲۲ جوگی نگر لین، ڈھاکا۔ ۳ (بنگلہ دیش)

رہنے والی آوازیں!! — یہ سلسلہ جاری رہے گا۔
ایسی ہی آوازوں کو ہم نے اس (پہلے دائرہ) میں یکجا کر لینے کی حتی الوسع کوشش کی ہے۔
ہمارا عقیدہ ہے کہ فکر و احساس کی زبان سے نکلی ہوئی بھی آوازیں ایک سی ہوتی ہیں فرق صرف لہجوں کا ہوتا ہے یوں تو لہجہ، ہر دور میں بدلتا رہتا ہے۔ لیکن ایک ہی دور میں آوازوں کا الگ الگ لہجہ بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اردو ادب کے اس دور میں بھی فکر و احساس کی زبان کا لہجہ پہلے سے مختلف ہو گیا ہے بلکہ ہر آواز کا لہجہ ایک دوسرے سے مختلف محسوس کیا جا رہا ہے اور یہ بات ہرگز بری نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔
ہم کسی کے طرفدار نہیں ہیں ہم تو اس دور کی صحیح عکاسی کرنے والی تخلیقات کے طرفدار ہیں جنہیں خلق کرنے میں کبھی ہیئت کا تجربہ ہو سکتا ہے تو کبھی ابلاغ و ترسیل کے مسائل سامنے آ سکتے ہیں کبھی علامت داخل ہو سکتی ہے اور کبھی ابہام کا ماحول پیدا ہو سکتا ہے مگر یہ سب کچھ ضرورت کے تحت ہونا لازمی ہے۔
ہم فکر و احساس کی زبانوں سے نکلی ہوئی غیر متعصب اور سچی آوازوں کے طرفدار ہیں اور ہم نے اسی بنیاد پر اتنی ساری تخلیقات یکجا کر لینے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ یہ ساری زندہ رہنے والی اسی دور کی تخلیقات ہیں،،
اب "دائرہ" میں شائع ہونے والی نگارشات پر ایک نظر ڈالیے:۔

افق — شاہد کامرانی

پرتو — ادارہ

مقالات

بنگلہ ادب و ثقافت

انشائیے

نظمیں

دوہے، رباعیات اور قطعات

۳۔ رباعیات ۔ منصور فیضی
۴۔ رباعیات ۔ نظیر صدیقی
۵۔ قطعات ۔ مقبول نقش
۶۔ قطعات ۔ اختر لکھنوی

طنز و مزاح

۱۔ تسخیر قمر ۔ واہی

افسانے

۱۔ وصل ۔ جوگندر پال
۲۔ خانما برباد ۔ غلام محمد
۳۔ ایک کش ۔ ایک زندگی ۔ محمود واجد
۴۔ گنونتی ۔ ایاز عصمی
۵۔ چاک گریباں ۔ احمد سعدی
۶۔ سیپ میں بند موتی ۔ شمیم جوادری
۷۔ شب انتظار ۔ نواب محی الدین
۸۔ آخری راستہ ۔ حیدر صفی
۹۔ جب آنکھ کھلی گل کی ۔ حسانہ انیس
۱۰۔ پیاس کا زہر ۔ انیس صدیقی
۱۱۔ بیوہ ۔ شمع خانم
۱۲۔ روشنیوں کا شہر ۔ احمد زین الدین
۱۳۔ دوسری چڑیا ۔ ذاکر عزیزی
۱۴۔ دکھتے ہوئے شانے ۔ نسیم محمد جان
۱۵۔ دوسرا سورج ۔ نورالہدیٰ
۱۶۔ صلیب بردوش ۔ شبنم یزدانی

دوسری زبانوں کے افسانے

۱۔ کرایہ ۔ سید ولی اللہ ترجمہ ۔ افسر ماہ پوری
۲۔ پانچ منٹ ۔ اجنتیہ کمار سین گپتا ۔ ترجمہ ۔ صبا اکرام

غزلیں

جمیل مظہری، احمد ندیم قاسمی، اقبال عظیم، وفا ملک پوری، ناطق لکھنوی، شرف الحسینی شرف، محب عارفی، مظہر امام، سلطان اختر، جمیل یوسف، طاہر رضوی برق، محسن احسان، خلیل تنویر، عرفانہ عزیز، ارمان نجمی، ماجد الباقری، افضل منہاس، مدحت الاختر، ابرار اعظمی، عمران فرحت، صبا اکرام، اصغر گورکھپوری، افتخار اجمل، احمد ہمدانی، ہلالی جعفری، اطہر عزیز، شاہین بدر، احمد سعید فیض آبادی، شفیق احمد شفیق، فہیم احمد فہیم، اعجاز احمد۔

(بقیہ صفحہ ۵۷ پر)

سالانہ قیمت ۱۵ روپے

جامعہ

قیمت فی شمارہ ڈیڑھ روپے

جلد ۸۳	بابت ماہ جولائی ۱۹۸۶ء	شمارہ ۷

فہرست مضامین

مجلس ادارت

مدیر

ضیاءالحسن فاروقی

مدیر معاون

عبداللطیف اعظمی

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی۔ مطبوعہ: جمال پریس دہلی ۶۔ ٹائٹیل: فائن پریس دہلی۔

شذرات

پنجاب کے حالات ہوں کہ وینکٹا رمیہ کمیشن کی رپورٹ کے خلاف کھلم کھلا یا ڈھکا چھپا ردعمل ہو، بیلگام کے لسانی فسادات ہوں یا انجمن ترقی پسند مصنفین کے اجلاس (منعقدہ ۵ اپریل ۸۶ء) میں اردو اور ہندی کا جھگڑا ہو، ایسا لگتا ہے کہ اب انسان دوستی، انصاف اور حب الوطنی کا جذبہ مفقود ہوتا جا رہا ہے اور ان کی جگہ منافقت، تنگ نظری اور نا انصافی لے رہی ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو کچھ زیادہ نامناسب نہ ہوگا کہ ہم ایک انسان اور ایک ہندوستانی کی حیثیت سے روز بروز چھوٹے ہوتے جا رہے ہیں۔ ہم انحطاط اور زوال کی طرف تیزی سے بڑھ رہے ہیں، اور ہماری پبلک لائف اور ہمارا سیاسی کلچر سخت بحران میں مبتلا ہے، وہ جو اقبال نے کہا تھا کہ یونان، مصر اور روم تو سب دنیا جہاں سے مٹ گئے لیکن ہندوستان کا نام ابھی باقی ہے، تو اس بنا پر کہا تھا کہ ہندوستان کی تہذیب میں ابھی اخلاقی و روحانی اقدار کا دم خم باقی تھا، لیکن اب اس کا یہ سَت ختم ہو رہا ہے، ہم خود اپنے ہاتھوں ان اقدار کا گلا گھونٹ رہے ہیں۔ اگر ہم نے اپنی تاریخ کے اس نازک موڑ پر اپنے اخلاقی و روحانی انحطاط اور اس کے اسباب کو سمجھنے سے گریز کیا تو بقول اقبال: نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!

جسٹس وینکٹا رمیہ نے اپنی رپورٹ کے آخر میں عبارت مزید کے طور پر چند باتیں ایسی لکھی ہیں جنھیں ہمیں مذکورہ بالا تمہید کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش

کرنا چاہیئے، اور ہو سکے تو اپنی ذہنی پستی پر آنسو بہانا چاہیئے، شاید ان آنسوؤں سے ہمارے دل کی سیاہی ڈھل جائے اور ایک بار پھر باطن کا نور ہمیں سیدھی راہ دکھا سکے۔ وہ لکھتے ہیں: عجیب بات ہے کہ لوگ اس بنا پر ملک کی تقسیم چاہتے ہیں کہ زمین کا ایک ٹکڑا کسی ایک مذہب، زبان اور رسم الخط سے متعلق ہے۔ کبھی کبھی عوام کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ ہر مذہب کی الگ ایک زبان ہوتی ہے۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ سنسکرت برہمنوں کی، ہندی ہندوؤں کی، اردو مسلمانوں کی، پنجابی سکھوں کی اور انگریزی اینگلو انڈین لوگوں کی زبان ہے۔ لوگ یہ محسوس نہیں کرتے کہ دوسرے لوگ بھی ہیں جنھوں نے ان زبانوں پر عبور حاصل کیا ہے اور ان زبانوں کی نشوونما اور ترقی میں ان کا بھی حصہ رہا ہے، دوسری طرف ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنی زبان اور اس کے حُسن سے بالکل ناواقف ہیں۔ یہ تمام زبانیں نہ صرف ہندوستان کا بلکہ ساری نوع انسانی کا تہذیبی ورثہ ہیں۔ یہ زبانیں جاندار اور خوبصورت نہ ہوتیں تو کیسے زندہ رہتیں، پھر کیوں نہ ہم ایسے لوگوں کو جو مختلف زبانیں بولتے اور سمجھتے ہیں ایک ہی ریاست میں رہنے دیں، حقیقت یہ ہے کہ بقول راج گوپالاچاری لسانی بنیادوں پر ہندوستان کی تقسیم کا تخیل ایک قبائلی تخیل تھا۔

آبادی بڑھتی رہتی ہے، اگر زمین کے کسی ٹکڑے پر آج ایک خاص زبان بولنے والے کسی قدر اقلیت میں ہیں تو کل وہ اکثریت میں ہو سکتے ہیں، تو پھر کیا ان کے جذبات بھڑکائے جائیں گے اور سرحدوں میں تبدیلی کے لئے شور مچایا جائے گا؟ مذہب، زبان اور رسم خط کے نام پر لوگوں کو باہم صف آرائی پر اکسایا جا سکتا ہے، لیکن اس کے نتیجے میں وہ مصیبت جو عام انسانوں پر جنھیں روٹی کپڑے کی فکر سے کسی لمحے نجات نہیں، ٹوٹ کر آتی ہے کیسی بھیانک ہوتی ہے۔ زبان اور مذہب انسانوں کے لئے ہوتے ہیں، انسان نہیں تو زبان اور مذہب خلاؤں کی چیز ہیں، مشکل یہ ہے کہ لوگوں سے ان مسائل پر تنہائی میں باتیں کیجئے تو وہ ان باتوں

کو صحیح سمجھیں گے، لیکن ان میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں کہ سب کے سامنے اس کا اعلان کریں۔ انجام کار خود غرض اور شر پسند عناصر احتجاج و مظاہروں کے سرغنہ بن کر نیتا بن جاتے ہیں اور غریب عوام مصائب کا شکار ہوتے ہیں۔ اب ملک اور عوام دونوں بہت بھگت چکے ہیں، پارلیمنٹ کو اب ایک قومی پالیسی کے طور پر قطعی فیصلہ کر دینا چاہیے کہ آئندہ مذہب یا زبان کی بنیاد پر کسی ریاست کی سرحدوں میں کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔ اب ہمیں انسانوں کی محبت کا سبق ایک بار پھر سیکھنا چاہیے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر کسی ریاست میں مختلف زبانیں بولنے والے ہوں اور تمام ایسی زبانوں اور ان کے کلچر کو تحفظ حاصل ہو تو ملک دشمن رجحانات کا زور کم ہوتا جائے گا اور اخوت انسانی کے نظریے کو عملی سطح پر تقویت ملے گی۔

ہندوستان کی شہریت ایک ہے۔ کوئی ہندوستانی ایسا نہیں ہے جو ہندوستان میں الگ سے کسی ایک گوشے ہی کا باسی ہو۔ سارا ملک اس کا وطن ہے، وہ کہیں بھی رہ سکتا ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک ریاست کے کچھ باشندوں کا ایک طبقہ کسی دوسری ریاست کو صرف زبان کی بنیاد پر اپنا وطن سمجھے، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ پورے ہندوستان کو اپنا وطن نہیں سمجھتا، یہ تو گویا پورے قومی نصب العین کی جڑ کھودنا ہوا، کیسی بھول بھلیاں میں ہم مبتلا ہیں اور کتنی بڑی مصیبت میں ہم پورے ملک کو مبتلا کرنے پر تلے ہوئے ہیں! ۱۸۵۸ء میں اس وقت کے امریکی حالات میں ابراہم لنکن نے ایک سوال اٹھایا تھا، دیکھئے کس طرح آج اپنی آزادی کے تقریباً چالیس برس کے بعد ہمیں خود وہی سوال درپیش ہے۔ اس نے کہا تھا:

> "پوری نوع انسانی کے سامنے یہ سوال ہے کہ کیا کوئی دستوری جمہوریہ یا ڈیموکریسی، یعنی عوام کی حکومت جس کی تشکیل میں خود انہیں عوام کا ہاتھ ہو، اپنے اندرونی دشمنوں سے اپنی علاقائی سالمیت کو محفوظ رکھ سکتی ہے یا نہیں۔ وہ گھر جو آپ اپنا مخالف ہو، قائم نہیں رہ سکتا۔"

لنکن کی اس بات میں ہمارے لئے ہمیشہ کے لئے ایک انتباہ بھی ہے !

اور یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ کسی ریاست کی خوشحالی کا انحصار اس ریاست کے بڑے یا چھوٹے ہونے پر نہیں ہے، بلکہ اس پر ہے کہ ملک کتنا مضبوط ہے۔ ریاست بڑی ہو سکتی ہے لیکن اگر ہندوستان کمزور ہے تو پھر ہم سب یعنی پورا ملک کمزور ہے۔ اگر ہماری ریاست کے کچھ گاؤں کسی اور ریاست میں چلے جائیں، تو بھی تو وہ ہندوستان ہی میں ہیں، اور یہ ہندوستان ہمارا ہے۔ اگر کسی ریاست میں کسی زبان کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ مل جائے، تو ہے تو وہ ہندوستان ہی کی زبان، اور یہ ہندوستان ہم سب کا ہے۔

اعتذار

افسوس ہے کہ ہم نہ جون میں جامعہ کا مجیب نمبر نکال سکے اور نہ جولائی میں، اس تاخیر کے کچھ ایسے اسباب ہیں جن پر ہمیں قابو نہیں۔ بہرحال ہم اپنے قارئین سے معذرت خواہ ہیں کہ انہیں انتظار کی زحمت برداشت کرنی پڑ رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دیر آید درست آید، بس تاخیر کی زحمت کو یہی کہہ کر آپ بھی برداشت کیجئے اور ہم بھی برداشت کرتے ہیں۔ جن حضرات نے مجیب نمبر کیلئے رجسٹری کے پانچ روپے بھیج دیئے ہیں اور ہمیں موصول ہو گئے ہیں وہ دفتر میں محفوظ ہیں۔ جنھوں نے نہیں بھیجے ہیں، وہ بھیج دیں تاکہ انہیں یہ خاص شمارہ ضرور مل جائے۔

— مدیر

مسعود الرحمٰن خاں ندوی

بیسویں صدی کے نصف اوّل کی عربی خود نوشت سوانح عمریاں

اس زمانہ کی خود نوشت سوانح عمریوں پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے موضوع، مواد، ناقدانہ تحلیل و تجزیہ، منطقی انداز فکر اور شگفتہ اسلوب بیان کے لحاظ سے مغربی ادباء و مفکرین کی لکھی ہوئی معاصر آپ بیتیوں کے ہم پلہ، اور عربی ادب کے گذشتہ زمانوں میں لکھی ہوئی آپ بیتیوں سے یقیناً زیادہ جامع، مکمل، دلچسپ اور شگفتہ ہیں۔ ان آپ بیتیوں کا دائرہ مشہور عربی مثل "الولد سرّ أبیه" (لڑکا اپنے باپ کا راز داں ہے) سے زیادہ پھیلا ہوا اور کشادہ ہونے کی وجہ سے، اُن پر موجودہ زمانہ کے اجتماعی فلسفہ کا مسلّمہ اصول "الانسان ابن بیئته" (انسان اپنے ماحول کا بیٹا ہے) زیادہ صادق آتا ہے، جس کی وکالت مشہور عرب مؤرخ عبدالرحمٰن ابن خلدون (۷۳۲-۸۰۸ھ / ۱۳۳۲ - ۱۴۰۶ء) بھی پہلے کر چکے ہیں۔ اس لئے ان آپ بیتیوں کے پس منظر کا تانا بانا صرف خاندانی حالات یا آباء و اجداد کے تذکرہ

ڈاکٹر مسعود الرحمٰن خاں ندوی ریڈر ریسنٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

سے نہیں بنا جاتا، جیسا کہ گذشتہ زمانوں کی آپ بیتیوں میں عام رواج تھا، بلکہ ان کے پس منظر کا جال اردگرد کے ماحول و معاشرہ، اور اس میں رواں دواں علمی، ادبی، فکری، ثقافتی، سیاسی اور اجتماعی عوامل و رجحانات کے تحلیل و تجزیہ، اور تبادل تاثیر و تأثر کے جائزہ سے مل کر تیار ہوتا ہے۔ اور یہ یقیناً ان آپ بیتیوں کی خوبی ہے، جو ان کے مؤلفین کی وسعت افق، جدید علوم و فنون سے واقفیت، انسانی نفسیات کو سمجھنے اور اس کی ترجمانی کی صلاحیت، اور تصنیف و تالیف کے جدید اصولوں کو اپنانے پر دلالت کرتی ہے۔ لیکن ان میں سے بعض آپ بیتیوں کا کمزور پہلو یہ ہے کہ ان کے مؤلفین کی نگاہیں مغربی تہذیب و تمدن کی جگمگاہٹ سے خیرہ، اور ہر میدان میں مغرب کی پیش قدمیوں سے نہ صرف مسحور، بلکہ خود اپنے ماضی سے غیر مطمئن اپنے حال سے مایوس، اور بہتر مستقبل کی تلاش و جستجو میں بھٹکتی ہوئی جھنجھلاہٹ کا شکار معلوم ہوتی ہیں، اپنے ماحول پر ان کی ناقدانہ نظر اکثر جارحانہ، قاہرانہ بلکہ باغیانہ بڑی ہے۔ خود شکستگی کے احساس کو چھپانے کی اُدھیڑ بُن میں اکثر ان کا غصہ صرف اپنے ماحول و معاشرہ کی برائیوں کو زیادہ نمایاں کرکے دکھانے ہی میں نہیں، بلکہ اپنی قومی و ملّی تاریخ و تہذیب کے بخیئے اُدھیڑنے میں صرف ہوا ہے، اور پھر یہ احساس متعدی مرض کی طرح آنے والی نسلوں میں زہر ہلاہل کی طرح سرایت کرتا رہا۔

اس زمانہ کی جدید آپ بیتیوں میں سب سے پہلے ہم مشہور صاحب طرز نابینا مصری ادیب ڈاکٹر طٰہٰ حسین (۱۸۸۹ — ۱۹۷۳ء) کی مشہور آپ بیتی الایّام (یادہائے ایام) کا تذکرہ کرسکتے ہیں، اس کتاب کا پہلا حصہ[1] مؤلف کے بچپن کے تقریباً تیرہ ۱۳ سال (۱۸۸۹ — ۱۹۰۲ء) کے حالات زندگی پر مشتمل ہے، جس میں خاص طور پر طفولیت میں نابینا ہو جانے کی وجہ سے، نابینا بچے کے ذاتی احساسات، جذبات و نفسیات کی دل کش تصویر کھینچی گئی ہے، اس بچہ کی نشو و نما، آہستہ آہستہ خارجی دنیا سے سمجھوتہ، ابتدائی تعلیم و تربیت، اور ازہر

میں تعلیم کے لئے بھائی کے ساتھ سفر قاہرہ اور دیگر موضوعات دل نشیں تصویر کشی، عکاسی اور انداز بیان کے لحاظ سے لاجواب شہ پارہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور آخر میں مؤلف نے اپنی بیٹی (جس کی عمر اس وقت ۹ سال تھی) کو مخاطب کرتے ہوئے، اسی عمر میں اپنی فقیرانہ اور مایوسانہ زندگی کا موازنہ بیٹی کی خوش حال اور عیش و آرام سے مالامال زندگی سے کیا ہے، اور اس کا ... اس کی فرانسیسی ماں کے سر باندھا ہے۔

اس کتاب کا دوسرا حصہ بھی تقریباً تیرہ ۱۳ سال (۱۹۰۲ — ۱۹۱۵ء) کے حالات زندگی پر مشتمل ہے، جو ان کی شخصیت کے بننے یا بگڑنے کا حقیقی زمانہ ہے، اس عرصہ میں انھوں نے ازہر میں تعلیم حاصل کی، اور پھر ۱۹۰۵ء سے ازہر کے ساتھ ساتھ قاہرہ یونیورسٹی میں جدید علوم سے بہرہ ور ہوئے، اور بیرونی اساتذہ سے فیض حاصل کیا، اس حصے کے آخر میں انھوں نے اپنے بیٹے کو مخاطب کیا ہے، جو اس وقت قاہرہ یونیورسٹی میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد باپ کی طرح اعلیٰ تعلیم کے لئے عازم سفر تھا، تاکہ وہ باپ کے تجربات سے فائدہ اٹھا سکے۔

اس آپ بیتی کے دو حصوں کے علاوہ ان کے سفر فرانس (۱۹۱۵-۱۹۱۹ء) کی روداد اس صدی کے چھٹے دہے کے اواخر میں بعض مصری جرائد میں ڈائری یا روزنامچہ کی شکل میں شائع ہوئی۔

طٰہٰ حسین کی یہ آپ بیتی اور ان کی ڈائری کے مطبوعہ اوراق اگرچہ اُن کی طویل چوراسی ۸۴ سالہ زندگی کے فقط ابتدائی تیس ۳۰ سال (۱۸۸۹ — ۱۹۱۹ء) کی خود نوشت سرگزشت ہے، لیکن اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ یہ ان کی باغیانہ شخصیت کے اہم ترین دنوں کی علمی، فکری، ادبی، ثقافتی، اجتماعی اور تاریخی داستان ہے، جس میں بیسویں صدی کی ابتدا میں مصر کی دیہاتی اور شہری زندگی کا موازنہ بھی ہے، اور ابتدائی مدارس اور ازہر کی قدیم طرز تعلیم اور یونیورسٹی کے جدید طرز تعلیم کا مقارنہ بھی، قدیم مصری علماء، شیوخ اور صوفیاء کے

حلقاتِ درس وذکر وفکر کی جھلکیاں ہیں، تو روشن خیال مصری علماء، ادباء، مفکرین اور مستشرقین کی مجالس علم وفضل کے چرچے بھی۔ اور عربی اسلامی تاریخ و تہذیب کے اس عظیم سانحہ کی مکمل عکاسی بھی ہے، جس کو ہم جدید کے سامنے قدیم اور مغرب کے سامنے مشرق کی مکمل خودسپردگی کی المناک بلکہ شرمناک داستان سے تعبیر کرتے ہیں۔ مؤلف کی شیریں بیانی نے اس آپ بیتی کو اگرچہ ایک دلچسپ جیتے جاگتے نغمہ کی جاودانی شکل عطا کر دی ہے، لیکن وہ خود تنگی کی اس ذہنیت کو بالکل نہیں چھپا سکا ہے، جو اس کی رگ وپے میں روح کی طرح سرایت کئے ہوئے ہے، اور جس کی طرف ہم نے تمہید میں اشارہ کیا ہے۔

اسی طرز کی دوسری خود نوشت سوانح عمری مصری قبطی ادیب وصحافی سلامہ موسیٰ (۱۸۸۸ – ۱۹۵۸ء) کی لکھی ہوئی ہے، جو تربیۃ سلامۃ موسیٰ (سلامہ موسیٰ کی تعلیم وتربیت) کے نام سے منظرِ عام پر آئی۔ ابتداء میں یہ مؤلف کی زندگی کے ساٹھ سال (۱۸۸۸ – ۱۹۴۷ء) کے حالات پر مشتمل تھی، بعد میں انھوں نے اس میں اپنی زندگی کے آخری دس برسوں (۴۷ – ۱۹۵۷ء) کے احوال ضمیمہ کے طور پر شامل کر دیئے، جس کے ایک سال کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ اس طرح یہ کتاب ان کی ستر سالہ زندگی کی خود نوشت مکمل سوانح عمری بن گئی ہے۔

یہ آپ بیتی مؤلف کے ذاتی وخاندانی حالات، نشوونما، تعلیم وتربیت، بیرونی سفر اور علمی سرگرمیوں کی صرف ایک معصومانہ کہانی نہیں ہے، بلکہ ایک بامقصد سیاسی، ادبی، ثقافتی، فکری اور اجتماعی جدوجہد کی داستان ہے، جس کا بنیادی مقصد غیر معروضی طریقہ سے حقائق کو مسخ کر کے نوجوان ذہنوں کو مسموم وگمراہ کرنا ہے۔ اور یہ اس شخص سے بعید بھی نہیں ہے، جس کی پوری زندگی مصری قومیت کے نام پر فرقہ واریت کو ہوا دینے، تجدد پسندی اور روشن خیالی کے نام پر مغربیت کی وکالت، کمیونزم اور سوشلزم کے نام پر بیرونی غلامی، سیکولرزم اور اجتماعی اصلاحات کے نام پر طائفی مصالح کے لئے جنگ، اور عربی زبان

میں نام نہاد اصلاحات کے نام پر مسلمانوں کے اسلامی اتحاد کی مضبوط کڑی، اور عربوں کے بکھرے ہوئے شیرازہ سے ان کے اتحاد کا آخری سہارا چھین لینے کی انتھک کوششوں میں گذری۔

اس آپ بیتی میں بھی مؤلف اپنے اس واضح اولین مقصد، اور اس کو حاصل کرنے کے لئے غیر معروضی طریقۂ بحث اختیار کرنے کے جذبہ کو چھپا نہیں سکا ہے، چنانچہ وہ اس کتاب کے مقدمہ میں رقم طراز ہے:

«میں نے اس آپ بیتی میں صرف اپنی زندگی بیان نہیں کی ہے، بلکہ اس سرگذشت حیات، اور میری خود ساختہ و پرداختہ شخصیت کی تکوین کے ذکر کا اصل مقصد یہ ہے کہ میں اپنے اس دور کو واضح کرنا چاہتا ہوں، جو میں نے ہمارے حال کو ماضی کے تاریک زمانوں سے ملانے والے پلوں کو تہس نہس کرنے، اور روشن ترقی اور جرأت مندانہ خواب سے بھرپور آئندہ کل (یعنی مستقبل) کی تاریخ کو گذرے ہوئے کل (یعنی ماضی) کی ظلم، فقر، جہالت اور بزدلی سے بھری ہوئی تاریک تاریخ سے ملانے کی کوششوں میں انجام دیا، یہ اس زمانہ کی تاریخ ہے جس میں میں جیا، اور یہ اس نسل کی تاریخ ہے جس کا میں ایک فرد تھا۔

«اگرچہ میں مصر کی تاریخ اپنی زندگی کی نمایاں شخصیات کے ذکر کے ساتھ بیان کروں گا، لیکن میرا یہ بیان معروضی نہ ہوگا، اس لئے مجھے تاریخ میں جاری و ساری حقیقت کے وسیع میدان کے بجائے بنیادی عوامل کو قریب سے دیکھنے کی کوشش میں خود اپنے ذہنی خوردبین کے سہارے دیکھنا پڑے گا۔ کیونکہ میری زندگی کا اولین مقصد اپنی زندگی کی کہانی سنانا ہے، جبکہ صحیح تاریخ کو میں نے دوسرا درجہ دیا ہے۔»[1]

اس اقتباس کی روشنی میں نہ صرف یہ کہ مؤلف کی اس کتاب کا مقصد

واضح طور پر سامنے آجاتا ہے جو اس کی زندگی کی تمام جد و جہد کا مقصد بھی ہے
یعنی حال کو اس ماضی سے کاٹ کر، جس سے اس کو شدید بغض و نفرت ہے،
مستقبل کی تعمیر، بلکہ وہ اس مہم جوئی میں کہانی سنانے کے نام پر تاریخ میں
جاری و ساری حقیقت کو نظر انداز کرتے ہوئے، اپنے خود ساختہ ذہنی
خور... سے گڑھے ہوئے ان بنیادی عوامل کا سہارا لینے سے بھی نہیں چوکتا
جو صرف اس کے اپنے خیالات و افکار اور رجحانات و رغبات سے میل کھاتے
ہیں۔ اور اس کھلی دھاندلی کے باوجود اس کتاب کا ترجمہ نگار، اپنے پیشرو
مستشرقین کی طرح ان من گھڑت بنیادی عوامل کی روشنی میں تیار کردہ اس
خود نوشت سوانح عمری کے مؤلف کی نہ صرف "دانشورانہ دیانت" کا قائل
نظر آتا ہے بلکہ وہ اس ذاتی سیرت کو

"قومیت، اقلیت کے مقام و مرتبہ، غیر جانبداری، کمیونزم اور
مصری دانشوروں کی مغرب و مشرق میں جدید اقدار و وسائل
تلاش جیسے مختلف نیم سیاسی مسائل میں، عرب ذہنیت کے پچاس
سالہ ارتقاء کے معتبر نقطۂ نظر" ؎

کی حیثیت سے پیش کر کے یہ تاثر دینے کی کوشش کرتا ہے کہ گویا یہ کتاب
عربوں کے پچاس سالہ فکری ارتقا کا نچوڑ، اور ان کے خیالات و افکار کا
ترجمان اور نمائندہ ہے، حالانکہ حقیقتاً وہ صرف ایک طائفی لیڈر کے
جانبدارانہ اور غیر علمی خیالات کی یک رخی تصویر ہے۔ اور ستم بالائے ستم
کہ اس ذاتی سوانح کے

"غیر علمی، غیر مدلل"، اور ذاتی جانبداری اور تعصب ... ؎

کے اقرار کے باوجود اس کا مترجم امید کرتا ہے کہ

"موجودہ کتاب ان کتابوں کے تکملہ کی حیثیت ...
معاصر اسلام کی ذاتی ترجمانی کرنے کی کوشش ...
علی القاسمی، اور خالد محمد خالد کی مؤلفات" ...

اس طرح ایک طائفی لیڈر کی یہ معصوم آپ بیتی، جو بنیادی طور پر ایک کہانی کی حیثیت سے لکھی گئی تھی، اور تاریخ میں روداں دواں حقیقت کے بجائے، اس کی بنیاد ان عوامل پر رکھی گئی تھی جو مؤلف کے ذہن و دماغ کی پیداوار تھے، لیکن دانشورانہ چابکدستی سے اس کی لپیٹ میں سیاست تو سیاست دین بھی آگیا، اور وہ بھی مؤلف یہ بات کا مترجم کا دین نہیں، بلکہ دین، ایک مسلمان عرب ملک کی اکثریت کا دین، جی ہاں!

بدل کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

اس زمانہ کی ایک اور خود نوشت سوانح عمری، عرب دنیا کی فکری زندگی کے تاریخ نگار احمد امین (۱۸۸۶ء - ۱۹۵۴ء) کی ہے، جو انھوں نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں حیاتی (میری زندگی) کے نام سے لکھی تھی۔ یہ ان کی زندگی کی تقریباً مکمل سرگزشت ہے، جس میں وہ ایک مؤرخ کی حیثیت سے اپنی زندگی کے اہم حادثات و واقعات پر بھی خامہ فرسائی کرتے ہیں، وہ موروثی اثرات کے قائل ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی پر ماحول کے اثرات کو بھی نمایاں کرتے ہیں، فطرتاً شرم و حیا کا پاس و لحاظ کرتے ہیں، موجودہ زمانہ کے آزاد منش آپ بیتی نگاروں کی تقلید میں زندگی کی ہر اس بات کو بیان کرنا ضروری نہیں سمجھتے جس کا کہنا اور سننا دونوں ناگوار ہو، خدا جانے ان کی یہ وضعداری موجودہ زمانہ کے تنقید نگاروں کی نظر میں یہ ان کی آپ بیتی کا عیب ہی کیوں نہ سمجھا جائے، جو نفس امارہ کے سربستہ رازوں کو کھول کھول کر بیان کرنے ہی کو فن کی معراج سمجھتے ہیں۔

احمد امین کو ان کے والد کی طرف سے راسخ ایمان، تہذیب و شائستگی، وضعداری، محنت شاقہ کی عادت، اور سادہ زندگی کی دولت نصیب ہوئی، جس کی چھاپ ان کی علمی، فکری اور ادبی زندگی پر تاحیات قائم رہی، انھوں نے ازہر کے قدیم طریقۂ تعلیم سے بے اطمینانی، اور مدرسۃ القضاء کے اساتذہ اور جدید طریقۂ تعلیم سے مناسبت اور اطمینان کا اظہار

انھوں نے بھی معقول حدود کے اندر کیا ہے، انگریزی زبان کی تعلیم انھوں نے ایک انگریز معلّمہ سے حاصل کی، اور اس کی شخصیت سے متأثر بھی ہوئے، متعدد تعلیمی عہدوں اور قضائی مناصب پر فائز رہے۔ جس میں قاہرہ یونیورسٹی کی فیکلٹی آف آرٹس میں تدریس، اور بعد میں اس کی ڈین شپ قابل ذکر ہیں۔ ان کی علمی ادبی سرگرمیوں میں تصنیف و تألیف و تدریس کے علاوہ ادبی سوسائٹیوں سے تعاون لَجْنَةُ التأليفِ وَالتَّرْجَمَةِ وَالنَّشْرِ کا قیام، ادبی جرائد و مجلات سے تعلق، آستانہ، شام و عراق اور یورپ کے سفر وغیرہ موضوعات شامل ہیں، ان کی آپ بیتی کے بین السطور بھی قدیم و جدید کی کشمکش پائی جاتی ہے، جو فطری ہے، ماحول و معاشرہ پر بالواسطہ تنقید بھی ہے، جو تعمیری ہے، ان کی پسند و ناپسند اور مناسبت اور عدم مناسبت کے پیمانے بھی ہیں جو انسانی مزاج کے عین مطابق ہیں، لیکن ان کے اظہار خیال اور انداز نگارش سے کہیں بھی نفرت، دشمنی یا بغاوت کی بو نہیں آتی، جو سلامہ موسی کی آپ بیتی کا خاصہ ہے، اور نہ اُن کے ہاں وہ احساس شکست اور خود سپردگی کا عالم ہے، جو طٰہٰ حسین کی خود نوشت سوانح عمری پر چھایا ہوا ہے۔ اس طرح احمد امین کی ذاتی سیرت معتدل نقطۂ نظر کی حامل ایک یادگار آپ بیتی ہے، جس میں مصر کی ساٹھ سالہ علمی، ادبی، فکری اور اجتماعی زندگی بھی سچائی، صاف گوئی اور بے مثال سادگی سے سمودی گئی ہے جو اس کتاب کا امتیازی وصف ہے۔

حواشی

١ طبع اول، قاہرہ، سنہ ۱۹۲۷ء

٢ طبع اول، قاہرہ، سنہ ۱۹۳۹ء

٣ الترجمة الشخصية، سلسلة فنون الأدب العربي، الفن القصصي، نمبر ۱۳، دار المعارف، القاہرہ، سنہ ۱۹۵۶ء، ص ۱۱۴

٤ طبع اول، قاہرہ، سنہ ۱۹۴۰ء

۵؎ طبع دوم، قاہرہ، ۱۹۵۸ء

۶؎ اصل عربی کی کتاب نہ ملنے کی وجہ سے اس اقتباس کا اردو ترجمہ اس کے انگریزی ترجمہ سے کیا گیا۔ دیکھیے

مترجم L.O. SCHUMAN، مطبوعہ E.J. BRILL

THE EDUCATION OF SALAMA MUSA, LEIDEN ۱۹۶۱ء، ص۲

۷؎ ایضاً، پیش لفظ از مترجم، ص IX

۸؎ ایضاً، ص X-XI

۹؎ ایضاً، ص XI

۱۰؎ ایضاً

۱۱؎ طبع اول، قاہرہ، ۱۹۵۰ء

۱۲؎ مقدمہ طبع اول: ص ۲۸ از طبع دوم، مع پیش لفظ از ڈاکٹر عبدالعزیز عتیق، سلسلۃ موسوعۃ احمد أمین الأدبیۃ، دارالکتاب العربی، بیروت، ۱۹۷۱ء

۱۳؎ الترجمۃ الشخصیۃ، ص ۱۲۱

ابوالبرکات کربلائی

'اسکالر' علی گڑھ

اردو میں پیروڈی پر پہلا اہم نمبر

میرے ہاتھ میں "اسکالر" کا ایک نایاب رسالہ "پیروڈی نمبر" علی گڑھ ہے، جو اتفاقیہ دستیاب ہو گیا ہے۔ "اسکالر" کا یہ اہم نمبر سرسید ہال مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے تقریباً ۲۸ سال قبل مارچ ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا تھا۔ جس کے مرتب (ایڈیٹر) احمد جمال پاشا ہیں۔ اس رسالے کے قلم کاروں نے اردو کے چند مقبول و مشہور ادبار شعرا اور ناقدین کی تخلیقات اور اسلوب و طرز نگارش کے کو بڑوں کو بہت ہی خوبصورتی اور باریک بینی سے واضح کیا ہے، جو پیروڈی کا خاصہ ہے۔

آج پیروڈی پر بڑی سرعت سے تحقیقی مقالے رقم ہو رہے ہیں۔ اس لئے "اسکالر" کا یہ "پیروڈی نمبر" ریسرچ اسکالروں کے لئے مفید و بکار آمد ہے۔ اس کی افادیت کو مدّنظر رکھتے ہوئے اس کا تعارف ناگزیر ہے

اس رسالہ کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ پروفیسر رشید احمد صدیقی

جناب ابوالبرکات کربلائی، کربلا بازار، بڑہریا، سیوان۔ ۸۴۱۲۲۲ (بہار)

اور پروفیسر آل احمد سرور نے بہت ہی مختصر مگر جامع طور پر اس میں پیروڈی کے فن سے بحث کی ہے۔ پروفیسر قمر رئیس نے ایک طویل مقالہ "پیروڈی کا فن" تحریر کیا ہے۔ جس سے فن پیروڈی کی افہام و تفہیم کا دروازہ ہوتا ہے۔ پروفیسر قمر رئیس کا یہ مقالہ ترمیم و اضافہ کے ساتھ ان کی کتاب "تلاش و توازن" میں شامل ہے۔ فن پیروڈی پر اس مقالہ کو کامل کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔ احمد جمال پاشا نے بھی فن پیروڈی پر اظہار خیال کیا ہے۔ پیروڈی سے متعلق لکھتے ہیں:-

"پیروڈی کو طنز و مزاح اور کارٹون کے خاندان کا فرد کہنا درست ہوگا۔ اس میں تضحیک سے تنقید کا کام لیا جاتا ہے۔ مگر اس کا منصب تضحیک ہرگز نہیں۔ اسی وجہ سے یہ ایک مستقل فن ہے۔" ۱

اس رسالہ کے تقریباً تمام قلمکار اپنے عہد کے نئے اور ابھرتے ہوئے شاعر و ادیب ہیں۔ تاہم تبرک کے طور پر مستند اور صاحب قلم حضرات نے اپنی آراء سے سرفراز کیا ہے۔ جس سے رسالہ کی افادیت، مزید مسلم اور دائمی ہوگئی ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے تین صفحات میں فن پیروڈی سے بحث کی ہے ان کی یہ بحث مدلل اور جامع ہے:-

"پیروڈی ظریفانہ پیوند کاری یا مزاحیہ تصرف ہی کو تو کہتے ہیں۔" ۲

اور آگے پیروڈی کے فن سے بحث کرتے ہوئے رشید احمد صدیقی فرماتے ہیں:-

"پیروڈی میں جدت اور جدت کا ہونا ضروری ہے اصل کی نقل اس طور پر کرنا یا اس میں ظرافت کا پیوند لگانا کہ تھوڑی دیر کے لئے نقاب یا پیوند کی تفریحی حیثیت اصل کی سنجیدہ حیثیت کو دبا دے۔ پیروڈی کا ہنر ہے۔" ۳

پروفیسر آل احمد سرور نے اس رسالے کا "پیش لفظ" لکھا ہے۔ فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے سرور صاحب کہتے ہیں:-

"پیروڈی ظرافت کی ایک خاص صنف ہے۔ پیروڈی کے لئے ضروری

ہے کہ جس کی پیروڈی کی جائے اس میں کچھ فکری یا فنی محور موجود ہوں۔"[۴]

فنِ پیروڈی سے متعلق شوکت تھانوی کہتے ہیں :-

"پیروڈی کرنا وہ فن ہے جس کا فنکار اگر جیل اور موت دونوں سے بچ گیا تو خود اپنے ہی فن کا شاہکار بن کر رہ جاتا ہے۔ اور اس کی کسی کاوش پہ نہیں بلکہ خود اسی پر دنیا ہنسنے لگتی ہے۔"[۵]

پیروڈی سے متعلق اردو ادب کے مایہ ناز طنز نگار کنہیا لال کپور کا خیال ہے:-

"پیروڈی مزاحیہ تنقید کی سب سے مشکل صنف ہے۔ اچھی پیروڈی لکھنا پُل صراط پر چلنے کے مترادف ہے۔"[۶]

پیروڈی سے متعلق بیشتر پیروڈی نگار، طنز و مزاح نگار اور ناقدین کے خیالات میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ شفیق الرحمٰن بھی کنہیا لال کپور کے ہم خیال معلوم ہوتے ہیں:-

"پیروڈی نہ تو محض طنز ہوتی ہے اور نہ نری تضحیک، یہ ایسی خوشگوار سی تنقید ہوتی ہے جو بری معلوم نہیں ہوتی۔"[۷]

پیروڈی سے متعلق پروفیسر محمد حسن کا خیال اردو ادب میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا:

"پیروڈی سنجیدہ فن پاروں میں مضحک پہلوؤں کی تلاش ہے۔ یہ غلط پندار، گمراہ خودی اور حد سے بڑھی انانیت میں تناسب اور توازن پیدا کرتی ہے۔ اسی لئے بہت سے گروہوں قومی یا ادبی نسلوں کی مسیحائی طنز و مزاح کے ہاتھوں ہوئی ہے اور پیروڈی بھی اسی کی ایک شکل ہے۔"[۸]

دیگر اصناف ادب کی طرح پیروڈی بھی اردو ادب میں دوسری زبان سے در آیا ہے۔ پیروڈی یونانی لفظ "پروڈیا" سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں۔ "نغمۂ معکوس"، دراصل پیروڈی کسی سنجیدہ اور مشہور و مقبول تخلیق کی سحر انگیزی کو دور کرنے کے لئے معرض وجود میں آئی ہے۔ اور یہی پیروڈی کے مادہ کا اصل

جوہر بھی ہے۔ مگر یہ ہدف بنائے جانے والی تخلیق کی مقبولیت کا ضامن ہی ہوتی ہے۔ پیروڈی کے فن کا تجزیہ کرتے ہوئے پروفیسر قمر رئیس لکھتے ہیں:۔

"اوّل یہ کہ پیروڈی لکھنے والا کسی خاص اسلوب یا فن پارہ کی خارجی ہیئت (FORM) کی تقلید کرتے ہوئے اُس کے مواد کو حسبِ ضرورت ایسی مبالغہ آرائی اور ایسے ظریفانہ پیترے سے پیش کرے کہ اس کا اصل جوہر مسخ ہو کر بھی پہچانا جا سکے۔ ایک مغربی ناقد نے بہت پتہ کی بات کہی ہے۔ اس کا قول ہے۔

"بہترین پیروڈی وہی ہے (اور یہ واقعہ ہے کہ بہترین پیروڈی شاذ و نادر لکھی جاتی ہے) جو ہیئت کے ساتھ وفاداری لیکن مواد کے ساتھ عیاری کا مسلک اختیار کرتی ہے"۔ ۹

"اسکالر" کے پیروڈی نمبر کو پانچ حصّوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ جس میں پیغامات بھی شامل ہیں۔ حصۂ نثر کے قلمکاروں میں مسعود علی ذوقی، قمر رئیس، ضیاالدین احمد شکیب، سبط اختر، ابن فرید، حسن مثنیٰ الوراور احمد جمال پاشا شامل ہیں۔ احمد جمال پاشا کی مقبولیت طنز نگار کی حیثیت سے مُسلّم ہے۔ لیکن سب سے پہلے وہ ایک کامیاب پیروڈی نگار ہیں۔ اُن کی پیروڈیاں ہند و پاک کے ممتاز ادبی رسائل میں گاہے گاہے شائع ہوتی رہتی ہیں۔ یہاں اُن کا تفصیلی ذکر کرنا ناگزیر ہے۔ پاشا صاحب کی دیگر پیروڈیوں سے قطع نظر اُن کا مضمون "کپور: ایک تنقیدی و تحقیقی مطالعہ" کا ذکر زیرِ قلم ہے۔ اس مضمون میں احمد جمال پاشا نے چند نامور مصنّفین اور ناقدین و محققین کے طرز نگارش کی کامیاب پیروڈی کی ہے۔ اردو پیروڈی نگاری میں یہ مقالہ خاصی تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ اس مضمون میں احمد جمال پاشا نے اردو کے چند چوٹی کے ناقدین کے اسلوب نگارش میں بہت ہی خوش اسلوبی سے مضحک پہلو نکالا ہے۔ جو اُن پر صادق آتا ہے۔ یہاں ان کا غور و تدبّر اپنے عروج پر پہنچ گیا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور کی تنقید جس سے مثبت پہلو یا منفی جو کسی بھی نتیجہ کی متحمل نہیں ہوتی۔

تشبیہ و استعارے سے مرصع تنقیدی اسلوب کی پیروڈی اس طرح کرتے ہیں:۔

"کپور بڑے طنز نگار ہیں۔ ان کی ظرافت کا اُجالا مانگے کا نہیں۔ بلکہ زندہ داغ و سوز و ساز و جستجو کی شعبدہ بازی سے عبارت خیالوں کی لالہ کاری ہے۔ ان کے طنز کے غازے میں شعلے کی لپک، انبساط ذہنی کی چاندنی، شیریں دیوانگی حدیث دلبری، افسانہ و فسوں کی آب و رنگ، انسانیت کے ساز پر خونِ جگر کی طلسم کاری سے دل کی دھڑکن بن کر ذہنی بیداری کا نشہ ہرن کرتی نظر آتی ہے....
.......ان کے طنز میں ظرافت کی تلاش ایسی ہے جیسے گلستان میں کانٹوں کی تلاش۔ اگرچہ انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل غلط نہیں ہے۔ کیونکہ ان کی ظرافت جب آسمانوں کی سیر کرتی ہے تو اندازہ ہوتا ہے یہ طنز کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ظرافت نگار ہیں۔ کیونکہ یہ بہت بڑے طنز نگار ہیں اور نہیں بھی ہیں۔ یعنی ایک معنوں میں ہیں۔"[۱۰]

اور پروفیسر احتشام حسین جیسے دقیقہ شناس و دقّت پسند نقّاد کے اسلوب کی پیروڈی بھی اُن کی زبانی ملاحظہ ہو:۔

"کپور کی طنز نگاری ہمارے ادب کے تہذیبی سرمائے کے اُس سماجی اظہار سے منسلک ہے جو معاشی و معاشرتی حالات اور میکانکی قوت نفاد کے ارتقار کی جدوجہد، تخلیقی عمل اور جمود کے سماجی ٹکراؤ سے انفرادی پسندیدگی کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ اس کا عمرانی مفہوم میرے نقطۂ نظر کے فلسفیانہ ربط اور اشتراکی حقیقت نگاری کی طبقاتی کشمکش کے اجتماعی شعور میں عام ہے۔"[۱۱]

احمد جمال پاشا نے جن ناقدین کے اسلوب کی پیروڈی کی ہے وہ پروفیسر رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر محمد حسن، کلیم الدین احمد، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور قاضی عبدالودود

ہیں۔ان میں سب سے دلچسپ ڈاکٹر عبادت بریلوی اور کلیم الدین احمد کے انداز تحریر کی پیروڈی ہے۔ڈاکٹر عبادت بریلوی کے یہاں تکرارِ خیال، جس کی وجہ سے عبادت میں بے جا طوالت پیدا ہو جاتی ہے، اس طرح پاشا صاحب کی تحریف کا نشانہ بنتی ہے:۔

"مجھے ـــــ یہ ـــــ کہنا ـــــ ہے کہ ـــــ کپور ـــــ کے مضامین میں جو وہ لکھتے ہیں وہ مضامین اور ان کے دوسرے مضامین جو طنزیہ ـــــ و ـــــ مزاحیہ ہوتے ہیں۔ان مضامین میں میرے خیال میں جہاں تک میں نے ان کا تنقیدی تجزیہ کیا ہے اور میں جن نتائج پر بالترتیب پہنچا ہوں اُن سے صرف ایک ہی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ مضامین اپنی جگہ پر ایسے مضامین ہیں جن میں میری دانست میں طنز ہے۔یعنی ان مضامین میں طنز ہے ـــــ طنز ـــــ میں کہتا ہوں کہ ان مضامین میں اپنی جگہ پر جیسا کہ لکھ چکا ہوں طنز ہے"۔[۱۲]

مذکورہ اقتباس کے تمام جملوں کا ماحصل صرف یہی ہے کہ کپور کے تمام مضامین میں طنز کا عُنصر غالب ہے۔اسی طرح کلیم الدین احمد کے بات کہنے کا دو ٹوک، دانشگاف انداز، تجزیاتی سادگی، لہجے کی صلابت اور رائے کی اصابت اپنی بات منوا لینے کی ہٹ اور ہنگامہ خیز طریقۂ تحریر ان سب کو احمد جمال پاشا اس طرح نشانہ بناتے ہیں:۔

"(۱)۔ دو میں طنز کا وجود محض فرضی ہے۔یہ صفر کا نقطۂ خیالی ہے یا زہرے کی موہوم کمر۔اس طرز کے طنز اور صحیح ظرافت میں فرقِ مشرقین ہے یہ فرق یہاں کم معلوم ہوتا ہے۔مگر دوسروں کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ ہے۔یہ دلچسپ ضرور ہے۔لیکن اس سے ظرافت سے کوئی لگاؤ نہیں۔اس کے پیش کرنے سے طنز و ظرافت کی اہمیت میں اضافہ ممکن نہیں"۔[۱۳]

اس رسالہ میں شامل تقریباً تمام تخلیقات کا سلسلہ وار تذکرہ متقاضی مقالہ ہے۔میں نے ترتیب ملحوظ رکھنے کی سعی کی ہے۔لیکن جب بھی کوئی پیروڈی نگار اپنی

تخلیق کے ساتھ سامنے آیا ہے۔ نادانستہ میرے قلم نے اُسے بڑھ کر تھام لیا۔ لہٰذا اب میں حصّۂ نثر میں شامل سرشار کا ترتیب وار تعارف کراتا ہوں۔

مسعود علی ذوقی نے پنڈت رتن ناتھ سرشار کے اسلوب کی کامیاب پیروڈی کی ہے۔ اُن کا مضمون "خوجی کی واپسی" کا اسلوب اُتنا ہی دلچسپ ہے جتنا کہ رتن ناتھ سرشار کی کتاب "فسانۂ آزاد" کا "خوجی کی واپسی" سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:-

"مرزا صاحب"۔ (پلیٹ فارم پر اترتے ہوئے) لیجیے خواجہ صاحب میرا ہاتھ پکڑ لیجیے اور بسم اللہ کہہ کر نیچے اتر آئیے۔

خوجی:۔ (غل مچاکر) ارے بھئی مرزا صاحب! اتروں تو کیسے اتروں؟ دیکھتے نہیں ہو کہ مسافروں کی دیوار تو سامنے کھڑی ہے — ابے ہائیں ہائیں۔ او قلی کے بچے! سر پہ کہاں چڑھا چلا آرہا ہے۔ مردود ..... بے اب ہٹتا ہے رستے سے کہ بھونک دوں قرولی؟۔

قلی:۔ (پوربی زبان میں کرخت لہجے سے) تورا ناس ہو کا؟ (پاگل ہو گئے ہو کیا؟) دیکھت ناہیں ہو من بھر بوجھا سر پر دھرے کھڑا ہیں۔ ای کا تو رے موڑ پر پٹک دیئی؟ ....

مرزا صاحب:۔ (پیچھے سے چیخ کر) ارے یار خوجی کیا بلوہ مچا یا ہے تم نے تو خدا کی قسم ناک میں دم کر رکھا ہے۔ ہوا سے لڑتے ہو۔ واللہ.......

ابو صاحب:۔ (چلتے چلتے پیچھے پھر کر دیکھتے ہوئے) ارے بھئی خوجی کہاں پیچھے رہے جاتے ہو یار؟ بے اب یہ چو طرفہ بوکھلا بوکھلا کے چکر کر دیکھنا تو بند کرو اور مرزا صاحب کا ہاتھ پکڑے ہوئے ناک کے سیدھ پر چلے آؤ۔

مرزا صاحب:۔ ہاں بھئی لو میری انگلی پکڑ لو۔ کہیں اس بھیڑ بھڑکے میں پھنس کر پیچھے رہ گئے تو بچو مر نکل جائے گا تمہارا۔ تم ٹھہرے چھٹانک بھر کے آدمی.........

خوجی:۔ (بات کاٹ کر) کیا کہا؟ پھر تو کہنا۔ ہُنہ! کہنے لگے چھٹانک بھر سے

آدمی! ـــــــ! جی چھٹانک بھر کے آدمی ہوں گے آپ۔ یہاں تو اُستاد کی دعا سے ساری عمر اکھاڑا اڑتے کاٹ دی ہے۔ ہمارا جیسا ڈنڑ پیل، کسرتی جوان اس شہر لکھنؤ میں دوسرا دکھا دو تو ٹانگ کے نیچے سے نکل جائیں قسم قرآن کی"۱۴؎

پروفیسر ممتاز حسین کے طرز پہ پروفیسر قمر رئیس نے ایک کامیاب پیروڈی کی ہے۔ جس کا عنوان ہے۔ "عوامی ادب میں سماجی شعور"۔ اس سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں:۔

"ایک روسی مصنّف کا قول ہے کہ ادب زندگی کی پرچھائیں نہیں زندگی ادب کی پرچھائیں ہے۔ گویا زندگی ادب کی حرکت اور اس کے معاشرتی انعکاسات کا تخلیقی نقطۂ عروج ہے۔ دراصل اس حکیمانہ قول کی صداقت کو پرکھنے کے لیے ہمیں ادب اور زندگی کے سماجی اور ازدواجی رشتوں کا پتہ لگانا پڑے گا۔"۱۵؎

ضیاء الدین احمد شکیب نے غالب کے خطوط کی پیروڈی "مرزا غالب ہاسٹل میں" کے عنوان سے کی ہے۔ خطوط غالب پر ضیاء الدین صاحب کی یہ کامیاب پیروڈی ہے۔ نمونہ کے لیے ایک اقتباس پیش نظر ہے:۔

"اہا ہا ہا۔ میرا پیارا مہدی آیا۔ آؤ بھائی مزاج تو اچھا ہے۔ بیٹھو۔ علی گڑھ کا یہ دار العلوم جو مشہور ہے دار السّرور ہے جو لطف یہاں ہے وہ کہاں ہے"۔ ۱۶؎

ن۔ م۔ راشد کی ایک مشہور نظم "شاخِ آہو" کی سبط اختر نے نثری پیروڈی کی ہے۔ اس پیروڈی کی خوبی یہ ہے کہ مصنّف نے اپنی طرف سے کسی بھی لفظ کا اضافہ نہیں کیا ہے۔ نظم کو صرف نثر کے قالب میں ڈھال دیا ہے:۔

"وزیر معارف علی کیانی نے "شمشیر ایران" کا تازہ مقالہ پڑھا اور حسن فرحزاد کی تازہ تصنیف دیکھی۔ جو تہران کے سب تماشا گھروں میں کئی روز سے قہقہوں کے سمندر بہانے لگی تھی، تو وہ سر کھجانے لگا۔

اور کہنے لگا لو اسے لکھ رہے ہیں۔"[۱۷]

"میں مجبوراً لکھتا ہوں" عنوان کے تحت پروفیسر ابن فرید نے پروفیسر احتشام حسین کے طرز کی کامیاب پیروڈی کی ہے:۔

"لکھنے کی مجبوری ایک نہ ایک مسئلہ بن کر ہمارے سامنے آتی ہے لیکن اگر اس کو میں دو اور دو چار لفظوں میں بتا دوں تو بڑی الجھن یہ ہے کہ آپ کہیں گے آپ کہاں مجبوراً لکھتے ہیں۔ وضاحت کے لئے میں ادراک حقیقت کے عمومی مسائل کے تحت اپنی تحریر کے افادی پہلو کو واضح کرتے ہوئے یہ ضرور کہوں گا کہ میں اُس انسان کے لئے لکھتا ہوں جو ایک نہ ایک دن پیدا ہو کر رہے گا۔"[۱۸]

روایتی درخواستوں کے طرز پر حسن مثنیٰ انور نے "اطلاع مزید منسلکہ درخواست مراعات" کے عنوان سے ایک فرضی درخواست رقم کی ہے۔ اس سے ایک پیش نظر ہے:۔

"اس میں شک نہیں کہ میری ACADEMIC QUALIFICATION بھی میری اقتصادی زندگی کی طرح غریب اور کمزور ہے ممکن ہے کہ یہ بات بعض حضرات کی نگاہوں میں کھٹکے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں کمزوریاں لازم و ملزوم ہیں اور CONCESSION کی راہ میں روڑا نہیں اٹکاتیں۔"[۱۹]

اس رسالے میں پروفیسر احمد جمال پاشا کے دو مضامین شامل ہیں: "طرز نگارش میری" اور "کبوتر ایک تنقیدی و تحقیقی مطالعہ"۔ موخرالذکر کا جائزہ ادب لیا گیا ہے۔ اوّل الذکر میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کے طرز میں احمد جمال پاشا نے اُن کے اسلوب سے روشناس کرایا ہے۔ جو نہایت ہی دلچسپ ہے "طرز نگارش میری" سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں:۔

"مجھ سے فرمائش کی گئی ہے کہ میں اپنے آپ کے بارے میں اس وقت آپ سے گفتگو کروں۔ لیکن جہاں میں گفتگو کر رہا ہوں وہاں کی

رسم یہ ہے کہ آپ بھلے مانسوں کی طرح لڑ جھگڑ نہیں سکتے اور نہ بھلے مانسوں کی طرح خاموش رہ سکتے ہیں۔.........

.....مجھے پتھر عزیز نہیں مگر پھول ناگوار۔ سنگسار ہونا گوارا ہے مگر پھول کی چھڑی نہیں۔ پھولوں سے ڈرتا ہوں مگر کانٹوں سے چمٹا رہتا ہوں۔ بظاہر پھولوں کا شوق اور باطن میں کانٹوں کی خلش۔،،

حصۂ نثر کی سب سے آخری کڑی "کتابوں کی باتیں،، ہے جو ادارہ کی طرف سے شامل ہے۔ اس عنوان کے تحت دو کتابوں پر تبصرہ ہے۔ اردو پیروڈی نگاری میں یہ تبصرے انمول رتن کے حامل ہیں۔ اس کے مطالعہ سے ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں۔ پہلی کتاب پر تبصرہ ملاحظہ کریں:۔

" (تبصرے کے لئے ۳ جلدوں کا آنا ضروری ہے)

"خرافاتِ خر"۔۔۔ مصنف حضرتِ خر شکار پوری۔ سائز جہازی۔ صفحے کٹے ہوئے نہیں ہیں۔

قیمت عام پڑھنے والوں سے ۵/- کتب خانوں سے ۳/- پڑھے لکھے اور بنیوں کے لئے مفت۔

مقام اشاعت مہمل بک بائنڈرس اینڈ پبلشرز ان لیمٹڈ

"خرافات خر،، حضرت خر شکار پوری کا مجموعۂ کلام بے لگام ہے۔" نذرانہ چند جملوں میں جناب خر شکار پوری کا تعارف ملاحظہ ہو۔

"حضرت خر سے کون واقف نہیں۔ آپ بہت مضبوط سخن طراز ہیں۔ بلکہ موروثی شاعر ہیں۔ پہلے مراثی کہتے تھے، اب مرثیے کہتے ہیں۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ آپ کل ملا کر سات بھائی تھے۔ سب کے سب شاعری کے مرض میں مبتلا تھے۔ یہ اشعار ہمیشہ قالین کے شعر سمجھے گئے کیونکہ اگر ان کو کمرے کے باہر پڑھ دیا جاتا تو ہنگامہ ہو جاتا۔"[۲۱]

تبصرے کے سلسلے کی دوسری کتاب "شیطان کی کھوپڑی عرف زندہ طلسمات کی آدھی رات کی چیخ،، ہے جس کے مصنف ساحر گوپاموی ہیں آپ سے

نمونہ ملاحظہ ہو:۔

"اس کتاب کو پڑھ کر برسوں آپ اپنے آپ کو اپنے قابو میں نہ رکھ سکیں گے۔ کبھی چیخیں گے، کبھی اُچھلیں گے، کبھی کو دیں گے، کبھی بلا خیال چھپ جائیں گے۔ غرض آپ سخت سنسنی خیز ہو جائیں گے۔ مصنف اس سے قبل اس قسم کے تقریباً ڈھائی سو لاجواب ناول لکھ چکے ہیں۔"

حصۂ نظم میں شوکت تھانوی ("مومن") قمر رئیس ("نذر یشر دیر") قاضی غلام محمد (نیا آدمی نامہ، "مفلسوں کا قومی ترانہ"، "منظومات قاضی"، "آیات حسرت") ضیاء الدین احمد شکیب ("مثنوی بیچ بیان اپنے ہاسٹل کے") عبدالوہاب فرہاد ("نذر غالب") اور بدیع الحسن کلیم کی پیروڈی ("نذر درد ش") شامل ہیں۔

شوکت تھانوی نے علامہ اقبال کی مشہور نظم "مومن" کی پیروڈی بہت ہی خوش اسلوبی سے کی ہے۔ اُسے ایک کامیاب پیروڈی کہنا بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ اصل نظم کی ہیئت اور خارجی ماحول میں کوئی تغیر و تبدل پیدا نہیں ہوتا۔ جس نے ایک بار بھی علامہ اقبال کی نظم "مومن" کا مطالعہ کیا ہوگا اُس کی ذہنی رسائی فوراً اصل کی طرف منتقل ہو جائے گی۔ اور یہی فن پیروڈی کا تقاضہ ہے۔ نظم ملاحظہ ہو:۔

"مومن دنیا میں:۔

کمزور مقابل ہو تو فولاد ہے مومن | انگریز ہو سرکار تو اولاد ہے مومن
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت | اس قسم کی ہر قید سے آزاد ہے مومن
ہو جنگ کا میدان تو اک طفلِ دبستاں | کالج میں اگر ہے تو پری زاد ہے مومن

مومن جنت میں:۔

شکوہ ہے فرشتوں کو کم آمیز ہے مومن | حوروں کو شکایت کہ بہت تیز ہے مومن

اس رسالہ میں شامل تمام تخلیقات منتخب ہیں۔ قاضی غلام محمد کا نام اردو پیروڈی نگاری میں اہمیت کا حامل ہے۔ اردو کے متعدد کلاسیکل شعراء کی مایۂ ناز تخلیقات پر ان کی پیروڈیاں اس رسالہ میں شامل ہیں۔ نظیر اکبر آبادی کی نظم "آدمی نامہ" کی پیروڈی "نیا آدمی نامہ" کا سب سے دلچسپ اور واقعیت سے پُر بند وہ ہے جس

میں کلرک حضرات کی قلعی کھولی گئی ہے۔ یہ دراصل سید محمد جعفری کی "کلرک" کی پیروڈی ہے۔ ایک ہی بند میں کلرک کے سارے جوہر نمایاں ہو جاتے ہیں:۔

جس کی لغت میں 'آج' نہیں ہے کلرک ہے
ہر دم جو یونہی چیں بہ جبیں ہے کلرک ہے
'کل آؤ' جس کا مسلکِ دیں ہے کلرک ہے
رو ڈلیں کا جو مردِ امین ہے کلرک ہے
پر حسنِ اتفاق سے یہ بھی ہے آدمی"

مولانا حسرت موہانی کی غزل "چپکے چپکے رات دن ..... کی مقبولیت سے اس طرح قاضی غلام محمد فائدہ اور لطف اٹھاتے ہیں:۔

تیری فرقت کا مجھے اب تک زمانہ یاد ہے
چمچہ بھر غم ناشتے سے قبل کھانا یاد ہے
تیرے پنشن یافتہ والد کی پرچھائیں سے بھی
سر پہ پاؤں رکھ کے میرا بھاگ جانا یاد ہے
سر کے بل مجھ کو کھڑا کروا کے اپنے سامنے
مل کے غیروں سے ترا تالی بجانا یاد ہے

پروفیسر قمر رئیس نے آل احمد سرور کی غزل "چاند کو چھونے کا قصہ بھول پی جانے کی بات" کی پیروڈی کی ہے۔ اُن کے اس شعر میں کس قدر ندرت و تازگی ہے۔ ایک رومانی سماں بندھ جاتا ہے:۔

ہے یہ ساغر کی، نہ ساقی کی، نہ میخانے کی بات
نشہ ہے اس شوخ کا آنچل سرک جانے کی بات

میر تقی میر نے اپنی مثنویوں مثلاً "گھر کی بربادی" "گھر کا حال" میں اپنے شکستہ اور خستہ گھر کا ذکر کیا ہے۔ ضیاء الدین احمد شکیب نے "بیچ بیان اپنے ہاسٹل کے" کے عنوان سے میر کے طرز کی پیروڈی کی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

[redacted]

۵ کیا کہوں اپنے ہوسٹل کا حال   اس خرابے میں ہیں ہوا پامال
ایک تاریک و تیرہ زنداں ہے   سخت دل تنگ یوسفِ جاں ہے
تارِ برقی سے سقف ہے بدنام   چھت سے آنکھیں لگی رہی ہیں مدام

- - - - - - - -   - - - - - - - -

کہیں مکڑی کے لٹکے ہیں جالے   ہیں کہیں نل کے بے مزہ نالے
ایک کھٹیا جو گھر میں ہے ٹوٹے   سو شکستہ تر از دلِ عاشق
کہیں سوراخ ہیں کہیں چاک   نیند کیا آسکے گی اس میں خاک
اچھے ہوں گے کباڑیے کے گھر   آپ اپنی مثال ہے یہ کھنڈر

عبدالوہاب فرہاد نے غالب کے طرز پر غالب کے اسلوب کی پیروڈی کی ہے۔ جس میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی رہے ہیں:۔

چاہنے سے پہلے سوچا چاہیے
دھو کے منہ آئینہ دیکھا چاہیے
پھر سنبھل کر تم کو کہنا چاہیے

چاہنے اچھوں کو جتنا چاہیے
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے

رسالہ "اسکالر" کے اختتام میں "نار زردش" کے عنوان سے بدیع الحسن کلیم کی پیروڈی شامل ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو:۔

۵ مرا گرچہ کچھ اس میں کٹہ دل نہ تھا
میں قابو میں آنے کے قابل نہ تھا
تڑپنے پھڑکنے کا حاصل نہ تھا

تماشائے بیتابیٔ دل سے نہ تھا
مرا حال ہمرنگ محفل نہ تھا

"اسکالر" کا یہ پیروڈی نمبر اپنے اندر تفہیم پیروڈی کے بے بہا رتن سمیٹے ہوئے ہے۔ اس کے مطالعہ سے انکشاف ہوتا ہے کہ صنف پیروڈی

میں دیگر اصناف ادب کی طرح ہمہ گیری موجود ہے۔ بلکہ میرا خیال ہے ایک اچھی پیروڈی معیاری اور سنجیدہ تخلیق کو ادراک قاری سے ہم آہنگ کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ وجہ ظاہر ہے۔ اس میں "ظرافت کا پیوند" لگا ہوتا ہے اور انسان پیدائشی ظریف ہے۔ پیروڈی کے اندر جو طنز کا عنصر کارفرما ہوتا ہے وہ اصل تخلیق کا اشاریہ ہوتا ہے۔ وہ خالق کے مسلک و منشا کی طرف ذہن کو موڑتا ہے۔ ہر انسانی ذہن غور و تدبر کا قائل نہیں ہوتا، اس لیے پیروڈی خوش ذوقی سے ذہن کو اس طرف منتقل کر دیتی ہے مثلاً علامہ اقبال کے ان اشعار کو شوکت تھانوی اس طرح سہل بنا دیتے ہیں:۔

؎ قہاری و جباری و قدوسی و جبروت
اس قسم کی ہر قید سے آزاد ہے مومن
ہو جنگ کا میدان تو اک طفل دبستاں
کالج میں اگر ہے تو پری زاد ہے مومن

رسالہ "اسکالر —— پیروڈی نمبر" علی گڑھ، میں شامل تمام تخلیقات، تاریخی اور ادبی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس رسالے میں شامل پیروڈی کے ہر طرح کے نمونے پیش کیے گئے ہیں، تاکہ امتداد زمانہ کی گرد انہیں چھپا نہ سکے۔ اس کی تاریخی اہمیت اور افادیت اس وجہ سے اور بڑھ جاتی ہے کہ دبستانِ علی گڑھ نے اردو ادب کو نظم اور نثر میں جو نامور طنز و مزاح نگار دیے ہیں، اُن ناموران علی گڑھ کی موجودہ آخری کڑی احمد جمال پاشا ہیں۔ جو طنز و مزاح کی با سری جہت یعنی پیروڈی کے فن پر "اسکالر"، علی گڑھ میں بہترین نمونے پیش کرتے ہیں۔ اس لیے "اسکالر"، علی گڑھ "پیروڈی نمبر"، کی بھی وہی اہمیت ہے جو علی گڑھ میگزین طنز و مزاح نمبر"، مرتبہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کی ہے۔ اس سلسلے میں "علی گڑھ میگزین —— اکبر نمبر"، مرتبہ ڈاکٹر شبیہہ الحسن نونہروی اور "فکر و نظر۔ رشید احمد صدیقی نمبر"، مرتبہ ڈاکٹر اسلوب احمد انصاری بھی اہمیت رکھتے ہیں۔

"اسکالر"، کا یہ پیروڈی نمبر کتابی سائز پر ہے۔ جو ۱۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

کاغذ اوسط درجے کا ہے، کتابت و طباعت بھی مناسب ہے۔ "اسکالر" کے پیروڈی نمبر میں شوکت تھانوی، کنہیا لال کپور، فکر تونسوی، فرقت کاکوروی، سید احتشام حسین، شفیق الرحمٰن اور ڈاکٹر محمد حسن کے جو پیغامات شامل شمارہ رہ گئے ہیں، ان سبھی میں ایڈیٹر جمال احمد پاشا کو اس بے بہا خدمات پر مبارکباد دی گئی ہے۔ میں فرقت کاکوروی کے اس اقتباس کے ساتھ مقالہ کا اختتام کر رہا ہوں۔

"قبلۂ عالم۔ یہ جو آپ اسکالر نکال رہے ہیں یہ عجب سیتارام قسم کی چیز ہے جو نہ مرد معلوم ہوتی ہے اور نہ عورت یعنی کہ یہ پرچہ انگریزی میں ہے یا اردو میں۔ آپ نے تو اسے ایک عجیب اینگلو انڈین شکل میں پیش کیا ہے۔ اب یہ لکھئے ان کا حسب و نسب کیا ہے۔"[۲۲]

حواشی

۱ اسکالر۔ پیروڈی نمبر، علی گڑھ، مارچ ۱۹۵۷ء (حرف آغاز، (احمد جمال پاشا) صفحہ ۳۔

۲ ایضاً ۔ ’کچھ پیروڈی کے بارے میں‘ (رشید احمد صدیقی) صفحہ ۱۰۔

۳ ایضاً ۔ ’کچھ پیروڈی کے بارے میں‘، صفحہ ۱۰۔

۴ ایضاً ۔ ’پیش لفظ‘، (پروفیسر آل احمد سرور) صفحہ ۷۔

۵ ایضاً ۔ ’پیغامات‘، (شوکت تھانوی) صفحہ ۱۲۔

۶ ایضاً ۔ ’پیغامات‘، (کنہیا لال کپور) صفحہ ۱۲۔

۷ ایضاً ۔ ’پیغامات‘ (شفیق الرحمٰن) صفحہ ۱۲۔

۸ ایضاً ۔ ’پیغامات‘، (پروفیسر محمد حسن) صفحہ ۱۶۔

۹ ایضاً ۔ ’پیروڈی کا فن‘، (پروفیسر قمر رئیس) صفحہ ۲۱۔

۱۰ ایضاً ۔ ’کپور ایک تنقیدی و تحقیقی مطالعہ‘، (احمد جمال پاشا) صفحات ۸۷-۸۶

۱۱ ایضاً ۔ ’کپور ایک تنقیدی و تحقیقی مطالعہ‘، (احمد جمال پاشا) صفحات ۸۹-۸۸

۱۲ ایضاً ۔ دکپور ایک تنقیدی و تحقیقی مطالعہ، (احمد جمال پاشا) صفحہ ۹۵۔

۱۳ ایضاً ۔ دکپور ایک تنقیدی و تحقیقی مطالعہ، (احمد جمال پاشا) صفحہ ۹۴۔

۱۴ ایضاً ۔ خوجی کی واپسی، (مسعود علی ذوقی) صفحات ۳۲-۳۲۔

۱۵ ایضاً ۔ دعوامی ادب میں سماجی شعور، (قمر رئیس) صفحہ ۶۷۔

۱۶ ایضاً ۔ دمیر مہدی کے نام، (ضیاء الدین احمد شکیب) صفحہ ۲۷۔

۱۷ ایضاً ۔ دشاخ آہو، (سبط اختر) صفحہ ۳۷۔

۱۸ ایضاً ۔ دمیں مجبوراً لکھتا ہوں، (ابن فرید) صفحہ ۷۵۔

۱۹ ایضاً ۔ داطلاع مزید منسلکہ درخواست مراعات (حسن مثنیٰ انور) صفحہ ۸۰۔

۲۰ ایضاً ۔ خرافات خر، (ادارہ) صفحہ ۱۱۰۔

محمد اکرام خاں

رہنمائی اور اس کی ضرورت

جس طرح ہماری اور آپ کی زندگی میں بعض اوقات ایسے مسائل پیش آتے ہیں کہ ان کو حل کرنے کے لئے دوسروں کے مشورے اور رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح طلباء کو بھی اکثر ایسے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور وہ انہیں حل کرنے کے لئے اپنے ساتھیوں، والدین اور اساتذہ کے مشورے اور رہنمائی کے محتاج ہوتے ہیں۔ مسائل کو حل کرنے میں بعض لوگ بغیر کسی تجربے اور علم کے مشورہ دیتے ہیں اور بعض اپنی تعلیم اور تربیت کی روشنی میں سائنٹیفک طریقے پر مسائل کو حل کرنے کا طریقہ سمجھاتے ہیں۔ مسائل کو حل کرنے میں باقاعدہ اور منظم شکل میں رہنمائی کرنے ہی سے فائدہ ہوتا ہے۔ طلباء کے مسائل دراصل والدین اور اساتذہ کے مسائل بن جاتے ہیں اس لئے ان کو حل کرنے میں ان دونوں سے زیادہ کوئی اور مفید اور مددگار نہیں ثابت ہو سکتا ہے۔

موجودہ زمانے میں معاشرے کے اندر اقتصادی بحران اور صنعتی ترقی کے سبب روز بروز نت نئے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ مختلف قسم کے معاشرتی تقاضوں اور ضرورتوں نے انفرادی اور اجتماعی زندگی کو مجموعی اعتبار سے بے چین

ڈاکٹر محمد اکرام خاں، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی - ۱۱۰۰۲۵

اور بے قرار بنا رکھا ہے۔ جس کو دیکھتے وہ ذہنی اور جذباتی اعتبار سے مختلف قسم کے مسائل میں الجھا ہوا نظر آتا ہے۔ صورت حال سے مطابقت پیدا کرنے اور روزانہ کے مسائل کو حل کرنے کے بعد پرسکون زندگی گذارنا دشوار ہو گیا ہے تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ سب کا حال یکساں ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ عام زندگی میں جو عدم مطابقت اور بے چینی پائی جاتی ہے اس کے اسباب پر غور کیا جائے۔ کہتے ہیں کہ والدین کے باہمی اختلافات کی فضا میں پروردہ بچہ مدرسے میں جھگڑالو، خودغرض، خاموش یا کمزور بن سکتا ہے۔ ملازمت میں ناخوش اور غیر مطمئن شخص گھر آکر ناخوشگوار فضا پیدا کر سکتا ہے۔ مدرسے کے کاموں میں پیچھے رہنے والا یا نظرانداز کیا ہوا طالب علم گھر جا کر ناپسندیدہ حرکتیں کر سکتا ہے یا اپنے پڑوسی بچوں کو پریشان کر سکتا ہے۔

بظاہر بچوں، بالغوں اور نوجوانوں کے مسائل کا شمار آسان معلوم ہوتا ہے لیکن جب ان کو شمار کرنے بیٹھے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بے شمار ہیں اور نوعیت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف۔ ان میں بعض کا تعلق پیشوں سے ہوتا ہے اور بعض کا تعلیم سے اور بعض سماجی زندگی سے متعلق ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر چند تعلیمی مسائل کو لے لیجئے۔ مثلاً اسکول سے غیر حاضر رہنا۔ اسکول کے کاموں میں دلچسپی نہ لینا۔ گھر کے لئے دئے ہوئے کام کو پورا نہ کرنا۔ اسباق کا مطالعہ نہ کرنا۔ اسکول کے لباس کو گندہ رکھنا۔ اسکول کی عمارت اور تعلیمی سامان کو غلط طریقے پر استعمال کرنا، ساتھیوں کو پریشان کرنا، اسکول کے اندر اور باہر ناپسندیدہ حرکتیں کرنا، امتحان میں ناکام رہنا، چوری کرنا اور جھوٹ بولنا وغیرہ۔

مسائل کی نوعیت اور ان کی اقسام پر غور کرنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح امراض جسانی کے علاج کے لئے مشیر طبی کے مشورے اور رہنمائی پر عمل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اسی طرح طلباء کے مسائل کو حل کرنے کے لئے ہمیں بچے کی نفسیات، تعلیم اور نفسیات تعلیم سے متعلق ماہرین کے مشورے اور رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ عام تعلیمی مسائل کا حل استاد کی رہنمائی میں تلاش کیا جائے اور پیچیدہ مسائل کو حل کرنے میں ماہرین کا تعاون حاصل کیا جائے۔ عام طور سے

اکثر کارکنان تعلیم اس بات پر متفق ہیں کہ تعلیمی رہنمائی میں استاد کا رول ناگزیر ہے۔ اس کی جگہ کوئی اور نہیں لے سکتا ہے۔ اس سے زیادہ کوئی بھی طلبا اور ان کے والدین سے واقف نہیں ہو سکتا۔ تعلیم کی کامیابی اور افادیت کا انحصار استاد کے کام پر ہوتا ہے۔ نصاب تعلیم اور تعلیمی منصوبے خواہ کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں اگر استاد ان کو عملی جامہ پہنانے میں کوتاہی کرتا ہے تو تعلیمی نتائج یقیناً تسلی بخش نہ ہونگے۔ مدرسہ کا پرنسپل اور سپروائزر استاد کے مددگار ہوتے ہیں۔ وہ تدریسی عمل اور تعلیمی منصوبوں کو کامیاب بنانے میں استاد کی مدد کرتے ہیں۔ ماہر رہنمائی جو اپنی مخصوص تعلیم اور تربیت کی بنیاد پر تعلیمی اداروں میں تعینات کئے جاتے ہیں پیچیدہ مسائل کو حل کرنے میں استاد کی مدد سے کامیاب ہوتے ہیں اگر ان دونوں میں صحیح طور پر تال میل نہیں ہوتا ہے تو مسئلہ کا حل تلاش کرنا دشوار ہوگا۔ یہ دونوں باہمی تعاون اور اشتراک عمل کے ذریعے طلبا کی بروقت رہنمائی کر سکتے ہیں اور مدرسے کو خوش اسلوبی اور کامیابی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دینے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔

رہنمائی کی اصل ضرورت انسانیت اور توانائی کے تحفظ کی بنا پر محسوس کی جاتی ہے۔ بچوں میں فطری طور پر انفرادیت کے بجائے یکسانیت ہوتی تو شاید رہنمائی کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ سب بچے پیدائشی اعتبار سے یکساں مستعد، چست وچالاک، ذہین اور ہم مذاق نہیں ہوتے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تعلیم و تربیت کا کام بڑا آسان ہو جاتا سب کے لئے ایک ہی قسم کا نصاب تعلیم اور نظام تربیت مرتب کر دیا جاتا۔ ماہرین نفسیات کی اس تحقیق نے کہ ہر بچہ مختلف قسم کی صلاحیتوں، قوتوں اور دلچسپیوں کا مالک ہوتا ہے اس لئے نصاب تعلیم کا بچے کی صلاحیتوں، قوتوں اور دلچسپیوں پر مبنی ہونا ضروری ہے تاکہ اس کی شخصیت کی پورے طور پر تکمیل ہو سکے، انفرادی توجہ اور رہنمائی کو ضروری بنا دیا ہے۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہر بچہ رابندر ناتھ ٹیگور، علامہ اقبال، مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، مولانا آزاد، ڈاکٹر ذاکر حسین، سروجنی نائیڈو یا اندرا گاندھی نہیں بن سکتا ہے۔ بڑے آدمی فرمائش سے نہیں پیدا ہوتے ہیں۔

وہ اپنے ماحول اور سماج کی پیداوار ہوتے ہیں۔ بچوں میں رابندر ناتھ بھی ہوتے ہیں اور علامہ اقبال بھی، مہاتما گاندھی بھی ہوتے ہیں اور جواہر لال نہرو بھی، مولانا ابوالکلام آزاد بھی ہوتے ہیں اور ڈاکٹر ذاکر حسین بھی، سروجنی نائیڈو بھی ہوتی ہیں اور اندرا گاندھی بھی۔ ان میں فرشتے بھی ہوتے ہیں اور شیطان بھی۔ ہمیں بڑی کوشش اور توجہ سے تلاش کرنا چاہیئے کہ کون کیسا ہے ہماری محبت اور ان کی شخصیت کا احترام ان کی مناسب نشوونما کے لئے ضروری ہے ہمیں ان کی فطرت اور طبعی رجحان کو سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمیں ان کی زندگی کے ہر دور پر مناسب رہنمائی کرنے کی ضرورت ہے۔ ایسا کرنے سے بچوں کی پوشیدہ صلاحیتیں، قوتیں اور دلچسپیاں اجاگر ہوں گی۔ اور وہ صحیح طور پر وہی بن سکیں گے جس کے لئے انہیں پیدا کیا گیا ہے۔

تعلیم کے ذریعے پسندیدہ کردار اور رویے پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اس لئے مناسب رہنمائی کو خاص طور سے ضروری سمجھا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ بچوں کے ان خارجی اور اندرونی محرکات اور اسباب کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے جن کی وجہ سے وہ سماج میں، مدرسے میں یا گھر میں ناپسندیدہ حرکتیں کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں نہایت صبر و تحمل اور انتہائی سوچ سمجھ بوجھ سے کام کرنا ہوتا ہے۔ بچے کو پورے طور پر سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے اور اسے اپنا کردار بدلنے اور رویے کو بدلنے پر آمادہ کیا جاتا ہے۔ دراصل ہمیں بحیثیت استاد اور رہنما اپنے معاشرے اور ماحول کے مشاہدے اور مطالعے کی بنا پر یہ سمجھنا چاہیئے کہ مناسب رہنمائی نہ ملنے کی وجہ سے ہماری کتنی قوتیں اور صلاحیتیں تباہ و برباد ہوتی ہیں۔ ہمارے کتنے نونہالوں اور نوجوانوں کی زندگیاں خاک میں ملتی ہیں۔ والدین اور اساتذہ کی لاعلمی اور لاپرواہی کے سبب ہمارے کتنے بھائیوں اور بہنوں کو بدنصیبی اور بدبختی کا شکار بننا پڑتا ہے۔

رہنمائی کے سلسلے میں اس بنیادی حقیقت کو سمجھنا بھی ضروری ہے کہ انسان فطری طور پر سماجی اور سماجی اعتبار سے دوسروں کا محتاج ہوتا ہے۔ سماج کے

ہر فرد کو زندگی میں کسی نہ کسی موقع پر دوسروں کی مدد اور رہنمائی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے یہ بات دوسری ہے کہ بعض لوگ زندگی بھر دوسروں کی رہنمائی کے محتاج رہتے ہیں اور بعض کسی خاص موقع پر دوسروں کی مدد اور رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ غرض یہ کہ عرصۂ حیات میں باہمی تعاون، اشتراکِ عمل اور رہنمائی کا ہونا لازمی ہے۔

ہمارے بعض مفکرین کا کہنا ہے کہ بچے میں فطرتاً یہ صلاحیت اور قوت ہوتی ہے کہ اگر اسے اپنا مسئلہ خود حل کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہ بغیر کسی خارجی مدد اور رہنمائی کے مسئلہ کا حل تلاش کرسکتا ہے اسے اپنے والدین اور اساتذہ سے صرف ہمدردانہ سلوک، محبت اور ہمت افزائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ تعلیم کا مقصد مستقبل کی تیاری نہیں بلکہ حال سے مطابقت پیدا کرنا اور خوش رہنا ہوتا ہے۔ وہ آج کے تجربے سے کل کو خوشگوار اور کامیاب بنانے کے حق میں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اسلاف سے جو تہذیبی اور تمدنی سرمایہ ورثے میں ملتا ہے اسے تعلیم کے ذریعے نئی نسل تک اس طرح منتقل کیا جائے کہ وہ اسے محفوظ رکھ سکے اور اپنے عمل، اخلاق اور فکر سے اس میں قابلِ قدر اضافہ کرسکے۔ اس قسم کی تعلیم اور تربیت کے لئے مناسب رہنمائی کا ملنا ضروری ہے۔

موجودہ نظامِ تعلیم کی ہر منزل پر رہنمائی کی ضرورت ہے اور اس ضرورت کو خاص طور سے اساتذہ پوری کرسکتے ہیں۔ اساتذہ کی تعلیم کے دوران فنِ تدریس کی تعلیم کی طرح فنِ رہنمائی کی بھی تعلیم ہونی چاہیئے۔ رہنمائی تو دراصل ایک باقاعدہ پیشہ ورانہ خدمت کا نام ہے جس کے ذریعے افراد میں اپنی مرضی کے مطابق موادِ تعلیم کا انتخاب کرنے اور کام کرنے دوسروں کے ساتھ مل جل کر رہنے، سازگار اور ناسازگار حالات سے مطابقت پیدا کرنے، آزادی کے ساتھ راہِ عمل اختیار کرنے اور اپنے ان ذاتی مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے جو انہیں اپنی تعلیم، کام اور زندگی کے دوران پیش آتے ہیں۔ عام طور سے یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ رہنمائی

کا کام افراد کی ذاتی صلاحیتوں، قوتوں اور دلچسپیوں کی روشنی میں کیا جاتا ہے اور اس کام کا خاص مقصد شخصیت کی مکمل نشو ونما اور کامیاب اور خوشگوار زندگی بسر کر سکنے کے قابل بنانا ہوتا ہے۔

محمد سرور (مرحوم)

مولانا محمد سورتی مرحوم

آج کم لوگ ایسے ہوں گے جو مولانا محمد سورتی مرحوم جیسے جید عالم اور بزرگ سے واقف ہوں، ماہنامہ جامعہ کی پرانی جلدیں دیکھ رہا تھا کہ ستمبر ۱۹۴۲ء کے شمارہ میں پروفیسر محمد سرور مرحوم (استاد جامعہ ملیہ اسلامیہ) کا ایک تعزیتی نوٹ سے گزرا۔ جی چاہا کہ اسے آج کے قارئین جامعہ کے لئے شائع کر دیا جائے۔ اس ا کے ساتھ کہ مولانا محمد سورتی مرحوم کے ذاتی کتب خانے کی بہت سی نایاب کتابیں جامعہ کے کتب خانے میں موجود ہیں جو انھوں نے ہدیۃً جامعہ کو تھیں۔ ان میں سے اکثر کتابوں پر مولانا کے بڑے عالمانہ نوٹ بھی ہیں جو وہ ا مطالعے کے دوران عربی میں ان کتابوں کے حاشیوں پر لکھتے جاتے تھے، سے بھی ان کے تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے۔ مولانا کے نجی ذخیرۂ کتب کی ان کت کا علم ہمیں کتب خانے کے موجودہ لائبریرین جناب شہاب الدین انصاری ہوا۔ اس کے لئے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ چند کتابوں کے نام درج ذیل

۱۔ شرح مطالع (اس کے حاشیوں پر مولانا کے نوٹ جابجا درج
۲۔ تاریخ بغداد (خطیب بغدادی)
۳۔ معیار العلم (امام غزالی) اس پر مولانا کے قلم کے نشانا
ہیں۔

۴۔ کتابُ ما بعد الطبیعۃ (ابن رشد) ـــ ارسطو کے بعض مقالات کی تلخیص۔

۵۔ کتاب الاخلاق (محی الدین ابن عربی)

۶۔ مفاتیح العلوم (شیخ ابی عبد اللہ محمد بن احمد بن یوسف الکاتب خوارزمی)

ـــــ مدیر

علی گڈھ سے خبر ملی ہے کہ جامعہ کے پرانے استاد اور عربی زبان کے مشہور ادیب مولانا سید محمد سورتی صاحب انتقال فرما گئے۔ موصوف کو ادھر چند برسوں سے استسقار کا عارضہ تھا۔ پچھلے دنوں معلوم ہوا تھا کہ اب ان کی صحت اچھی ہے لیکن پھر یکبارگی اطلاع آئی کہ مولانا نے سفر آخرت اختیار فرمایا۔

مولانا محمد سورتی صاحب کے انتقال سے عربی علم و ادب کی دنیا کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ عربی ادب میں تو موصوف کے پایہ کا ہندوستان تو کیا شاید ساری عربی دنیا میں کوئی عالم نہ تھا۔ مرحوم کا مطالعہ بڑا وسیع تھا اور نظر بڑی دقیق۔ عربی زبان کی شاید ہی کوئی قابل لحاظ تصنیف ہو گی جو مولانا کی نظر سے نہ گذری ہو۔ موصوف صرف کتابی عالم نہ تھے بلکہ صاحب تحقیق بھی تھے۔ عربی ادب پر ان کو کلی حافظہ تھا۔ جاہلی اور اسلامی دور کے تمام مشہور شعراء کے ہزار ہا اشعار زبان زد تھے۔ مرحوم کے شعر کا مذاق بڑا پاکیزہ تھا اور ہمیشہ بڑے اصرار سے شاگردوں کو اپنی پسند کے شعراء کا کلام پڑھاتے۔ اور مطلق اس کی پرواز کرتے کہ مدرسے کے نصاب میں وہ حصہ موجود بھی ہے یا نہیں۔ پڑھاتے پڑھاتے اگر کوئی غیر معمولی شعر آ جاتا تو مولانا اچھل پڑتے اور بار بار جھوم جھوم کر اسے دہراتے اور اتنے محظوظ ہوتے کہ طالب علم بے ساختہ اس شعر کی داد دینے لگتے۔ مولانا کو علم حدیث سے بھی بہت لگاؤ تھا۔ بخاری کے رجال پر بڑی بصیرت سے محاکمہ کیا کرتے تھے۔ موصوف مذہبًا اہل حدیث تھے لیکن اصول فقہ پڑھنے کی بڑی تلقین فرمایا کرتے۔

اندلس کے مشہور ظاہری عالم ابن حزم سے مرحوم کو بڑی عقیدت تھی، اور ایک زمانے سے ان کے متعلق عربی میں ایک ضخیم کتاب بھی لکھ رہے تھے۔ عام طور پر اور اہل حدیث علمار کے خلاف وہ ابن تیمیہ کے زیادہ معتقد نہ تھے۔ دراصل مولانا کا مسلک قدیم علمار اہل حدیث کا تھا۔ جو قیاس کے مقابلہ میں حدیث کو ترجیح دیتے تھے۔ چنانچہ تقلید و عدم تقلید اور فقہ حدیث کی لفظی بحثوں سے ان کا دامن علم الگ رہا۔

سچ تو یہ ہے کہ حدیث اور علوم دینیہ سے مولانا کا شوق ثانوی حیثیت رکھتا تھا۔ موصوف کا اپنا مضمون تو عربی ادب تھا۔ چنانچہ عربی ادب ساری عمر ان کا اوڑھنا بچھونا رہا۔ ادب میں مولانا کا اپنا ایک خاص مسلک تھا۔ خالص اور بے میل عربی زبان کے وہ عاشق تھے، شعر کو وہ شعر ہی کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ شعر میں معمے اور پہیلیاں کہنے کے وہ سخت خلاف تھے۔ اسی لئے عہد جاہلیت کے شعرا کا کلام ان کو سب سے زیادہ پسند تھا، اور ان میں بھی جو شاعر صحرائی اور بدویانہ زندگی میں زیادہ رچا ہوا ہوتا، مولانا کا ربط اس سے اور بھی زیادہ ہوتا، عہد اموبیہ کے شعرار کو بھی وہ غنیمت مانتے تھے، اور عباسیوں کے ابتدائی عہد کے شروع شروع کے شعر ابشار اور ابونواس وغیرہ کو بھی وہ پڑھنا منظور کر لیتے تھے لیکن بعد میں ادب کے تکلف و تصنع کے دور کے اہل علم اور ارباب شعر کی تصنیفات کو پڑھنا وہ کبھی گوارا نہ کرتے۔ صرف و نحو اور معانی و بلاغت کے علوم میں بھی ان کا نظریہ سادگی پسند تھا۔ وہ تکلف اور پیچیدگی کو خواہ وہ شعر میں ہو یا نثر میں، نحو کے قاعدوں میں ہو یا استعاروں اور تشبیہوں کی قسموں میں دل سے ناپسند کرتے تھے۔ تعجب یہ ہے کہ مولانا مرحوم کو عام طور پر رجعت پسند سمجھا جاتا تھا اور ان کا سارا ذخیرۂ علم بھی زیادہ تر قدیم طرز کا تھا۔ لیکن اس کے باوجود موصوف کا ادب و شعر کا مذاق عہد حاضر کے مصری اور شامی ارباب نقد سے بہت کچھ ملتا تھا۔

راقم الحروف کو دوران قیام مصر میں عربی زبان کے سب سے مشہور ادیب اور نقاد ڈاکٹر طٰہٰ حسین عمید جامعہ مصریہ کے لیکچروں کے سننے کا اتفاق ہوا جو وہ

جامعہ اور بیرون جامعہ میں اکثر دیا کرتے تھے۔ میری حیرت کی انتہا نہ پوچھئے جب میں نے تجدید تفریح کے اس امام کو جو پیرس یونیورسٹی کا ڈاکٹر ہے اور اپنی قدامت دشمنی کی وجہ سے بہت بدنام ہے، ادب و شعر اور علوم معانی و بلاغت اور صرف و نحو کے متعلق کم و بیش وہی باتیں کہتے سنا جو دو برس پہلے ہندوستان میں مولانا سورتی جیسے قدامت پسند اور بقول شخصے کٹ ملا سے جامعہ ملیہ کے درسوں میں سن چکا تھا۔

مولانا کا وطن سورت تھا۔ صغر سنی میں علم کی کشش انہیں دہلی کھینچ لائی۔ مرحوم کبھی کبھی شاگردوں کو اپنے بچپن کے حالات سنایا کرتے فرماتے تھے کہ "ہم تو کل بخارا دہلی کے ارادے سے گھر سے نکل پڑے۔ زاد راہ ہمارے ساتھ صرف اللہ کا نام تھا۔ سورت سے دہلی تک کا اکثر راستہ پیدل طے کیا۔ دہلی پہنچے تو ایک مدرسہ میں جگہ مل گئی۔ ان دنوں کتابیں خریدنا ہماری بساط میں نہ تھا۔ ہم یہ کرتے کہ جس کتاب کی ضرورت پڑتی اس کی نقل کر لیتے۔ اور اکثر تو کتابیں ہمیں ازبر یاد ہو جاتی تھیں۔ اس زمانے میں چاندنی چوک میں سے نہر بہتی تھی۔ اور اسٹیشن کے پاس کی زمین میں سایہ دار درخت کثرت سے تھے۔ ہم سارا سارا دن درختوں کے نیچے مطالعہ میں گزار دیتے۔ پڑھنے سے جی اکتاتا تو دریا تیرنے چلے جاتے۔ چنانچہ تیرنے میں ہمیں اتنی مہارت ہو گئی تھی کہ بھرے دریا میں تیرا کرتے تھے۔" مولانا کہتے تھے کہ "اول اول برسوں تک ہم بڑھا کئے۔ ہم محنت سے اپنے سبق بھی یاد کر لیتے۔ کتابیں کی کتابیں بھی ہمیں حفظ یاد ہو جاتیں۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ ہم یہ سب ایک فرض سمجھ کر کیا کرتے تھے۔ علم کی لذت جو ہمیں بعد میں حاصل ہوئی اس سے ہم شروع میں عرصہ تک بے بہرہ رہے۔ بعد میں جب کامل استادوں سے پڑھا تو پھر محسوس ہوا کہ علم کی لذت کیا ہے اور اس میں کیا لطف ہے۔"

مولانا نے دہلی، ٹونک اور رام پور کے مدرسوں سے بہت کچھ حاصل کیا لیکن ان کے فضل و کمال میں زیادہ تر حصہ ان کے اپنے ذاتی مطالعہ اور شب و روز کی محنت کا ہے۔ ایک زمانہ میں موصوف حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کے ہم سبق بھی رہ چکے تھے۔ حکیم صاحب مرحوم مولانا کی علمیت کے بڑے معترف تھے۔ چنانچہ ۱۹۲۰ء میں

جب علی گڑھ میں جامعہ کی بنا رکھی گئی تو حکیم صاحب کے بلانے پر مولانا جامعہ تشریف لائے اور عربی ادب کی اعلیٰ تعلیم ان کے سپرد کی گئی۔ مولانا جامعہ میں سب کے مخدوم و محترم تھے، ان کے شاگرد تو ان کی عزت کرتے ہی تھے، لیکن دوسرے طلبا اور اساتذہ بھی ان کی بزرگی کا خیال رکھتے، مولانا بڑے سخت متشرع تھے۔ اور عام نشست و برخاست اور وضع قطع میں ذرا سی بھی بے راہ روی ان کو کھلتی تھی چنانچہ اکثر مولانا ایسی باتیں دیکھ کر بگڑ جاتے اور اپنا ڈنڈا اٹھا لیتے جامعہ کے خورد و کلاں ان کی طبیعت سے واقف تھے۔ چنانچہ مولانا کے عتاب پر ان کی گردنیں جھک جاتیں، اور انہیں آئندہ احتیاط کا وعدہ کرنا پڑتا۔ جامعہ کے اساتذہ اور طلبہ سب کے سب مولانا کی باتوں کا برا نہیں مانتے تھے کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ مولانا صاف دلی سے سب کچھ کہہ رہے ہیں۔ کیونکہ وہ ان مکروہات کو دل سے ناپسند کرتے ہیں۔ اور چونکہ وہ سب جامعہ والوں کو اپنا سمجھتے ہیں اس لئے برملا اور بے دھڑک کہہ دیتے ہیں اس میں نخوت یا تکبر کی بو نہ ہوتی تھی، اور نہ کسی پندار زہد کا مظاہرہ، یوں بھی مولانا بڑے خوش طبع تھے، چھوٹے بڑوں سے کھل کر ملتے، ہر ایک سے اپنائیت برتتے، اور جامعہ کی برادری میں وہ یوں معلوم ہوتے تھے کہ گویا وہ بزرگ خاندان ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ جامعہ والے ان کو یوں مانتے بھی تھے۔

جامعہ جب دہلی آئی تو کچھ عرصہ کے بعد بعض مجبوریوں کی بنا پر انہیں جامعہ سے الگ ہونا پڑا وہ مجبوریاں ایسی تھیں کہ ان کا مداوا کسی کے بس کی بات نہ تھی مولانا دل سے نہیں چاہتے تھے کہ وہ جامعہ سے جائیں، اور نہ جامعہ والوں کو مولانا کی علیحدگی گوارا تھی لیکن حالات پر کسی کا زور نہیں ہوتا مولانا جامعہ سے چلے گئے لیکن جامعہ کو بھولے کبھی نہیں، جب کبھی وہ دہلی تشریف لاتے جامعہ میں ضرور آتے۔ ہفتوں مہینوں یہاں ٹھہرتے، اور ان کے آنے کے ساتھ جامعہ میں پھر پچھلی صحبتیں تازہ ہو جاتیں، مولانا کی وہی ڈانٹ، ڈپٹ، برہمی اور عتاب۔ اور ان کے ... کا جواب خیر سے جامعہ میں استاد بن چکے ہیں۔ نیازمندی میں آنکھیں نیچی ... لیتا ...

گردن جھکا لینا۔ مولانا کی ذات بڑی بابرکت ذات تھی۔ ان کے اٹھ جانے سے علم و ادب کو جو صدمہ ہوا وہ تو ہوا لیکن جامعہ کی برادری کو بھی ان کے گزرنے سے کم نقصان نہیں پہنچا۔ مولانا کی ذات ایسی تھی جس کی ہم سب عزت کرتے تھے۔ ایسے شخص جماعت میں بہت کم ہوتے ہیں۔ اور ان میں سے کسی کے جانے کا صدمہ واقعی بڑا جان کاہ ہوتا ہے۔

مولانا نے کوئی قابل ذکر تصنیف نہیں چھوڑی۔ وہ مطالعہ میں اتنے منہمک رہتے تھے کہ تصنیف کے خیال کی انہیں کبھی فرصت نہ ملی۔ معلومات کا ذخیرہ اتنا وسیع تھا کہ اسے سمیٹنے کی اور اسے ترتیب دے کر کتاب کے قالب میں ڈھالنے کی کبھی کوشش نہ کی۔ ابن حزم پر انھوں نے کچھ لکھا تھا۔ لیکن شاید ہی اسے کوئی شائع کرے۔ لیکن مولانا کا قابل فخر کارنامہ ان کی مشہور کتابوں کی تصحیح ہے جن میں سے بعض حیدرآباد سے چھپ چکی ہیں، مرحوم قدیم قلمی نسخوں کے بڑے پرکھنے والے تھے۔ جامعہ میں آنے سے پہلے ان کا یہی مشغلہ تھا، پرانی کتابوں کی تلاش میں وہ کتب خانوں کو چھانتے پھرتے اور اگر کہیں انہیں کوئی نادر چیز مل جاتی تو اسے حاصل کرتے، اسے دیکھتے بھالتے، اس کی تصحیح کرتے، چنانچہ بڑے بڑے معاوضہ پر سرکاری کتب خانے ان سے یہ نادر نسخے خریدتے تھے، مولانا کا اپنا ذاتی کتب خانہ بھی تھا جس میں امید ہے بڑی نایاب اور نادر کتابوں کے نسخے ہوں گے۔ مولانا کو کتابوں سے عشق تھا، اچھی کتاب کے حاصل کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے تھے۔

الغرض مولانا ایک خوش طبع اور زندہ دل بزرگ تھے۔ اور عربی کے ایک بے نظیر عالم اور محقق، علم کے سچے عاشق اور قدیم اسلامی تصنیفات کے بہترین ناقد اور ادب شناس کار۔ ان کمالات کے حامل اب کہاں ملتے ہیں۔ اس لئے مولانا ایسے بزرگ اور عالم کا انتقال صحیح معنوں میں ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ کسی نے کتنا ٹھیک کہا ہے۔ موتُ العَالِم موت العَالَم (صاحب علم کی موت ایک عالم کی موت ہے۔)

تبصرہ وتعارف

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری ہے)

نام کتاب: توضیحی فہرست کتب خانہ ہمدرد اشاعت ہائے خاص اردو رسائل

نام مرتب: حکیم نعیم الدین زبیری

ناشر: ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، ہمدرد سنٹر ناظم آباد کراچی ۱۸ (پاکستان)

قیمت: پینتالیس ۴۵ روپے

مغربی دنیا ہو یا اسلامی دنیا، دینی تحریکیں ہوں یا سماجی، سائنسی پیش رفت ہو یا ایجاد و اختراع کی اطلاعات، یہ سب کتابوں میں شامل ہونے سے پہلے رسائل میں منعکس ہوتی ہیں، اس لئے اردو کے معاملے میں بھی رسائل و جرائد کی خدمات خصوصی اہمیت رکھتی ہیں۔ یہاں فکر و خیال کی ترویج اور معلومات کی اشاعت میں رسائل کتابوں سے زیادہ کارآمد ثابت ہوئے ہیں۔ کتاب کی اہمیت اپنی جگہ ہے کہ سنجیدہ فکر، عمیق مطالعے، نئے نتائج کے اخذ و استنباط اور علمی گیرائی و گہرائی کے نتیجے میں کتابیں لکھی جاتی ہیں، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان سب کے لئے طویل وقت درکار ہوتا ہے۔ لیکن رسائل کا معاملہ مختلف ہے اور ان کے ذریعے معاشرہ تازہ افکار و معلومات سے روشناس ہوتا ہے۔ اردو ادب خاص طور پر رسائل ہی کے توسط سے نئے خیالات، جدید رجحانات اور نئے اسالیب سے روشناس ہوا۔ اسی طرح ادبی، علمی، ثقافتی اور سماجی میدانوں میں مغربی رجحانات سے متعارف کرانے میں اردو رسائل نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ دوسری زبانوں کے شہ پارے اردو میں منتقل کرنے کے محرک بھی رسائل ہیں۔

لیکن افسوس کہ ان رسائل کی زندگی کتابوں کی بہ نسبت بہت کم ہوتی ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان تک رسائی مشکل ہوتی جاتی ہے۔ کتابوں کے مقابلے میں رسائل کو محفوظ رکھنے پر بہت کم توجہ دی جاتی ہے۔ افراد کا تو ذکر ہی کیا، بہت کم کتب خانے ایسے ہوں گے جو ان کا باقاعدہ فائل رکھتے ہیں اور جن کتب خانوں میں اس کا انتظام ہے بھی تو وہاں یہ فائلیں صرف الماریوں کی زینت بنی رہتی ہیں، اس لئے کہ وہاں ان کا باقاعدہ کیٹلاگ نہیں ہوتا نتیجتاً قاری محض اندازے کے سہارے ادھر ادھر مطلوبہ موضوع پر مضمون کی تلاش کرتا ہے اور تھک ہار کر مایوس ہو جاتا ہے۔ چنانچہ کتب خانوں کی فہرستوں (کیٹلاگس) کی ترتیب و اشاعت قارئین کے علاوہ کتب خانوں کا بھی حق ہیں، ورنہ کتب خانوں کی افادیت اور دائرہ فیض محدود رہتا ہے۔ اس اہمیت کو کتب خانہ ہمدرد (کراچی) کے منتظمین نے بھی محسوس کیا اور اس کی طرف عملی قدم اٹھایا۔ اس سے قبل جناب فضل اللہ فاروقی نے اس کتب خانے کے طبّی مخطوطات کی توضیحی فہرست (جلد اول) مرتب کی تھی اور اب حکیم نعیم الدین زبیری نے اس کتب خانے میں شامل اردو رسائل کے خاص شماروں کی ایک توضیحی فہرست مرتب کی ہے جو کہ پیش نظر ہے۔

اس توضیحی فہرست میں تقریباً بارہ سو خاص نمبروں کا تعارف کرایا گیا ہے اور تعارف کراتے وقت قاری کے ذہن میں کسی رسالے سے متعلق اٹھنے والے مختلف سوالات کو پیش نظر رکھا گیا ہے مثلاً رسالے کے نام کے علاوہ خاص نمبر کا موضوع یا عنوان، مدیر کا نام، تواتر اشاعت، تاریخ اشاعت، جلد و شمارہ نمبر، صفحات کی تعداد، خاص خاص مضامین، مضمون نگاروں کا نام وغیرہ سبھی کو شامل کیا گیا ہے۔ نمونے کے طور پر سہ ماہی ثقافت اسلام آباد کا تعارف پیش کیا جاتا ہے جو اس طرح ہے:

سہ ماہی ثقافت اسلام آباد: اقبال نمبر' جلد ۲ شمارہ ۷۰ ، ۱۹۷۷ء۔ ۹۱ ص۔
مدیر: اشفاق سلیم۔
خاص خاص مضامین: علامہ اقبال کا نظریہ دعا، سی اے قادر ———

اقبال اور عطیہ بیگم، عبدالسلام خورشید ـــــ اقبال اور عصر حاضر، فتح محمد ـــــ جاوید نامہ، محمد ریاض ـــــ اقبال کا فلسفۂ تعلیم و تربیت، سلیم خاں ـــــ اقبال اور اسلامی ثقافت کی روح، سجاد حیدر ـــــ اقبال کی شعری علامتیں، تبسم کاشمیری ـــــ برصغیر میں جدید مسلم الٰہیات کی تشکیل، قاضی جاوید ـــــ قومی کردار فکر اقبال کے تناظر میں، رشید امجد ـــــ بلوچستان اور اقبال، عنایت اللہ بلوچ ـــــ رسالے کا ششماہی اشاریہ ـــــ

بلاشبہ یہ توضیحی فہرست اردو والوں کے لئے ایک نعمت اور دیگر کتب خانوں کے ذمہ داروں کو اس کام کو آگے بڑھانے کا محرک ثابت ہوگی۔ امید ہے کتب خانہ ہمدرد کی وہ دیگر توضیحی فہرستیں اور اشاریے بھی جلد ہی منظر عام پر آئیں گے جس کا وعدہ اس کتاب کے 'حرف اول' میں کیا گیا ہے۔

نام کتاب : کتب خانہ داری ـــــ ایک تعارف
نام مصنف : شہاب الدین انصاری
ناشر : ترقی اردو بیورو، نئی دہلی
قیمت : چوبیس روپے

آج کے متمدن زمانے میں کتب خانے ایک ناگزیر ضرورت کی حیثیت رکھتے ہیں اور کسی بھی ملک کی علمی، سائنسی، صنعتی سماجی غرضیکہ ہر میدان میں ترقی کے لئے خام مال ان کتب خانوں سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ ان کی تاریخ تنظیم اور ان کا دائرۂ کار، ان سے استفادہ کے امکانات اور ان امکانات میں وسعت کی گنجائش ـــ ان سب کا مطالعہ نہ صرف علم کتب خانہ داری کے طالب علم کے لئے ضروری ہے بلکہ ایک عام تعلیم یافتہ فرد کے لئے بھی ضروری ہے تاکہ وہ اس اہم سماجی ادارے سے پوری طرح مستفید ہو سکے۔

پیش نظر کتاب جین کے۔ گیٹس کی مشہور انگریزی تصنیف انٹروڈکشن ٹو لائبریرین شپ

کو بنیاد بنا کر لکھی گئی ہے اور ہندوستانی کتب خانوں کی موجودہ صورت حال کو ہر ہر جگہ ملحوظ رکھا گیا ہے۔ فاضل مصنف ملک کے بعض ممتاز کتب خانوں میں ذمہ دار عہدوں پر کام کر چکے ہیں اور کافی مدت سے ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری، جامعہ ملیہ اسلامیہ، کے لائبریرین ہیں، اس لحاظ سے کتب خانہ داری سے متعلق ان کا علم محض نظری ہی نہیں ہے بلکہ انہیں اس کا وسیع عملی تجربہ بھی ہے۔ وہ ان مشکلات سے بھی آگاہ ہیں جس سے آج کے ہندوستانی کتب خانے اور ان سے استفادہ کرنے والے دوچار ہیں۔ کتاب کی تصنیف کے دوران انھوں نے اپنے اس تجربے سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے اور اسی کے ساتھ حتی الامکان یہ کوشش بھی کی ہے کہ فنی اصطلاحوں کے استعمال کے باوجود جن سے گریز ناگزیر ہے عبارت اس قدر مغلق نہ ہو جائے کہ عام قاری جو فن کتب خانہ داری سے ناواقف ہے اکتاہٹ محسوس کرنے لگے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کتاب ایک عام قاری کے لئے بھی اسی قدر مفید ہے جتنی اس فن سے باقاعدہ شوق رکھنے والے کے لئے ذیل میں کتاب کے مشمولات کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے جس سے اس کی افادیت کا بخوبی اندازہ ہو سکے گا۔

پوری کتاب تین حصوں میں تقسیم ہے۔ حصہ اول کے تحت پہلے کتب خانوں کے تاریخی مطالعے کی اہمیت و ضرورت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور پھر کتب خانوں کی مفصل تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اس میں عہد عتیق کے کتب خانوں سے لے کر موجودہ دور تک کے کتب خانوں کا عہد بہ عہد تاریخی تجزیہ کیا گیا ہے۔

حصہ دوم کے کچھ عنوانات یہ ہیں: کتب خانے ــــ اقسام، اسکول کتب خانہ، اسکول کتب خانے امریکہ میں، اسکول کتب خانے برطانیہ میں، اسکول کتب خانے ہندوستان میں، تعلیمی اداروں کے کتب خانے، کالج کتب خانے، یونیورسٹی کتب خانے، یونیورسٹی کتب خانے برطانیہ میں، ہندوستان۔ یونیورسٹی کتب خانے، تحقیقی اداروں کے کتب خانے، خاص کتب خانے، ایسلب یعنی ایسوسی ایشن آف اسپیشل لائبریریز اینڈ انفارمیشن بیورو، انڈین ایسوسی ایشن آف اسپیشل لائبریریز اینڈ

انفارمیشن سنٹرس، قومی کتب خانے، امریکہ لائبریری آف کانگریس، قومی کتب خانہ برائے طب، قومی زرعی کتب خانہ، برطانیہ ــ برٹش لائبریری، ہندوستان ــ قومی کتب خانہ، سنٹرل ریفرنس لائبریری نیشنل سائنس لائبریری، قومی طبی کتب خانہ انسڈاک، سینڈاک، نسات، سائنسی اور تکنیکی معلومات ہندوستان میں۔

حصہ سوم کے عنوانات یہ ہیں: کتب خانہ داری پیشہ ورانہ تنظیم، ممالک متحدہ امریکہ، برطانیہ، ہندوستان، علم کتب خانہ داری کی تعلیم و تربیت، ہندوستان، علم کتب خانہ داری کے ماخذ و مواد، کتب خانہ کے کام، کتب خانہ اور عمل خودکاری، مستقبل کی سمت، کل کے لائبریرین، سماج میں کتب خانہ کا مقام، یونیسکو منشور برائے کتب خانہ۔

انگریزی اور دوسری زبانوں میں اگرچہ کتب خانہ داری سے متعلق خاصی تعداد میں کتابیں موجود ہیں لیکن اردو میں ابھی تک کوئی اتنی جامع کتاب موجود نہ تھی۔ دو ایک کتابیں جو پہلے سے موجود ہیں وہ کتب خانے کے کسی ایک پہلو سے ہی بحث کرتی ہیں اور وہ بھی اتنے اختصار کے ساتھ کہ تشنگی محسوس ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ کتاب اردو میں لائبریری سائنس پر پہلی باقاعدہ اور جامع کتاب کہی جاسکتی ہے۔ کتابت اور طباعت میں ترقی اردو بیورو نے اپنی روایتی بے توجہی سے بس غالباً قارئے ہی انحراف کیا ہے۔

نام کتاب : عکس آئینہ (شعری مجموعہ)
نام مصنف : غوث محمد غوثی
ملنے کے پتے : (۱) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ شمشاد مارکیٹ علی گڑھ۔
(۲) غوث محمد غوثی، سرائے رحمٰن علی گڑھ۔
قیمت : پینتیس ۳۵ روپے۔

قاضی عبدالستار نے جذبی اور اختر انصاری کے بعد غوثی کو علی گڑھ کا تیسرا

بڑا شاعر قرار دیا ہے۔ بظاہر یہ بات مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہے، اس لئے کہ اگر وہ واقعی اس درجہ کے شاعر ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ ان کو وہ شہرت نصیب نہ ہو سکی جو ان سے کمتر درجے کے شاعروں کو حاصل ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ وہ عصری ادبی گروہ بندیوں سے آزاد رہنے کے قائل ہیں۔ اسی لئے ان کا کلام بھی آج کل کے معیاری ادبی رسالوں میں جو گروہ بندی کا شکار ہیں، کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ قاضی صاحب نے سچ ہی کہا ہے کہ شہرت وہ حق ہے جو کبھی کبھی حقدار کو بھی دیر سے ملتا ہے اور غوثی اس دیر رسائی کی بہترین مثال ہیں۔ قطع نظر شہرت کی س بحث کے اگر غوثی کے شعری مجموعہ عکس آئینہ کا جائزہ لیا جائے تو قاضی صاحب کی اس بات میں کافی وزن معلوم ہوتا ہے۔ وہ پہلے شاعر ہیں جو ونی مدعلی گڑھ کے زائیدہ اور پروردہ ہیں اور شعری مجموعوں کی دنیا میں لی گڑھ کے دبستان شعر کے پہلے نمائندے کی حیثیت سے خود کو روشناس کرا رہے یا۔ ان کے کلام میں روایت کے احترام کے ساتھ نئے تجربوں سے آگاہی بھی تی ہے۔ اس طرح وہ نہ صرف قدیم و جدید کا سنگم ہیں بلکہ ان دونوں دھاروں کے امکانات سے باخبر بھی ہیں۔ ڈاکٹر مظفر حنفی نے بجا فرمایا ہے کہ "جدید ننے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے یہ معلوم ہو کر پرانا کیا ہے۔ اصطلاحوں میں ت کرنی ہو تو کہہ لیجئے کہ روایت سے مکمل آگہی کے بغیر جدیدیت کا تصور ہی حال ہے۔۔۔ غوثی اپنی شاعری میں اسی راہ پر گامزن ہیں۔ وہ خود کو روایتی عزل کا پروردہ کہنے میں عار محسوس نہیں کرتے اور زمانے کی بدلتی ہوئی اقدار سے روگردانی بھی ان کے تئیں نامناسب ہے۔" خود غوثی نے اپنے اس انداز توسیع روایت' کا نام دیا ہے۔ غوثی کے فن تک رسائی مشکل ہے جب تک ری تغزل کی روایت سے آشنا اور اپنے عہد سے باخبر نہ ہو۔ شاید یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور کی غزل کے ایک معتبر شاعر بشیر بدر نے ان کو غوث الادب، خطاب دیا ہے۔ غوثی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور اس کا وہ اعتراف ا کرتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ انھوں نے دیگر اصناف سخن میں بھی کامیاب

شاعری کی ہے۔ ان کا مجموعہ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۸۴ء تک کا احاطہ کرتا ہے۔ ہر نظم، غزل کے آخر میں انھوں نے تاریخ بھی درج کردی ہے جس سے ان کے ذہنی ارتقار کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ کتاب کے شروع میں "احوالِ واقعی" کے تحت اپنا مختصر سا تعارف کرایا ہے اور اس کے بعد پروفیسر قاضی عبدالستار، ڈاکٹر وحید اختر، سید رفیق عزیزی، ڈاکٹر بشیر بدر، ڈاکٹر مظفر حنفی نے غوثی کی شاعری کے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ کتابت و طباعت معیاری اور دیدہ زیب ہے۔ بلاشبہ غوث محمد غوثی کا یہ مجموعہ شعری ادب میں ایک خوشگوار اضافہ ہے اور شاعری کی نئی جہتوں سے روشناش کراتا ہے۔ "مشتے از خروار" نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

لبِ فرات عجب شانِ سرفرازی ہے
گماں تھا، دشت میں نیزوں کے سر نکل آئے

دنیا میں جو امرت ہے مل بانٹ کے پی جاؤ
ہم وقت کے شنکر ہیں پی جائینگے سم تنہا

فرازِ دار ہو یا طورِ سینا
محبت تو بلندی چاہتی ہے

چاند کہلا کے وہی خوش ہوں، میں جگنو ہی بھلا
للہ الحمد، مری اپنی چمک ہے مجھ میں

دلِ باغی میں ہم روحِ محبت پھونک دیتے ہیں
ذرا شائستہ ہے یارو مذاقِ انتقام اپنا

سر پہ سورج تو ہمارے بھی تھا، لیکن ہم پہ
اُسی بے سایہ کا سایہ تھا جہاں تک پہنچے

مجھ پہ یہ طرفہ ستم ہے کہ مری بربادی روشنی میں مرے احباب کو لے آئی ہے

آگے ملنے سے پہلے کیوں نہ مل کر دیکھ لیں دل کے تہ خانے میں کوئی چور دروازہ نہ ہو

نام کتاب : کلکتہ کے قدیم اردو مطابع اور ان کی مطبوعات۔ ایک تذکرہ
نام مصنف : سیّد مقیت الحسن
ملنے کا پتہ : عثمانیہ بک ڈپو ۴۴-الو پیت بور روڈ (رابندر اسرانی) کلکتہ ۷۳
قیمت : پچیس ۲۵ روپے

سائنس اور صنعت و حرفت کی ترقی سے ہندوستان کے جو شہر اول اول فیضیاب ہوئے ان میں کلکتہ سرفہرست ہے۔ اسی کے ساتھ وہ اہل علمی، ادبی و صحافتی سرگرمیاں دوسرے علاقوں سے زیادہ نظر آتی ہیں۔ کلکتہ کی ان دونوں خصوصیات نے مل کر علم و ادب پھیلانے کے لئے مختلف مطابع قائم کرنے کی راہ ہموار کی۔ عربی و فارسی رسم الخط میں ٹائپ کے حروف سب سے پہلے کلکتہ میں ہی ۱۷۸۰ء میں ایجاد اور استعمال ہوئے۔ اسے سر چارلس ولکنس نے ایجاد کیا تھا۔ پیش نظر کتاب 'کلکتہ کے قدیم اردو مطابع اور ان کی مطبوعات ۔ ایک تذکرہ' میں سید مقیت الحسن صاحب نے بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ کلکتہ کے ایسے ہی ابتدائی مطبعوں کا تعارف کرایا ہے۔ ان مطبعوں کے مالکوں، کارکنوں اور ان کی مطبوعات کے بارے میں انتہائی مفید معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے اٹھارہویں، انیسویں اور بیسویں صدی کے بھی بہت سے ایسے ممتاز اشخاص کے بارے میں تفصیلات فراہم کی ہیں جنھوں نے کسی نہ کسی طرح ان مطبعوں کو شروع کرنے اور رواج دینے میں کوشش کیں۔

تعارف اور دیباچہ کے علاوہ کتاب جن مضامین کا احاطہ کرتی ہے وہ ہیں۔ قدیم مطابع اور ان کی مطبوعات، شخصیات اور ادارے (تعارفی خاکے)، فہرست

مطبوعات کلکتہ بقید سال طباعت (۱۹۰۰ – ۱۸۰۰ء)، اس کے علاوہ کتاب کے آخر میں ایک بھرپور کتابیات اور اشاریہ بھی موجود ہے۔ جن مطابع کا مصنف نے ذکر کیا ہے ان میں سے چند یہ ہیں: کوپر پریس، تھامسن اینڈ فیریس پریس، ایسٹ انڈیا کمپنی پریس، ہندوستانی پریس، بپٹسٹ مشن پریس، ایشیاٹک لیتھو گرافک پریس، میڈیکل پریس، مطبع منظہر العجائب، مطبع ایڈوکیشن، مطبع اخوان الصفار، مطبع نجم السعادۃ، مطبع غوثیہ، مطبع سلطان الاخبار، کرانیکل پریس، مطبع سلطانی، مطبع آفتاب عالمتاب، سریرام پور پریس وغیرہ۔ ہر مطبع کے ضمن میں اس کی مطبوعات میں سے بعض کے سرورق کا فوٹو بھی مصنف نے شائع کیا ہے۔

غرضیکہ کتاب بڑی محنت اور کاوش سے لکھی گئی ہے اور اردو ادب خصوصاً تاریخ اردو ادب کی تحقیق سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے افادیت کی حامل ہے۔ لیکن واقعات و حقائق کی چھان بین میں جن ماخذوں کے حوالے دیے گئے ہیں وہ سب کے سب مستند نہیں ہیں۔ بعض واقعات کی کسی دوسرے معتبر ماخذ سے تصدیق ضروری تھی۔ کتابت و طباعت مناسب ہے، اور قیمت بھی مشمولات و مواد کو دیکھتے ہوئے کچھ زیادہ نہیں ہے۔

محمد عرفان

ادبی و تہذیبی خبریں

ہندی کے مشہور ادیب اور کانگریس ممبر پارلیمنٹ شری کانت ورما کا ۲۵ر مئی کو نیویارک کے ایک ہسپتال میں انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۵۵ برس تھی۔ وہ یہاں کینسر کے علاج کے لئے آئے ہوئے تھے اور گذشتہ مارچ کی ۱۲ تاریخ کو ان کا آپریشن ہوا تھا۔ ڈاکٹروں نے ان کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر ناکام رہے۔ ۲۷ر مئی کی رات کو تقریباً ساڑھے گیارہ بجے ان کے جسد خاکی کو ائر انڈیا کے جہاز کے ذریعہ نیویارک سے دہلی لایا گیا اور اگلے روز یعنی ۲۸ر مئی کی شام ساڑھے چھ بجے نگم بودھ گھاٹ دہلی پر ان کی آخری رسوم ادا کی گئیں۔

شری کانت ورما ۱۸ر ستمبر ۱۹۳۱ء کو مدھیہ پردیش کے شہر بلاسپور میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد رام کشور ورما زمیندار اور وکیل تھے۔ بچپن میں ہی ان کے دل میں یہ خواہش جڑ پکڑنے لگی کہ وہ دوسروں سے مختلف اور ممتاز نظر آئیں۔

۱۹۵۰ء میں زمینداری کے خاتمے کے وقت جبکہ ان کی عمر ۲۰ برس تھی خاندانی شان و شوکت کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ انھوں نے کسی طرح بی۔ اے کیا اور تلاش معاش میں بمبئی چلے گئے لیکن ناکام ہو کر پھر بلاسپور آ گئے اور یہاں ایک ہائی اسکول کے ٹیچر کے طور پر اپنے کیریر کا آغاز کیا یہیں پرائیویٹ طور پر انھوں نے ہندی میں ایم۔ اے بھی کیا۔ خاندانی ماحول ہمیشہ اردو کا رہا تھا جس کی وجہ سے انہیں اردو سے کافی لگاؤ ہو گیا تھا اور شاید یہی لگاؤ تھا

کراب سے کچھ عرصہ پہلے انھوں نے اپنا ہندی مجموعہ کلام مگدھ اردو رسم الخط میں بھی شائع کیا۔ ستمبر ۱۹۵۶ء میں وہ دہلی آ گئے اور بھارتیہ شرمک، میں معاون مدیر کے طور پر کام کرنے لگے۔ اسی دوران انھوں نے ایک ادبی مجلہ دکرتی، نکالنا شروع کیا، جو ۱۹۶۲ء تک شائع ہوتا رہا۔ ۱۹۶۵ء میں جب ساپتاہک دنمان، شروع ہوا تو شری کانت ورما اس کے معاون مدیر ہو گئے اور بعد میں وہ اس کے خصوصی نمائندے کے طور پر کام کرنے لگے۔ دنمان، سے تعلق کے بعد ان کا جھکاؤ سیاست کی طرف ہونے لگا اور وہ سیاسی امور پر اپنی رائے کا بے باکانہ اظہار کرنے لگے۔

۱۹۶۷ء تک شری کانت ورما ہندی ادب کو اتنا کچھ دے چکے تھے کہ کسی بھی تذکرے میں ان کو نظر انداز کرنا ناممکن تھا۔ یہ وہ دور تھا جسے ناشاعری کا دور کہا جاتا ہے۔ اور شری کانت ورما کو جاریہ ہندی شاعری کا آخری شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کی مطبوعات کی تفصیل اس طرح ہے:

سنواد، گھر، جھنی ہوئی کہانیاں، دوسرے کے پر (افسانوں کے مجموعے)

جل ساگر، مایا درپن، مگدھ (شعری مجموعے) دوسری بار (ناول) اور اے پورٹریٹ آف راجیو گاندھی (انگریزی میں) اس کے علاوہ انھوں نے دوسری زبانوں سے متعدد ترجمے بھی کیے۔

کنڑ کے مشہور ادیب اور گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ ڈاکٹر ماستی وینکٹیشور آئنگر کا ۶ جون کی صبح کو جو کہ ان کا ۹۶ واں جنم دن بھی تھا انتقال ہو گیا۔ ڈاکٹر ماستی جن کا قلمی نام سری نواس تھا ۹۵ برس کے تھے۔ ان کی آخری رسوم پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ ولسن گارڈن شمشان گھاٹ پر ادا کی گئیں۔

ان کی تخلیقات کی تعداد ۱۱۸ تھی جس میں افسانوں اور شاعری کے مجموعے، ناول، ڈرامے، سوانح عمریاں سبھی کچھ شامل ہیں۔ ان کے ناول چکّا ویرا راجندر پر ان کو گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ اس وقت جامعہ ستمبر ۱۹۸۳ء میں شذرات کے تحت ان پر بھرپور نوٹ شائع کیا گیا تھا۔

راجیہ سبھا کے لئے جن پانچ ممبروں کو حکومت نے نامزد کیا ہے۔ ان میں پنجابی کی مشہور شاعرہ امرتا پریتم، احمد آباد کی ممتاز سماجی کارکن ایلا رمیش بھٹ، معروف ناول نگار آر کے نارائن، ستار نواز پنڈت روی شنکر اور مشہور آرٹسٹ فدا حسین شامل ہیں۔

---

۳ رمئی کی شام کو آل انڈیا رائٹرس اینڈ جرنلسٹ فورم کی دہلی شاخ کے زیر اہتمام نگم رنگ شالہ ٹاؤن ہال دلی میں ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی یاد میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا جس کی صدارت وزیر مملکت برائے ٹیکسٹائل جناب خورشید عالم خاں نے فرمائی اور جناب یشپال کپور نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ اس موقع پر جناب کرنل بشیر حسین زیدی نے ذاکر صاحب کی تصویر کی گل پوشی کی۔ جن حضرات نے تقریریں کیں ان کے نام یہ ہیں:

مالک رام، بیگم صالحہ عابد حسین، گلزار دہلوی، عبداللطیف اعظمی اور کرنل بشیر حسین زیدی۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے ذاکر صاحب کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

صدر جلسہ جناب خورشید عالم خاں نے کہا کہ شخصیتیں پیدا ہوتی ہیں اور ایک دن تاریخ کے گرد و غبار میں گم ہو کر رہ جاتی ہیں لیکن بعض شخصیتیں خود تاریخ بناتی ہیں۔ ذاکر صاحب کی شخصیت بلاشبہ ایک تاریخ ساز شخصیت تھی۔ ان کی یاد کو تازہ رکھنا اپنی تاریخ کو زندہ رکھنے کے مترادف ہے۔

خدا بخش لائبریری پٹنہ میں مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی کے مخطوطات شناس محمود قیصر صاحب نے علی گڑھ کے فارسی نوادر پر ایک مقالہ پیش کیا۔ اس سے قبل وہ عربی نوادر پر بحث کر چکے تھے۔ فارسی کے اہم مخطوطات کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ علی گڑھ میں ایسے بہت

سے نسخے ہیں جن پر جہانگیر کے ہاتھ کی تحریر ہے۔ ایک جگہ احمد خاں بنگش کی تحریر بھی ملتی ہے۔ ایک مخطوطہ پر حیدر علی سلطان میسور کی تحریر ملتی ہے۔ اورنگ زیب کی مہریں بھی بہت سے نسخوں پر ہیں۔ انھوں نے حافظ کے اس دیوان کا بھی ذکر کیا جو مشہور کاتب سلطان علی مشہدی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ انھوں نے اخی جمشید راجگیری کے ملفوظات اور رسائل کا ذکر کیا۔ یہ راجگیر بہار کے بجائے قنوج کے نواح کا راجگیر ہے۔ اخی جمشید اپنے عہد کے اہم صوفیا میں سے تھے۔ ایک مخطوطہ مولوی غلام یحییٰ بہاری کے مشہور رسالے کلمۃ الحق کا ہے جو اس لئے اہم ہے کہ اس کے حاشیے پر مظہر جان جاناں کی اپنی تحریر ملتی ہے۔ مظہر جان جاناں کی ایک تحریر پروفیسر خلیق احمد نظامی کے ذاتی ذخیرے میں بھی موجود ہے۔

وزیر اعظم جناب راجیو گاندھی نے ۱۶ جون کو نئی دہلی میں اردو کمپیوٹر کا افتتاح کیا۔ اس موقع پر انھوں نے کہا کہ کوئی بھی ملک صرف اسی وقت ترقی کرتا ہے جب وہ اہل علم و دانش کو ترقیاتی کوششوں میں شریک کرتا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے ہر زبان اور ثقافت کو مساوی مواقع دیئے جاتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ صرف مشین آ جانے سے ترقی نہیں ہو جاتی بلکہ ترقی کرنے کے لئے اس مشین کا صحیح استعمال بھی ضروری ہے۔

ماہنامہ جامعہ

مدیر: ضیاء الحسن فاروقی   مدیر معاون: عبداللطیف اعظمی

شمارہ ۸	بابت ماہ اگست ۱۹۸۶ء	جلد ۸۳

ماہنامہ جامعہ کا مجیب نمبر

جامعہ کے گزشتہ شماروں میں اعلان کیا جاتا رہا ہے کہ ماہنامہ جامعہ سابق شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب مرحوم کی یاد میں ایک خصوصی شمارہ شائع کر رہا ہے۔ اس خاص نمبر کی کتابت مکمل ہو چکی ہے اور جلد ہی یہ منظر عام پر آجائے گا دو حصوں پر مشتمل اس خاص نمبر میں جو مضامین شائع ہو رہے ہیں ان کی ایک جھلک یہاں پیش کی جا رہی ہے۔ حصہ اول کے تحت مندرجہ ذیل مضامین ہیں:

۱۔ مجیب صاحب کی خود نوشت سوانح

۲۔ مجیب صاحب مرحوم۔ ایک یاد جو آتی رہے گی۔ (پروفیسر علی اشرف)

۳۔ مجیب صاحب اور بھابی آصفہ۔ کچھ یادیں، کچھ باتیں (بیگم صالحہ عابد حسین)

۴۔ میاں جان (پروفیسر محمد امین)

۵۔ مجیب صاحب کے بعد (نظم) (پروفیسر انور صدیقی)

۶۔ پروفیسر محمد مجیب۔ میرے شریف ترین دوست (کے۔ پی۔ ایس مینن)

۷۔ مجیب صاحب ۔ شخصیت کے چند دلکش پہلو (جناب شمس الرحمٰن محسنی)
۸۔ مجیب صاحب ۔ بحیثیت مسلم دانشور (پروفیسر اولاد احمد صدیقی)
۹۔ روسی ادب (ضیاء الحسن فاروقی)
۱۰۔ مجیب صاحب کی ڈرامہ نگاری (پروفیسر شمیم حنفی)
۱۱۔ دنیا کی کہانی مجیب صاحب کی زبانی (ڈاکٹر سید نقی حسین جعفری)
۱۲۔ نگارشات ۔ مجیب صاحب کے منتخب مضامین کا مجموعہ (ڈاکٹر انیس الرحمٰن)
۱۳۔ مجیب صاحب ۔ ایک فکر انگیز شخصیت (پروفیسر سید جعفر رضا بلگرامی)
۱۴۔ مجیب صاحب کا ایک تاریخی خط
۱۵۔ گاندھی جی کی معنویت مجیب صاحب کی نظر میں (محمد عرفان)
۱۶۔ تعلیمی مواقع کی برابری واہمہ یا حقیقت (ڈاکٹر سلامت اللہ)
۱۷۔ مجیب صاحب کی تعلیمی فکر (جناب عبداللہ ولی بخش قادری)
۱۸۔ مجیب صاحب شخصیت اور اسلوب نگارش (عبداللطیف اعظمی)
۱۹۔ پروفیسر محمد مجیب صاحب کے چند مذہبی پہلو (جناب محمد عبدالملک جامعی)
۲۰۔ مجیب صاحب میرے مشفق استاد (جناب عبدالرحمٰن ناصر اصلاحی جامعی)

حصہ دوم میں مجیب صاحب کے جو مضامین شامل ہیں ان کے عنوان حسب ذیل ہیں:

ایک تصویر، ڈاکٹر اقبال، ہندوستان میں اسلامی تہذیب، تعلیم اور مستقبل ۔ پروفیسر شیر انگر (۱۸۸۲ء ۔ ۱۹۶۳ء) کا ایک خطبہ، قومی یک جہتی، عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ، گاندھی جی کہاں ہیں؟ غالب پر ایک نظر، اچھے مسلمان کا تصور، رمضان علی، امراؤ جان ادا، جامعہ کالج کی تاریخ اور اس کی اہمیت، امیر خسرو، تہذیب، ہمارے رسولؐ اور ہم، میری کوئی ماں نہیں ہے (نامکمل ڈرامے کا ایک سین)

ان مضامین کے علاوہ مجیب صاحب کی کئی تصویریں اور ان کی تحریروں کے عکس بھی اس خاص نمبر میں شامل ہیں۔

ایک درخواست

اگر کوئی صاحب مندرجہ ذیل اشعار کے بارے میں حوالے کے ساتھ بتا سکیں کہ یہ اشعار کن شعرا کے ہیں، تو ممنون ہوں گا:

رشکِ کعبہ کو ہے، حسرتِ زدۂ شوق ہے دیر
عمر بربادِ خراباتِ کہاں گذری ہے

بیا بہ گوشۂ آں چشمِ مست جا کردہ
چو زاہدے کہ بہ بزمِ شراب می آید

محمد عرفان
ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ،
جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

وفات کی خبریں

عالم اسلام اور اخوان المسلمون کے ممتاز رہنما اور مصر کے معروف ماہر قانون شیخ عمر تلمسانی کا ۱۴ رمضان المبارک مطابق ۲۲ مئی ۱۹۸۶ء کو ۸۲ سال کی عمر میں طویل علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔

شیخ عمر تلمسانی کی پیدائش ۴ نومبر ۱۹۰۴ء کو ایک ایسے خاندان میں ہوئی تھی جو الجزائر کے شہر تلمسان سے فرانسیسی قبضے (۱۸۳۰) کے بعد قاہرہ ہجرت کر گیا تھا۔

انھوں نے قاہرہ یونیورسٹی سے ۱۹۳۱ء میں قانون کی ڈگری لی اور وکالت شروع کی۔ ۱۹۳۳ء کے اوائل میں وہ اخوان المسلمون کی تحریک میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۵۴ء میں جمال عبد الناصر کے قتل کی سازش کے الزام میں انھیں ۱۵ برس کے لئے قید کر لیا گیا مگر جولائی ۱۹۷۱ء سے قبل ان کو رہائی نصیب نہ ہوئی۔ ۱۹۷۳ء میں اخوان المسلمون کے مرشد عام شیخ حسن الہضیبی کی وفات کے بعد مرشد عام منتخب ہوئے۔ وہ اخوان المسلمون کے مجلہ الدعوہ کے اجراء (۱۹۷۶ء) کے وقت سے اس پر پابندی لگنے تک (۱۹۸۱ء) اس کے ایڈیٹر بھی رہے۔ ۲ ستمبر ۱۹۸۱ء کو انھیں پھر گرفتار کر لیا گیا اور بعد میں اسی سال ۲۷ دسمبر کو رہا کر دیا گیا۔

شیخ عمر تلمسانی کی تحریروں کا بڑا حصہ الاخوان المسلمون کی مدافعت

میں ہے۔

---

۲۷ رمئی ۱۹۸۶ء کی شب میں تقریباً ڈھائی بجے مشہور اسلامی مفکر و محقق پروفیسر اسماعیل راجی الفاروقی اور ان کی اہلیہ (ڈاکٹر لوائے لامیہ) کو امریکہ کے مشہور شہر فلاڈلفیا میں شہید کر دیا گیا۔ اس موقع پر ان کی صاحب زادی بھی شدید زخمی ہوئیں۔ شہادت کے وقت پروفیسر الفاروقی کی عمر ۶۵ سال اور ان کی اہلیہ کی عمر ۶۰ سال تھی۔

پروفیسر الفاروقی مغربی ممالک کے اسلامی حلقوں میں بڑی اہمیت کے حامل تھے اور خاص طور سے امریکہ میں دینی دعوت و تبلیغ کے روح رواں تھے۔ وہ ٹمپل یونیورسٹی (فلاڈلفیا) میں ڈپارٹمنٹ آف ریلیجن میں پروفیسر تھے جہاں انھوں نے اسلامیات سے متعلق متعدد پروگرام شروع کر رکھے تھے۔ اس سے قبل انھوں نے الازہر (قاہرہ) میکگل یونیورسٹی (مانٹریال) اور سیراکیوز یونیورسٹی (امریکہ) میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیئے تھے۔ پروفیسر الفاروقی میکگل میں مدیر جامعہ کے استاد رہ چکے تھے۔ وہ صحیح معنوں میں فاروقی النسل فلسطینی عرب تھے اور اپنی شخصیت اور قابلیت سے عیسائی علمی ماحول میں اسلام کا دفاع بڑے جوش اور خلوص سے کرتے تھے۔ وہ عقیدے کے اعتبار سے ایک کٹر مسلمان تھے امریکہ میں انھوں نے اسلامی بیداری کا کام جس ہمت، سلیقے اور تدبر سے آگے بڑھایا اس کی بنا پر اسلامی دنیا انھیں ہمیشہ یاد رکھے گی۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان، عیسائی اور یہودی ایک دوسرے سے قریب آئیں اور اس کے لئے انھوں نے تینوں مذاہب کے عالموں کے مابین "ڈائی لاگ" کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا۔ نیویارک میں انھوں نے ایک ادارہ انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ کے نام سے قائم کیا تھا۔ مسلم سوشیولوجسٹ کی بھی ایک تنظیم قائم کی تھی، اور صدر ایوب کے زمانے میں وہ کراچی میں تحقیقات اسلامی

کے انسٹی ٹیوٹ میں بھی رہ چکے تھے، شخصیت ان کی بڑی باغ و بہار تھی، دونوں میاں بیوی جنھیں رمضان شریف کے مہینے میں شہادت کی سعادت حاصل ہوئی، مصنف تھے، ڈاکٹر لامیہ نے اسلامی آرٹ میں تخصص اور شہرت حاصل کی تھی، بڑی مہمان نواز اور شریف شخصیتیں تھیں دونوں۔ اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں ان کے مراتب بلند کرے۔ ساری علمی اور اسلامی دنیا کا غم تو یہ ہے ہی مدیر جامعہ کا یہ ذاتی غم بھی ہے۔

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے

اردو کے نامور صحافی مولانا محمد مسلم، طویل علالت کے بعد ۳ جولائی کو دہلی میں ۶۵ سال کی عمر میں وفات پاگئے۔ مرحوم تیس سال تک روزنامہ دعوت دہلی کے مدیر اعلیٰ رہے اور سہ روزہ و ہفت روزہ 'دعوت' کی بھی ادارتی ذمہ داریاں ادا کیں۔ وہ بورڈ آف اسلامک پبلی کیشنز کے سکریٹری بھی تھے جس کی جانب سے انگریزی ہفت روزہ 'ریڈینس' شائع ہوتا ہے۔ ان کا شمار جماعت اسلامی کے صف اول کے رہنماؤں میں ہوتا تھا اور وہ کافی عرصہ جماعت کی مجلس شوریٰ کے رکن بھی رہے۔ وہ کل ہند مسلم مجلس مشاورت کے ایک فعال رکن تھے اور علمی دینی اور رفاہی اداروں سے وابستہ تھے۔ مرحوم کا آبائی وطن بھوپال تھا مگر ان کی عملی زندگی کا بڑا حصہ دہلی میں گزرا۔

ممتاز مجاہد آزادی اور صف اول کے قومی رہنما بابو جگجیون رام کا ۶ جولائی کی صبح تقریباً دس بج کر بیس منٹ پر نئی دہلی کے ڈاکٹر رام منوہر لوہیا اسپتال میں انتقال ہوگیا جہاں وہ کچھ عرصے سے زیر علاج تھے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۷۸ برس تھی۔ ان کی آخری رسوم پورے قومی اعزاز کے ساتھ ان کے آبائی گاؤں چندوا (بہار) میں ۸ جولائی کو ادا کی گئیں۔ جن میں صدر جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ، وزیر اعظم جناب راجیو گاندھی اور دیگر

وزرا اور قومی رہنماؤں نے شرکت کی۔

بابو جی نے اپنی تمام عمر ملک و قوم کے لئے وقف کر دی تھی، انھوں نے حکومت ہند کے وزیر دفاع اور وزیر خوراک کی حیثیت سے خصوصی طور پر شہرت حاصل کی اور ان کی رہنمائی میں کئی عہد آفریں کام انجام پائے۔ وہ عمر بھر پس ماندہ اقوام کی فلاح و بہبود کے لئے کوشاں رہے۔ ان کے انتقال سے ملک ایک تجربہ کار سیاستداں اور غریبوں اور پچھڑے ہوئے لوگوں کے ممتاز رہنما سے محروم ہو گیا ہے۔

تصحیح

ماہنامہ جامعہ بابت جولائی ۱۹۸۶ء کے شذرات میں صفحہ ۵ پر غلطی سے ۱۸۵۸ء کے بجائے ۱۶۵۸ء چھپ گیا ہے۔ ناظرین اس کی تصحیح فرمالیں۔

(ادارہ)

REGD.NO.D.(S.E.).108 VOL:83 NO.8 AUGUST 1986

THE MONTHLY JAMIA

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی
مطبوعہ: جمال پریس دہلی

ماہنامہ جامعہ (ضمیمہ)

مدیر: ضیاءالحسن فاروقی ❖ مدیرمعاون: عبداللطیف اعظمی

شمارہ ۹	بابت ماہ ستمبر ۱۹۸۶ء	جلد ۸۳

ماہنامہ جامعہ کا مجیب نمبر
جس کا سب کو شدید انتظار ہے

ماہنامہ جامعہ کے مجیب نمبر (خصوصی شمارہ) کے فہرست مضامین کی ایک جھلک ہم نے رسالے کے اگست ۸۶ء کے شمارے میں پیش کی تھی اور یہ امید ظاہر کی تھی کہ یہ خصوصی شمارہ جلد ہی شائع ہوگا۔ خیال تھا کہ ہم اسے ستمبر و اکتوبر کے مشترک شمارے کے طور پر ستمبر کے پہلے ہفتہ میں نذر قارئین کرسکیں گے۔ لیکن ”اے بسا آرزو کہ خاک شدہ“ کاتب، مطبع، دہلی کے غیر یقینی حالات اور عید بقر عید کے موقع پر ہفتہ عشرہ تک مسلمانوں کا مگن رہنے کی روایت سب ہماری خواہش کی تکمیل کا راہ کا روڑا بن گئیں۔ کاتب صاحب نے جو ویسے خاصے تجربہ کار ہیں، غضب یہ کیا کہ کاپیوں کی تصحیح کے سلسلے میں ایسی لئی کا استعمال کیا کہ پلیٹوں پر دھبے آگئے۔ نتیجتہً سنگ سازی میں خاصا وقت لگ رہا ہے، اور اس کا اندیشہ لگ رہا ہے کہ طباعت اچھی نہ ہوسکے گی۔ مطبع کے کارکن زائد وقت میں کام کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں، ان حالات میں تاخیر یقینی ٹھہری۔

ہماری غلطی یہ تھی کہ یہ جانتے ہوئے کہ ملک اور سماج کے جو حالات ہیں اور جن میں

کوئی کام متعینہ پروگرام کے مطابق پورا کرلینا تقریباً ناممکن سا ہوگیا ہے، ہم نے مجیب نمبر نکالنے کا اعلان کردیا، اب زمانہ ایسا ہے کہ آپ کسی سے متعلق یقین کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ وقت پر کام مکمل کرے گا۔ موجودہ حالات میں ہم جیسے پرانی قدروں کے لوگ بھی بے بس ہوکر رہ گئے ہیں۔ بہرحال، صورت یہ ہے کہ تین سو چوالیس (۳۴۴) صفحے کا یہ شمارہ جس میں سولہ بلاک ہوں گے، انشاء اللہ اکتوبر ۸۶ء کے پہلے ہفتہ میں ہمارے دفتر سے پوسٹ کیا جائے گا، (دعا فرمائیے کہ ہم اپنے ارادے میں کامیاب رہیں۔)

پہلے یہ خیال تھا کہ مجیب نمبر کی ضخامت ڈیڑھ سو یا اس سے کچھ زیادہ صفحات کی ہوگی، اس لیے قیمت چھبیس روپے رکھی گئی تھی۔ لیکن کتابت کی تکمیل کے بعد معلوم ہوا کہ رسالہ جامعہ کے سائز کے ۳۴۴ صفحات ہوں گے، اس پر مستزاد ۱۶ صفحے بلاک کے یعنی ضخامت کل تین سو ساٹھ صفحوں کی ہوگی، اس بنا پر یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ اب جامعہ کے مجیب نمبر کی قیمت پینتیس روپے ہوگی قارئین اور ایجنسیاں نوٹ فرمالیں۔

ہم پچھلے کئی شماروں میں یہ گزارش کرچکے ہیں کہ ہمارے مستقل خریدار یا وہ حضرات جو یہ خصوصی شمارہ ہم سے خریدنا چاہتے ہوں، رجسٹرڈ پوسٹ کی قیمت مبلغ پانچ روپے ایڈوانس بھیج دیں تاکہ انھیں یہ بیش قیمت شمارہ ضرور موصول ہوجائے۔ ہم نے یہ بھی لکھا تھا کہ کسی کو ڈاک کی بدنظمی سے اگر یہ شمارہ نہ ملا تو ہم پر اس کی ذمہ داری نہ ہوگی اور اس کے بدلے دوسری کاپی (بشرطیکہ اسٹاک میں ہوئی) اس شمارے کی مطبوعہ قیمت بذریعہ منی آرڈر موصول ہونے ہی پر روانہ کی جاسکے گی۔ ابھی تک صرف چوبیس حضرات نے ہماری اس گزارش کو درخور اعتنا تصور کیا ہے۔ بہرحال اب بھی وقت ہے۔ جلد از جلد پانچ روپے رجسٹری کے بھیجیے اور اپنا شمارہ محفوظ کرالیجیے۔ آپ اپنے ڈاکیے کو بھی ابھی سے تاکید کردیں۔ جو لوگ مستقل خریدار نہیں ہیں وہ چالیس روپے بذریعہ منی آرڈر بھیجیں۔

٭

محمد عبدالملک جامعی

جامعہ ملیہ کو مولانا محمد علی کا آخری پیام

۱۹۲۹ء کا واقعہ ہے، انگلستان کے بہت مشہور مقرر اور اپنے مذہب کے عظیم مبلغ مسٹر اسٹینلی جونس اچانک جامعہ میں آدھمکے۔ اسٹاف کو بڑی پریشانی ہوئی۔ ان کی تقریر کا جواب کون دے گا، ذاکر صاحب موجود نہیں تھے۔ عابد صاحب تھے مگر وہ خطیب نہیں تھے بہرحال تدبیر سمجھ میں آگئی۔ مولوی شفیق الرحمٰن قدوائی دوڑے ہوئے مولانا محمد علی کی طرف گئے اور ان کو لے آئے۔ جامعہ کے بڑے جلسے اور تقریریں اس زمانے میں کتب خانہ میں ہوا کرتے تھے۔ لوگ وہیں جمع ہو گئے۔ جونس صاحب نے تقریر فرمائی اور اس میں مثال اور حکایت کے طور پر تین راستوں کا ذکر فرمایا۔ ایک سونے کا، ایک چاندی کا اور ایک لوہے کا، ان کو اختیار کرنے کے لیے اور ان کے نتائج۔ تقریر کمال خطابت کے ساتھ ختم ہوگئی۔ اب مولانا اٹھے اور فرمایا: شفیق مجھے بلانے گئے تھے۔ انھوں نے آواز دی۔ مسٹر جونس آئے ہیں۔ میں نے کہا: "جونس تو سینکڑوں ہیں کون جونس ہیں" اب میں یہاں آیا تو معلوم ہوا کہ جناب تشریف لائے ہیں۔ پھر فرمایا کہ آپ نے جن تین راستوں کا ذکر فرمایا ہے۔ سونے کا ہو، یا چاندی کا، لوہے کا ہو یا کسی اور دھات کا، ہم ان سے بے نیاز ہیں اور اسی کی ساری دنیا کو دعوت دیتے ہیں۔ پھر یہ آیت شریفہ پڑھیں "قُل اِنَّ صَلوٰتی ونُسکی ومَحیای ومَماتی لِلّٰہِ ربِّ العالمین، لاشریکَ لہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرتُ

مولانا محمد عبدالملک جامعی، پوسٹ بکس نمبر ۲۷۴، مدینہ منورہ، سعودی عرب۔

[redacted]

وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْن، اور دیر تک اس کی تشریح وتفصیل فرماتے رہے۔ بعد ازاں سراسٹینلی صاحب تشریف لے گئے۔ جلسہ برخاست ہوگیا مگر مولانا تشریف فرما رہے اس زمانہ میں ہمارے یہاں ڈائس تو بڑی چیز ہے، میز کرسی بھی نہیں ہوتی تھی۔ بس ایک چوکی لائبریری میں پڑی رہتی تھی کہ کوئی آدمی بیٹھ کر کتاب پڑھنا چاہے تو پڑھ سکے، یہی اس وقت کام آئی۔ مولانا نے اس وقت مولانا اسلم کو اپنے پاس بلایا اور پتہ نہیں کلیلہ و دمنہ کا ذکر کیوں آگیا دیر تک اس پر گفتگو ہوتی رہی، مسٹر جونس کے جانے کے بعد مولانا نے مشنریز کے طریقوں اور ان کی چالاکیوں کا ذکر فرمایا۔ اسی سلسلہ میں اس مشہور روایت کا بھی ذکر کیا لیکن اس مشنری کا نام لے کر جس کے ساتھ یہ بات منسوب ہے، کہ جب وہ مدتوں ہندوستان میں کام کرنے کے بعد انگلستان واپس گیا اور لوگوں نے پوچھا تم نے کتنے مسلمانوں کو عیسائی بنایا۔ تو اس نے جواب دیا تھا: عیسائی تو میں نے ایک مسلمان کو بھی نہیں بنایا مگر ایک ایسا تخم چھوڑ کر آیا ہوں کہ اس کے بارآور ہونے پر کوئی مسلمان اپنے عقیدہ میں راسخ نہیں رہ سکتا۔

مسٹر جونس اپنی تبلیغ کے لیے آئے تھے مولانا نے اس کا رخ اسلام کی طرف پھیر دیا۔ اور اس کو توحید کی بھرپور دعوت دی، ہمارے ہاں اس وقت چائے پانی کا بھی کوئی رواج نہیں تھا، مولانا اٹھے اور اسٹاف کے اکثر ممبر ساتھ چلے۔ عابد صاحب سیدھے ہاتھ کو تھے تو شفیق صاحب بائیں جانب۔ عابد صاحب ہی غالباً اس زمانہ میں شیخ الجامعہ تھے۔ یعنی ذاکر صاحب کی نیابت کر رہے تھے۔ مولانا ان سے جامعہ کے عام حالات پوچھتے رہے اردو اکیڈمی کا حال پوچھا اور پھر فرمایا میں کسی چیز کا ممبر ہونا نہیں چاہتا مگر اکیڈمی کا ممبر ضرور رہنا چاہتا ہوں، پچیس روپے اس کی فیس مجھ سے ہر سال منگا لیا کرو۔ کتب خانے سے نکل کر راستہ میں یہ بات چیت ہوئی۔ اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں۔ مگر قدرت کا یہ عجیب کرشمہ تھا کہ اس بہانے مولانا جامعہ میں تقریر کے لیے تشریف لائے۔ اور اپنا آخری پیغام دے کر چلے گئے۔

۵

ذاکر صاحب مرحوم کی یاد

(میں ذاکر صاحب مرحوم سے راشٹرپتی بھون میں صرف ایک بار ملا، اور دس پندرہ منٹ میں کئی طرح کی باتیں ہوئیں، میں ایک 'فریادی' کا معاملہ بھی لے کر گیا تھا، میں نے اس کا ذکر کیا تو فرمایا:)

میں نے اسی وقت فائل منگا کر دیکھ لیا تھا۔ میں نے کہا کہ آپ کو معاملات کی فائلیں دیکھنے کی بھی فرصت مل جاتی ہے۔ کہنے لگے: ہاں۔ اس قسم کے فائل زیادہ نہیں ہوتے۔ مہینے میں چار پانچ ہی ہوتے ہیں۔ میں نے ایک سوال اور کر دیا۔ 'ویسے آپ دن بھر کیا کرتے ہیں؟' کہنے لگے: ایک بیکار سے کام میں لگا رہتا ہوں۔ وہ کیا؟ یہی کاغذات پر دستخط کرنا۔

پھر خود ہی ایک تعلق کی بات چھیڑ دی۔ آپ نے ایک دفعہ سعیدہ (ذاکر صاحب مرحوم کی بڑی بیٹی) کو ایک پنج سورہ دیا تھا۔ وہ سعیدہ سے میں نے لے لیا۔ پھر اس کی جلد بندھوائی اب اس کو ساتھ رکھتا ہوں۔ یہ بات ایک بار ہماری شاگرد اور ہماری بہن سعیدہ نے بھی کہی تھی۔ (لیکن مجھے یاد نہیں رہا تھا۔)

عبدالوہاب (میرا بیٹا جو میرے ساتھ تھا) سے باتیں کرتے رہے۔ دوسرے بچوں کے بارے میں پوچھتے رہے، والد صاحب کے بارے میں پوچھا، جس طرح وہ ہمیشہ پوچھا کرتے تھے۔ عرب میں میرے مشاغل کے بارے میں پوچھا۔ میں نے دو بار اجازت لینی چاہی مگر اٹھنے نہیں دیا، تیسری بار حالات کا اندازہ کر کے میں اٹھ ہی گیا۔ اس وقت انھوں نے فرمایا کہ مجھے اس وقت ایک جگہ جانا ہے، اور ظاہر ہے کہ ان معاملات میں ان کو ایک ایک لمحے کا پاس کرنا ہوتا ہوگا۔

چلتے چلتے پھر انھوں نے دعا کی درخواست کی اس لاحقہ کے ساتھ کہ "آپ نیک آدمی ہیں"۔ بہرحال، یہ ان کا طریقہ ہے کہ دعا کا وعدہ لے لیتے ہیں، بلکہ ایک مرتبہ تو مضمون حدیث کے مطابق فرمانے لگے: دیکھئے، اپنی دعا کے قبول ہونے کی سب سے اچھی ترکیب یہ ہے کہ غیبت میں دوسروں کے لئے دعا کرے۔

(جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخلہ ۳ر اگست ۱۹۲۶ء کو ہوا تھا)۔ سب سے پہلے ذاکر صاحب سے

ملاقات ہوئی" کہ وہی شیخ الجامعہ تھے اور داخلہ کے لئے ان ہی کے پاس جانا ضروری تھا۔ ذاکر صاحب میں یہ کمال میں نے دیکھا کہ ہر طالب (علم) ان کا مطلوب تھا، اور اس کی سرفرازی ان کا مقصود تھی۔ "ڈاکٹر صاحب اہل قلم تھے، اس زمانے میں بچوں کے لئے بھی کہانیاں اور مضمون لکھتے تھے۔ ان کے ایک ایک حرف کو لوگ قیمتی جانتے تھے۔ جو لکھ گئے وہ شاہکار ہے، ایک دفعہ پڑھ لیجئے اور مفتوں لطف لیتے رہیئے اور کیا انھیں ایک کام تھا؟ درحقیقت ہر روز دسیوں کام اور ایک سے ایک اہم کام مگر منظور نظر اور مشغول قلب ان کا طالب علم تھا۔ یہ ان کی زندہ تصنیف تھی۔ طالب علم سے تعلق پیدا کرنا اور اس کی تعلیم و تربیت اور اس کے اپنے مقصود کو اپنا مقصود بنا لینا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

ادبی و تہذیبی خبریں

۳۰ر جولائی ۱۹۸۶ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں مشہور مجاہد آزادی اور ٹریڈ فیڈ استفارٹی آف انڈیا کے چیئرمین جناب محمد یونس کی کتاب قیدی کے خط (دوسرا ایڈیشن) سے متعلق ایک نشست منعقد ہوئی۔ اس موقع پر جناب محمد یونس کے علاوہ مرکزی وزیر اور امیر جامعہ جناب خورشید عالم خاں، شیخ الجامعہ پروفیسر علی اشرف، کرنل بشیر حسین زیدی، مدیر جامعہ اور جامعہ کے اور بہت سے سینیئر حضرات نے شرکت کی۔ اس موقع پر امیر جامعہ نے جناب محمد یونس صاحب کا استقبال کیا اور ان کا حاضرین سے تعارف کرایا۔

جناب محمد یونس نے حاضرین کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے کتاب اور اس کے پس منظر کی وضاحت کی اور اس ضمن میں بہت سی پرانی یادوں کو بھی تازہ کیا، خاص طور پر ان دنوں کا تذکرہ کیا جب وہ سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں کے ساتھ جنگ آزادی کے کاموں میں شریک تھے۔

خدابخش لائبریری پٹنہ میں عربی کے جو نوادر ہیں ان میں کئی ایسے ہیں جو عرب ملکوں میں بھی نہیں پائے جاتے۔ کچھ عرصہ قبل کویت کے ادارۂ مخطوطاتِ عربی کی جانب سے ایک ماہر مخطوطات ہندوستان آئے تھے۔ انھوں نے ہندوستان کے عربی مخطوطات پر ایک رپورٹ تیار کی تھی۔ اس رپورٹ میں جو اسی ادارہ کی جانب سے شائع کی گئی ہے، خدابخش لائبریری میں موجود ابونصر اسماعیل بن حماد الجوہری کی کتاب الصحاح کا خصوصی طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ یہ نسخہ لغت کے فن میں ہے اور دو جلدوں

Regd. No. D-(S.E.)-708 Vol. 83 No. 9 Sept. 86

THE MONTHLY JAMIA

میں ہے ۔ اس نسخے کی اہمیت یہ ہے کہ یہ بغداد کی مشہور درس گاہ نظامیہ میں لکھا گیا تھا یہ وہی معروف درسگاہ ہے جہاں امام غزالی، شیخ سعدی، شیخ عبدالقادر سہروردی اور شیخ عمادالدین موصلی جیسے علماء و فضلاء نے تعلیم حاصل کی تھی ۔

گزشتہ دنوں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اردو نصاب کی تشکیل جدید پر کل ہند سہ روزہ سیمینار ہوا۔ اس کا افتتاح کرتے ہوئے مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب سید ہاشم نے اردو زبان کی مقبولیت کا احساس دلاتے ہوئے کہا کہ اردو نہ صرف عام بول چال کی زبان ہے ، بلکہ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور سینما کی زبان بھی ہے ، اور ہمیں اردو کا مجاور بننے کے بجائے اس کا مجاہد بننا چاہیئے ۔ انھوں نے یاد دلایا کہ عثمانیہ یونیورسٹی میں کس طرح ایک لشکری، شاعری اور حسن و عشق کی زبان کو ترقی دیکر یونیورسٹی کی زبان بنا دیا گیا تھا اور ۳۰ سال کی انتھک کوششوں کے بعد سائنسی مضامین کو بھی اس زبان میں منتقل کر دیا گیا تھا ۔

اس سیمینار کا انعقاد یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے تعاون سے کیا گیا تھا ۔ صدارت جناب خواجہ احمد فاروقی نے کی اور مندوبین نے مندرجہ ذیل عنوانات پر تبادلہ خیال کیا :

۱۔ موجودہ نصاب کا تنقیدی جائزہ
۲۔ زبان و ادب کی تدریس میں درپیش مسائل اور انکا حل۔
۳۔ نصابات میں علاقائی رنگ و آہنگ کی ضرورت
۴۔ اردو نصابات کا دوسری علاقائی یا عالمی زبانوں کے ادب سے رشتہ
۵۔ ملک کے موجودہ تقاضے اور اردو نصابات
۶۔ سماجی معنویت اور پیشہ ورانہ تعلیم کی نسبت سے اردو نصابات
۷۔ معیاری نصاب اور اس کے اغراض و مقاصد۔

طابع و ناشر : عبداللطیف اعظمی
مطبوعہ : جمال پریس دہلی

سالانہ قیمت ۱۵ روپے

جامعہ

قیمت فی شمارہ ڈیڑھ روپے

جلد ۸	بابت ماہ نومبر ۱۹۸۶ء	شمارہ ۱۱

فہرست مضامین

مجلس ادارت

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

مدیر معاون

عبداللطیف اعظمی

خط وکتابت کا پتہ

ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

طابع وناشر: عبداللطیف اعظمی مطبوعہ جمال پریس دہلی۔ ٹائیٹل: فائن پریس دہلی

شذرات

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ پاکستان میں کسی شاعر، ادیب یا مصنف کا انتقال ہوتا ہے اور ہفتوں تک ہمیں یہ نہیں معلوم ہو پاتا کہ یہ افسوسناک خبر صحیح بھی ہے یا نہیں اور یہ کہ کہاں انتقال ہوا اور کن حالات میں ہوا۔ بہرحال، علم و ادب کے حلقوں میں عرصہ تک ایک احساسِ غم کے ساتھ اس بات کا چرچا رہے گا کہ امسال اگست میں پاکستان کے دو مشہور اہلِ قلم اور ادیب اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اس سلسلے میں ہمارے لیے سب سے بڑا غم خواجہ منظور حسین مرحوم و مغفور کی وفات کا ہے۔ وہ ہمارے باضابطہ استاد تو نہ تھے لیکن ہم نے علی گڑھ میں اپنی طالب علمی کے زمانے میں ان کے شاندار ذاتی کتب خانے سے استفادہ کیا تھا۔ گلشنِ ہستی میں بعض شخصیتیں واقعی اتنی خوبصورت، مہذب اور دلوں کو موہ لینے والی ہوتی ہیں کہ انھیں دیکھ کر زبان پر بے اختیار یہ شعر آجاتا ہے:

زفرق تا قدمش ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

خواجہ صاحب کی ظاہری و باطنی شخصیت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ ان کا انتقال لاہور میں ۲راگست ۱۹۸۶ء کو ہوا اور کوئی تین ہفتے بعد جب ہمیں اس حادثہ کا علم ہوا تو معاً خیال آیا کہ لیجیے، یہ چراغ بھی بجھ گیا، یہ گل بھی مرجھا گیا! آہ، کیسی کیسی صورتیں خاک میں پنہاں ہو کر رہ جاتی ہیں۔

خواجہ منظور حسین دہلی کے ایک شریف خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کی ولادت ۱۹۰۴ء میں ہوئی تھی۔ ملک کی تقسیم کے بعد ۱۹۴۷ء میں انھیں اپنی سسرال والوں اور اہلیہ کے اصرار پر لاہور جانا پڑا، وہ علی گڑھ چھوڑنا نہیں چاہتے تھے لیکن کیا کرتے مجبور تھے، شریف صاحب جو علی گڑھ میں فلسفے کے استاد اور مرحوم کے خسر تھے، پنجاب کے رہنے والے تھے اور ان کے خاندان کے سب لوگ پاکستان جانا چاہتے تھے۔ ان کے قدردانوں اور شاگردوں کو اس کا بڑا رنج تھا، لاہور جاکر پروفیسر آل احمد سرور کے نام جو ان کے ممتاز شاگردوں میں ہیں انھوں نے جو خط لکھا تو اس میں لکھا کہ

کعبہ میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں
بھولا ہوں حق صحبت اہل کنشت کو

خواجہ صاحب بڑی اچھی زبان بولتے تھے، انگریزی، فارسی اور اردو پر یکساں قدرت تھی۔ مطالعہ ان کا وسیع اور گہرا تھا، اسی لیے صاحب نظر تھے، ان کے ایک اور ممتاز شاگرد پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے اپنے ششماہی مجلے (۱۹۸۵ء، جلد نمبر ۱، شمارہ نمبر ۲) میں جو خواجہ منظور حسین نمبر ہے اور جسے افسوس ہے کہ اپنی اچانک موت کے سبب خواجہ صاحب دیکھ نہ سکے، لکھا ہے کہ "شاید کسی نفسیاتی پیچیدگی کی وجہ سے خواجہ صاحب کی علمی اور ادبی کاوشیں جلد منظر عام پر نہ آسکیں لیکن خواص ہمیشہ ان کے مداح، معترف اور گرویدہ رہے۔ رشید احمد صدیقی، فراق گورکھپوری، فیض احمد فیض، پطرس بخاری، آل احمد سرور، احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین، اور شان الحق حقی جیسے بلند مرتبت ادیبوں اور شاعروں نے ان کے علم و فضل کی گہرائی اور گیرائی، ان کی دیدہ وری اور رمز شناسی اور ان کے محاکموں کی جامعیت اور دوررسی کا ہمیشہ کھلے دل سے اقرار و احترام کیا۔" خواجہ صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی ہی کے نہیں، پوری یونیورسٹی کی زینت تھے، ان کی ذات سے برسوں علی گڑھ میں علم و ادب کا بھرم قائم رہا۔ اگست ۱۹۳۴ء میں پروفیسر فیلڈن کے سبکدوش ہونے کے

بعد وہ باضابطہ انگریزی کے پروفیسر مقرر ہوئے، لیکن افسوس کہ اسی سال انہیں پاکستان جانا پڑا اور علی گڑھ کے ادبیات کے طلبہ ان سے مزید استفادہ نہ کر سکے۔

خواجہ صاحب کی تصانیف "اقبال اور بعض دوسرے شاعر"، "اردو غزل کا خارجی روپ اور بہروپ" اور "تحریک جدوجہد بطور موضوع سخن" نے اہل ذوق سے بایں معنی خراج تحسین وصول کیا کہ ان میں ایک نئے طرز فکر کا سراغ ملتا ہے، اور اول الذکر تو بقول پروفیسر اسلوب احمد انصاری "اقبال پر اب تک لکھی گئی تمام کتابوں پر فوقیت رکھتی ہے۔" انھوں نے آج سے بہت پہلے اردو والوں کو روسی ناول نگار چیخوف اور اس کی کہانیوں سے روشناس کرایا تھا، اور کئی روسی کہانیوں کے ترجمے کئے تھے۔ خواجہ صاحب کا دل بہت بڑا تھا، بے جھجک اپنے طالب علموں کو کتابیں مستعار دیدیتے اور پھر جب وہ طالب علم کتابیں واپس کرنے جاتے تو اس سے موضوع کتاب پر گفتگو کرتے اور مزید مطالعے کا شوق دلاتے، اور یہ سب اس انداز سے کہ گویا وہ خود اس بات سے بہت خوش ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین

---

۱۴ اگست ۱۹۸۶ء کو عربی، فارسی اور اردو کے ایک جید عالم، نامور ادیب اور مشہور نقاد ڈاکٹر مولوی سید محمد عبداللہ نے بھی اسّی برس کی عمر میں اس دار فانی کو خیر باد کہا اور سفر آخرت پر روانہ ہوگئے۔ وہ خواجہ منظور حسین مرحوم سے دو سال چھوٹے تھے اور ۱۹۰۶ء میں صوبہ سرحد کے ایک قصبہ منگلور میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۹۲۰ء میں جب وہ نویں جماعت میں زیر تعلیم تھے، تحریک خلافت کا غلغلہ بلند ہوا اور جب تحریک ترک موالات کے اثر سے علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا تو وہ ایبٹ آباد کا گورنمنٹ ہائی اسکول چھوڑ کر جامعہ چلے آئے لیکن چند ماہ بعد وہ لاہور چلے گئے جہاں ایک مدرسہ میں وہ درس نظامیہ کی تحصیل میں مصروف ہوگئے۔ لاہور ہی میں انھوں نے پروفیسر مولوی عبدالعزیز میمن سے عربی ادب کی تعلیم حاصل کی اور مفسر قرآن مولانا احمد علیؒ (انجمن خدام الدین)

کے درس قرآن سے بھی فیض اٹھایا، انھیں سے۔ انھوں نے حجۃ اللہ البالغہ بھی پڑھی مولانا احمد علی صاحب سے جو شیخ الہند مولانا محمود حسن کے اجل تلامذہ میں تھے، انھوں نے روحانی فیوض بھی حاصل کئے۔ انھوں نے ایم اے کے امتحانات (عربی اور فارسی) پرائیویٹ طور پر پاس کئے، اور ۱۹۳۵ء میں انھوں نے ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔

[illegible] صاحب نے کوئی ساٹھ برس تک مختلف حیثیتوں سے پنجاب یونیورسٹی کی خدمت کی۔ علمی و تعلیمی زندگی میں وہ مولوی محمد شفیع اور حافظ محمود شیرانی سے زیادہ متاثر اور ان کی علمی روایات کے حامل تھے۔ عقائد و اعمال میں وہ اکابر دیوبند کے ہم خیال تھے لیکن وسیع النظر اور وسیع القلب تھے اور دوسرے مختلف الخیال خواص و عوام سے یکساں تعلقات رکھتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ میرا مسلک محبت کا مسلک ہے جو توڑتی نہیں جوڑتی ہے۔ پڑھنا لکھنا ان کا اوڑھنا بچھونا تھا اور وہ ہمہ وقت اسی میں معروف رہتے تھے، اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے بڑے پایے کی تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں جن کی تعداد تیس پینتیس کے قریب ہے۔ لطائف نامۂ فخری، تذکرہ مردم دیدہ، نوادر الالفاظ، نقد میر، وجہی سے عبدالحق تک، ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، فارسی زبان و ادب وغیرہ ان کے ایسے علمی کارنامے ہیں جنھیں بھلایا نہیں جاسکتا۔ لیکن ان کی علمی زندگی کا زندۂ جاوید کارنامہ "اردو دائرۂ معارف اسلامیہ" کی تکمیل ہے۔ اردو زبان و ادب سے انھیں غیر معمولی شغف تھا اور اردو کو پاکستان کی قومی زبان بنوانے میں ان کی جد و جہد کا بڑا نمایاں حصہ ہے، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی کا قیام بھی جس کا مقصد سائنسی علوم کو اردو میں منتقل کرنا ہے، انھیں کا کارنامہ ہے۔ آج وہ اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن اہل علم انھیں کبھی نہ بھلا سکیں گے اور ان کے علمی و ادبی کا... انھیں زندہ رکھیں گے۔ جریدۂ دنیائے علم و ادب پر اُن کا دوام ثبت رہے گا۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے اور ان کے مراتب بلند کرے۔ آمین ثم [illegible]

مومنِ جانباز: مصداقِ لولاک

اہلِ تصوّف اور نعت گو شاعروں کے حلقوں میں دو ترکیبیں "صاحبِ لولاک" اور "شہِ لولاک" بہت مشہور اور مقبول ہیں۔ وہ اپنے پند و وعظ اور تلقین و ہدایت میں اور یہ اپنی نعتوں اور منقبتوں میں انھیں بہت استعمال کرتے ہیں اور ان سے حضرت رسولِ کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ گرامی مراد ہوتی ہے۔ ان میں تلمیح ہے، ایک حدیثِ قدسی کی طرف جس میں خدا ئے تعالیٰ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ[1] اگر (مقصودِ آفرینش) آپ کا وجود نہ ہوتا، تو میں یہ افلاک (اور کائنات) پیدا ہی نہ کرتا۔

---

[1] یہ حدیث کسی مستند مجموعۂ حدیث میں نہیں ملتی۔ المستدرک (۲: ۴: ۶۱۴، ۶۱۵، دائرۃ المعارف، حیدر آباد) میں بھی متن صرف "لولا محمد ما خلقت آدم" نیز "لولا محمد ما خلقت الجنّۃ والنّار" ہے۔ اور تذکرۃ الموضوعات کے مصنف محمد طاہر بن علی ہندی (مطبعۃ الشرق، دمشق: ۱۳۴۳ھ) نے صنعانی کی سند پر اسے بھی موضوع قرار دیا ہے۔

اقبال نے بھی اپنے کلام میں یہ دونوں ترکیبیں استعمال کی ہیں۔کہیں ان سے واقعی ذاتِ رسالت مآب مراد ہے اور کہیں انھیں بطور استعارہ لائے ہیں۔

مثلاً
ترا جوہر ہے نوری، پاک ہے تو
فروغِ دیدۂ افلاک ہے تو
ترے صیدِ زبوں افرشتہ و حور
کہ شاہینِ شہِ لولاک ہے تو (بالِ جبریل: ۱۱۹)

یہاں خطاب مسلمان (مومن) سے ہے کہ تو اس تودۂ خاک (زمین اور جو کچھ اس میں ہے) پر کیونکر قانع ہوگیا! تو اپنی سرشت میں نوری ہے اور تمام نوری مخلوق (افلاک اور فرشتے اور حوریں) تیرے حیطۂ اقتدار میں ہیں۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ تیری پرورش شہ لولاک محمد مصطفٰے صلعم نے کی ہے، جو کُن فیکون کی علّتِ غائی ہیں۔ پس تمہاری پرواز اس عالمِ آب و گل سے بلند تر ہونی چاہیے۔

دوسری جگہ اسی مضمون کو ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

ترا اندیشہ افلاکی نہیں ہے
تری پرواز لولاکی نہیں ہے
یہ مانا اصل شاہینی ہے تیری
تری آنکھوں میں بیباکی نہیں ہے (بالِ جبریل: ۱۱۷)

انھوں نے یہ مضمون اپنے کلام میں کئی مقامات پر بیان کیا ہے۔ بعض جگہ صراحت ہے، بعض جگہ صرف کنایے پر اکتفا کی ہے ——— کنایے کی مثال میں یہ شعر دیکھیے:

فطرت نے نہ بخشا مجھے اندیشۂ چالاک
رکھتی ہے مگر طاقتِ پرواز، میری خاک
وہ خاک کہ ہے جس کا جنوں صیقلِ ادراک

وہ خاک کہ جبریل کی ہے جس سے قبا چاک
وہ خاک کہ پروائے نشیمن نہیں رکھتی
چنتی نہیں پہنائے چمن سے خس و خاشاک
اس خاک اللہ نے بخشے ہیں وہ آنسو
کرتی ہے چمک جن کی ستاروں کو عرقناک (بالِ جبریل: ص ۱۰۱)

اقبال نے 'لولاک' کو بطور استعارہ بھی استعمال کیا ہے اور ان مقامات پر بھی ان کا مقصود مسلمان کو ترغیبِ عمل اور تسخیرِ کائنات پر آمادہ کرنا ہے۔ ملاحظہ ہو:

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے (بالِ جبریل: ۳۵)

جہاں تمام ہے میراث مردِ مومن کی
مرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ لولاک (بالِ جبریل: ۹۰)

ان دونوں شعروں میں 'لولاک' کا کینوس وسیع تر ہو گیا ہے۔ ان میں حضرت رسولِ کریم صلعم کی طرف اشارہ نہیں ہے۔ بلکہ اب شاعر کے مدِ نظر نفسِ حدیث (مندرجہ صدر) کا مفاد ہے۔

لیکن میں مزید تفصیل میں جانے سے پہلے اقبال کی زندگی کے ایک واقعے کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، جس سے یہ مسئلہ اور صاف ہو جائے گا۔ ان شاء اللہ

ڈاکٹر جاوید اقبال (پسر اقبال) لکھتے ہیں:

" اقبال خود بیان کرتے ہیں کہ جب وہ سیالکوٹ میں پڑھتے تھے، تو روزانہ صبح اٹھ کر تلاوتِ قرآن کیا کرتے۔ مگر ان کے والد اوراد و وظائف سے فرصت پا کر آتے اور انہیں دیکھ کر گزر جاتے۔ ایک دن صبح سویرے ان کے قریب سے گذرے، تو فرمایا کہ کبھی فرصت

ملی تو میں تمہیں ایک بات بتاؤں گا۔

بالآخر انھوں نے ایک مدت کے بعد اقبال کے اصرار کرنے پر یہ بات بتائی۔ اور ایک دن صبح جب اقبال حسب دستور قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے، تو وہ ان کے پاس آئے اور شفقت سے فرمایا: بیٹا! کہنا یہ تھا کہ جب تم قرآن پڑھو، تو یہ سمجھو کہ قرآن تم پر ہی اترا ہے، یعنی اللہ خود تم سے ہمکلام ہے۔[1]

ان کے کلام سے ثابت ہوتا ہے کہ اقبال پر والد کی اس ہدایت کا اثر بہت پایدار ثابت ہوا۔ ان کے متعدد اشعار اسی نظریے کے حامل ہیں۔ ملاحظہ ہو

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی، نہ صاحب کشاف (بال جبریل: ۱۲)

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے، حقیقت میں ہے قرآن (ضرب کلیم: ۵۷)

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے، مگر صاحب کتاب نہیں (ضرب کلیم: ۸۰)

اقبال کا ایک شعر بہت مشہور ہے:

محمد بھی ترا، جبریل بھی، قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرف شیریں، ترجماں تیرا ہے یا میرا (بال جبریل: ۷)

بعض اصحاب نے اس شعر کے مصرع ثانی میں "یہ" کا مشارٌ الیہ متعین

---

[1] زندہ رود ۱: ۶۵ (بحوالہ "اقبال کے حضور"، از سید نذیر نیازی) ۱: ۶۰-۶۱)

ہیں مختلف آراء کا اظہار کیا ہے۔ میرے خیال میں اس کا اشارہ مصرعِ اولیٰ کے آخری ٹکڑے "قرآن بھی تیرا" کی طرف ہے۔ شاعر خدا سے کہتا ہے کہ عام خیال یہی ہے کہ جس طرح محمدؐ اور جبریل تیرے ہیں، قرآن بھی تیرا ہے۔ لیکن یہ بتا کہ کیا واقعی یہ حرفِ شیریں، (قرآن) تیرا ہے یا میرا؟ اس سے لذت اندوز اور مستفیض ہونے کا حق تو میرا ہے کہ تو نے اسے میرے لیے نازل کیا ہے۔ میرے نزدیک اقبال کے والد کی ہدایت کے پیشِ نظر یہ معنی زیادہ قرینِ قیاس، بلکہ موزوں تر ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

آمدم برسرِ مطلب۔

اقبال کو ان کے والد شیخ نور محمد نے یہ ہدایت کی تھی کہ بیٹا! یوں سمجھو کہ یہ قرآن خود تم پر نازل ہوا ہے اور خدا تم سے ہم کلام ہوا ہے۔ تو در اصل، اس سے ان کی مراد صرف اقبال کی یا کسی شخصِ واحد کی ذات نہیں تھی، بلکہ ان کا مدعا یہ تھا کہ قرآن کا خطاب ہر ایک مومن سے ہے۔ یہ کتاب هُدًى لِلنَّاسِ (۲ : ۱۸۵) اور بَصَائِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى (۴۵ : ۲۰) اور ذِكْرَى لِلْعَالَمِينَ (۶ : ۹۰) ہے، اور دنیا کا ہر ایک شخص اس کا مخاطب ہے، خصوصاً ہر ایک مومن۔ پس جب تک ہر ایک مومن (مسلمان) یہ محسوس نہیں کرتا کہ خدا براہِ راست مجھے حکم دے رہا ہے، نہ وہ اس کلام کی پوری اہمیت کا اندازہ لگا سکتا ہے، نہ پوری لگن سے اس پر عمل ہی کر سکتا ہے، اور سب سے اہم یہ کہ اس وقت تک وہ کائنات میں اپنا صحیح مقام بھی سمجھ نہیں سکتا۔

جب یہ اصول قائم ہو گیا، تو اقبال نے اسے مندرجہ بالا حدیثِ قدسی تک وسیع کر دیا۔ یعنی انھوں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ نہ صرف ہر ایک مومن قرآن کا مخاطب ہے، بلکہ آفرینشِ کائنات کا باعث بھی مومن ہے۔ یہ دنیا ومافیہا اور کائنات میں جو کچھ بھی ہے، یہ سب عالمِ وجود میں آیا ہی اس لیے

کہ انسان پیدا ہونے والا تھا:

نہ تو زمیں کے لیے ہے، نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے، تو نہیں جہاں کیلیے (بال جبریل: ۲۰)

تری آگ اس خاکداں سے نہیں   جہاں تجھ سے ہے، تو جہاں سے نہیں (ساقی نامہ)

اور یہ اشعار گویا تفسیر ہیں، قرآن کے ان مقامات کی جہاں کہا گیا ہے کہ ہم نے زمین و آسمان اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، انسان کے زیر نگیں کر دیا ہے۔

چند آیات ملاحظہ ہوں:

سَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ (النحل، ۱۶: ۱۲)

(اس (اللہ) نے تمہارے فایدے کے لیے رات اور دن اور سورج اور چاند اور ستارے مسخر کیے)

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي الْاَرْضِ (الحج، ۲۲: ۶۵)

(کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جو کچھ زمین میں ہے، اللہ نے تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے)

(اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ

(لقمان، ۳۱: ۲۰)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے، اور جو کچھ زمین میں ہے، (سب کچھ) اللہ نے تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے۔)

(وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ

(الجاثیہ، ۴۵: ۱۳)

(اور خدا نے) جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، سارے کا سارا (بغیر تمہارے کسی استحقاق کے) اپنی طرف سے تمہارے لیے مسخّر کر دیا ہے۔)

——— وغیرہ
تسخیر کی تین خصوصیات ہیں: مغلوب کرنا؛ ذلیل کرنا؛ اجرت دیے بغیر کام لینا۔ پس جب کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تمام چیزیں انسانوں کے لیے مسخر کر دی ہیں، تو گویا فرمایا کہ (۱) ان پر تمہارا حکم چلے گا؛ (۲) یہ تمہاری خدمت گزار اور ماتحت ہوں گی؛ (۳) اس کے لیے تم سے کوئی معاوضہ طلب نہیں کیا جائیگا۔

اور اب دیکھیے وہ دو شعر، جن کی توضیح و تشریح کے لیے یہ مضمون لکھنے کی ضرورت پیش آئی:

عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث
مومن نہیں، جو صاحب لولاک نہیں ہے (بال جبریل: ۵۳)

جہاں تمام ہے میراث مرد مومن کی
مرے کلام پہ حجّت ہے نکتۂ لولاک (بال جبریل: ۹۰)

جامعہ کے جون ۱۹۸۷ء کے شمارے میں جناب محمد بدیع الزماں (پھلواری شریف) کا ایک مضمون "صاحب لولاک" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے ان دونوں شعروں کے یہ معنی لکھے ہیں:

• دونوں اشعار ہم معنی ہیں۔ دونوں کے پہلے مصرعوں میں اقبال نے یہ تلقین کرائی ہے (؟) کہ یہ عالم، یہ جہان جس پر (؟) ہم بستے ہیں، صرف "مومن جانباز" اور "مرد مومن" کی میراث ہے؛ مگر مومن کہلانے

جانے کی شرط انھوں نے پہلے شعر کے دوسرے مصرعہ میں "صاحب لولاک" ہونے کی لگادی ہے اور دوسرے شعر کے دوسرے مصرعہ میں اپنے سارے کلام کو صرف "نکتہ لولاک" کی حجت بتایا ہے۔" (ص) دوبارہ پھر لکھتے ہیں:

"اقبال نے پہلے شعر کے دوسرے مصرعہ میں مومن کہلانے جانے کے لیے "صاحب لولاک" ہونے کی شرط لگائی اور دوسرے شعر کے دوسرے مصرعہ میں اپنے سارے کلام کو "نکتہ لولاک" کی حجت بتایا ہے۔" (ص ۱۸)

میں دوسرے شعر پر بعد کو گفتگو کروں گا؛ پہلے شعر اوّل لیجیے۔

جناب محمد بدیع الزماں کے نزدیک اس کا دوسرا مصرع جملہ شرطیہ ہے یعنی ان کے خیال میں اس کی نثر یوں ہے: اگر کوئی شخص صاحب لولاک نہیں ہے تو وہ مومن نہیں" حالانکہ یہ جملہ شرطیہ نہیں، بلکہ خبریہ ہے: اس کی نثر یوں ہوگی: "(کوئی) مومن (ایسا) نہیں، جو صاحب لولاک نہیں ہے" دراصل انہیں غلط فہمی "صاحب لولاک" کے معنی نہ سمجھنے کی وجہ سے ہوئی۔ انھوں نے اپنے مضمون میں کہیں اس ترکیب کے معنی تو صراحت سے بیان نہیں کیے، لیکن ان کے بعض بیانات سے متبادر ہوتا ہے کہ وہ غالباً اس سے "اتباع رسول" اور "عشق رسول" وغیرہ مراد لیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"جب اقبال یہ کہتے ہیں کہ یہ عالم مرد مومن کی میراث ہے، تو ان کی مراد ہر ایک مومن کے اعتقاد کی وہ منزل ہے جسے اس نے "اتباع رسول" کے ذریعہ شریعت محمدی کو اپنا مزاج بنالیا ہے۔ جس نے اپنی شخصیت کو اس اتباع کے ذریعے ارتقا کے ان اعلیٰ ترین مدارج سے ہمکنار کردیا ہے جہاں وہ قوت دحیات کا سرچشمہ بن کر اپنا رشتہ ملت سے استوار کرکے اپنے نصب العینی معاشرے

کے لیے باعث رحمت بن کر خلیفۃ اللہ فی الارض کا فریضہ انجام دینے کا مستحق ہو جاتا ہے۔" (ص ۱۷)

پھر لکھتے ہیں:

"مشیت ایزدی کی پیروی صرف "اتباع رسولؐ" میں مضمر ہے۔" (ص ۲۱)

متعدد آیات واحادیث نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"وجہ آفرینش اور مقصد حیات انسانی صرف "عشق رسول" میں پنہاں ہے۔" (ص ۲۴)

یا

"اللہ کے ساتھ رسول کی اطاعت "ایک مومن کو جو" صاحب لولاک" ہے، درجات کی کس منزل پر پہنچا دیتی ہے۔" (ص ۲۵)

میری نظر میں "صاحب لولاک" کے یہ معنی ٹھیک نہیں ہیں اور اس شعر میں "اتباع رسولؐ" اور "عشق رسول" اور "اطاعت رسول" اور "شریعت محمدی کو اپنا مزاج بنانے" کا سرے سے ذکر ہی نہیں ہے۔

دراصل اقبال یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ تمام کائنات "مومن جانباز" کی جولانگاہ اور ملکیت اور قلمرو ہے کیونکہ صحیح معنوں میں ہر ایک مومن حدیث لولاک کا مصداق ہے۔ (جس طرح سے قرآن اگرچہ حضرت رسول کریمؐ پر نازل ہوا، لیکن درحقیقت خدا کا مخاطب ہر ایک مومن ہے اور یہ قرآن گویا اسی پر نازل ہوا ہے۔ اسی طرح سے) حدیث لولاک میں اگرچہ اساساً حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے خطاب ہے، لیکن ظلی طور پر ہر ایک مومن جانباز بھی اس کا تمام مقام اور اس حدیث کا مصداق ہے۔ یہی "صاحب لولاک" کے معنی ہیں، یعنی مقام لولاک کا مالک یا حامل یا مصداق۔

جناب محمد بدیع الزماں نے دوسرے شعر کی تشریح کرتے ہوئے

عجیب گل کھلایا ہے۔ پہلے یہ شعر دوبارہ سنیے۔ اقبال لکھتے ہیں:

جہاں تمام ہے میراث مردِ مومن کی
مرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ لولاک

محمد بدیع الزماں صاحب اس کے معنی یوں کرتے ہیں:

"(اقبال نے) شعر کے دوسرے مصرعے میں اپنے سارے کلام کو صرف "نکتۂ لولاک" کی حجت بتایا ہے" (ص ۷)

یہی بات انھوں نے (ص ۱۸) پر دہرائی ہے۔ پھر ایک جگہ لکھتے ہیں:

"اقبال کا یہ کہنا کہ ان کے کلام میں نکتۂ لولاک کی حجت ہے، تو اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ ان کے کلام میں وہی جامعیت ہے جو اسلام کے پیغام کی خصوصیت ہے" (ص ۲۹)

یہ سب باتیں اقبال پر اتہام سے کم نہیں۔ اقبال نے قطعاً اپنے کلام کو (کجا سارے کلام کو) "نکتۂ لولاک کی حجت" کہا۔ نہ "نکتۂ لولاک" سے اقبال کی مراد "اسلام اور اس کے پیغام کی جامعیت" ہے۔ اور نہ اس حدیث کا یہ مفاد ہی ہے۔ اور نہ اس شعر کے یہ معنی ہی ہیں۔

اقبال تو "نکتۂ لولاک" کو اپنے کلام پر حجت بتا رہے ہیں۔ اور محمد بدیع الزماں صاحب اس کے بالعکس اقبال کے "سارے" کلام کو "نکتۂ لولاک" پر حجت قرار دے رہے ہیں۔ گویا یہ معنی کر کے انھوں نے مبتدا کو خبر اور خبر کو مبتدا بنا دیا، جسے کوئی صاحب فہم قبول نہیں کر سکتا۔

رہا لفظ "کلام"، تو اس سے نہ سارا کلام اقبال مراد ہے، نہ آدھا، نہ چوتھائی! بلکہ اس سے صرف اسی شعر کے مصرعِ اولیٰ کی طرف اشارہ ہے۔ شعر کے معنی ہیں:

یہ تمام جہان مردِ مومن کی میراث ہے۔ میرے اس کلام (دعوے) پر دلیل (حجت) "نکتۂ لولاک" ہے۔

نکتہ سے یہ کہنا مقصود ہے کہ حدیث لولاک کا مفاد یہ تھا کہ یہ تمام کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے لیے بنائی گئی تھی، اس لیے یہ گویا ان کی جاگیر ہے۔ اور اب ان کے مومن (مسلمان) ان کے جانشین ہونے کی وجہ سے اس جائداد کے وارث ہیں۔

غرض ان دونوں شعروں کے ذریعے سے یہ بتانا چاہا ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات حضرت رسول کریم صلعم کے لیے پیدا کی تھی، اب ان کی امّت کا فرض اور حق ہے کہ وہ اپنی محنت اور کوشش اور "جانبازی" سے اس پر قبضہ جمالے۔

صرف یہی نہیں، بلکہ انھوں نے حضورؐ کی معراج سے بھی یہی استنباط کیا ہے۔ کہتے ہیں:

رہ یک گام ہے ہمت کے لیے عرش بریں
کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات (بانگ درا: ۲۸۱)

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفٰے سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں (بالِ جبریل: ۴۴)

بیشک یہ دنیا پُرکشش اور خوبصورت اور سود مند ہے؛ اور انسان کو یہاں بھیجا گیا، تو اس سے یقیناً مقصود یہی تھا کہ ہم اس سے متمتّع اور لطف اندوز ہوں۔ لیکن قرآن کے متعدد مقامات سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمارا نصب العین اور مطمحِ نظر یہ دنیا نہیں ہونی چاہیئے۔ بلکہ ہمیں اس سے بلند ہوکر، اور ارفع اور پایدار مقامات کو اپنا ہدف بنانا چاہیے۔ اسی بات کو اقبال یوں کہتے ہیں:

مہ و ستارہ سے آگے مقام ہے جس کا
وہ مشتِ خاک ابھی آوارگانِ راہ میں ہے (بالِ جبریل: ۹۹)

بلکہ اقبال کے نزدیک تو کافر اور مومن میں مابہ الامتیاز ہی اسی میں مضمر ہے:

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق (ضربِ کلیم: ۳۹)

اقبال کے نزدیک کون سا مومن "جہان کا وارث" اور "مصداقِ لولاک" ہے، اور اس کا مقام کیا ہے! لکھتے ہیں:

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان، نئی آن — گفتار میں، کردار میں، اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت — یہ چار عناصر ہوں، تو بنتا ہے مسلمان
ہمسایۂ جبریلِ امیں، بندۂ خاکی — ہے اس کا نشیمن نہ بخارا، نہ بدخشاں
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
قدرت کے مقاصد کا عیار، اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان (ضربِ کلیم: ۵۷)

زیرِ بحث شعر اول جس نظم کا مقطع ہے، اسے دیکھیے۔ اس سے اس کا سیاق و سباق اور معنی اور واضح ہو جائیں گے:

دل سوز سے خالی ہے، نگہ پاک نہیں ہے
پھر اس میں عجب کیا کہ تو بے باک نہیں ہے
ہے ذوقِ تجلی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل! تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے
وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن
پُرکار و سخن ساز ہے، نمناک نہیں ہے
کیا صوفی و مُلّا کو خبر، میرے جنوں کی

ان کا سر دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے
کب تک رہے محکومیِ انجم میں مری خاک
یا میں نہیں، یا گردشِ افلاک نہیں ہے
بجلی ہوں، نظر کوہ و بیاباں پہ ہے مری
میرے لیے شایاں خس و خاشاک نہیں ہے
عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے (بالِ جبریل: ۵۲-۵۳)

"مومن جانباز" کی تگ و تاز ایک دوسری نظم میں یوں بیان کی ہے:

ہر اک مقام سے آگے گزر گیا مہِ نو
کمال کس کو میسر ہوا ہے بے تگ و دو
نفس کے زور سے وہ غنچہ وا ہوا بھی تو کیا
جسے نصیب نہیں آفتاب کا پرتو
نگاہ پاک ہے تیری، تو پاک ہے دل بھی
کہ دل کو حق نے کیا ہے نگاہ کا پیرو
پنپ سکا نہ خیاباں میں لالۂ دلسوز
کہ ساز گار نہیں یہ جہانِ گندم و جو
رہے نہ ایبک و غوری کے معرکے باقی
ہمیشہ تازہ و شیریں ہے نغمۂ خسرو (بالِ جبریل: ۱۰۶-۱۰۷)

اور آخر میں ان کی مشہور نظم پھر ایک مرتبہ پڑھیے:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں

[redacted]

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اور بھی، آشیاں اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اک نشیمن، تو کیا غم!
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے، پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں
گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں   یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

(بالِ جبریل: ۸۹-۹۰)

اور مقطع میں غالب کا ایک شعر دیکھیے، جس سے معلوم ہوگا کہ اقبال اس خیال میں منفرد نہیں ہیں:

زما گرم است ایں ہنگامہ، بنگر شورِ ہستی را
قیامت می دمد از پردۂ خاکی کہ انساں شد

جناب مالک رام بلا بجہ۔ سی-۴ ۵۰ ڈیفنس کالونی نئی دہلی-۱۱۰۰۲۴

ا۔ د۔ شاکرہ

شرحِ مرغوب القلوب کا مصنف

اردو زبان کے محققین کی بدقسمتی ہے کہ اس زبان میں شائع ہونے والے تحقیقی مواد کی جامع کتابیات BIBLIOGRAPHY اور تلخیص ABS-TRACT اول تو شائع ہی نہیں ہوتیں اور جو ہوتی بھی ہیں تو بلا تسلسل ہیں۔ تنقیل بلوگرافی اس کی ایک مثال ہے جو اتنے طویل عرصے کے بعد منظرِ عام پر آتی ہے کہ اس کی افادیت مشکوک ہو جاتی ہے۔

گذشتہ دہوں میں اردو کے محققین نے دکھنی زبان اور ادب سے کافی دلچسپی لی اور برصغیر ہندوستان و پاکستان میں دکھنی کے بارے میں کئی کتابیں اور مضامین شایع ہوئے۔ شمال و جنوب کی جامعات میں بھی قدیم دکھنی ادیبوں کے بارے میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالات لکھے گئے مخصوص عنوانوں پر سمینار اور سمپوزیم منعقد کئے گئے۔ مگر اس پورے مواد کا اشاریہ اور کتابیات مرتب نہیں ہوئی جس کی وجہ سے محققین خاص کر نو واردوں کو بعض مقامات پر غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں۔

محترمہ ا۔ د۔ شاکرہ ۴۹/۲ آر ٹی / ایل آئی جی ایچ وجے نگر کالونی حیدرآباد۔ ۵۰۰۴۵۷

دکن سے دور بہار کے ڈاکٹر قطب الدین کا مضمون "شرح مرغوب القلوب سے معراج العاشقین تک" جو مئی ۱۹۸۶ء کے جامعہ میں شائع ہوا ہے مندرجہ بالا دلچسپی اور غلط فہمی کا اظہار ہے۔

اردو ادب یا قدیم اردو ادب سے میرا براہ راست تحقیقی ربط نہیں ہے بس کچھ طالب علمانہ جستجو رہتی ہے۔ ایک لائبریرین کی حیثیت سے جب میں اردو تحقیقی نگارشات کا مطالعہ کرتی ہوں تو یہ احساس شدید ہو جاتا ہے کہ اس زبان میں حوالہ جاتی ادب کی کمی اور عدم حصول کی وجہ سے ضروری مواد تک محققین کی رسائی نہیں ہو پاتی اور وہ بسا اوقات صحیح نتیجہ اسی وجہ سے اخذ نہیں کر پاتے۔ یہی معاملہ ڈاکٹر قطب اشرف کے ساتھ بھی پیش آیا ہے۔

اپنے اس مضمون میں قطب صاحب نے دکنی کے اہم ماخذوں سے بلا واسطہ یا بالواسطہ استفادہ کرتے ہوئے معراج العاشقین سے مرغوب القلوب تک کی ادبی تاریخ کا جائزہ لیا ہے اور بکھری کڑیوں کو مربوط کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مگر مرغوب القلوب تک پہنچ کر ان کا جائزہ محدود ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مقالہ "دکنی و گجراتی ادب" (مشمولہ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند جلد ششم۔ مطبوعہ پاکستان) کی بنیاد پر قطب اشرف صاحب یہ فیصلہ دیتے ہیں کہ مرغوب القلوب میراں جی شمس العشاق کی تصنیف ہے۔ اپنے فیصلہ کی تائید میں وہ مذکورہ مقالہ سے جمیل جالبی کی تحریر کا حوالہ دیتے ہیں:

"شرح مرغوب القلوب کے بارے میں اس لیے کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ یہ شرح تصنیف اس مخطوطے (شمس العشاق۔ قلمی انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی) میں موجود ہے جس میں میراں جی، برہان الدین جانم، امین الدین اعلیٰ تک کی کم و بیش ساری تصانیف موجود ہیں یہ مخطوطہ ۱۱۴۵ھ / ۱۰۰۰ ء کا لکھا ہوا ہے اور اس

میں "شرح مرغوب القلوب" کو میراں جی کی تصنیف بتایا گیا ہے۔" (صفحہ ۲۱)

عام سمجھ کا سوال ہے کہ آیا کسی مجموعہ میں وہ بھی قدیم دور کے قلمی مجموعہ میں شامل کسی مخطوطہ کو محض اس بنیاد پر کہ اس میں بعض تصانیف کسی خاص فرد کی تصنیف کردہ ہیں اسی فرد سے منسوب کیا جاسکتا ہے؟

عبدالقادر سروری نے بھی جامعہ عثمانیہ کے ایک قدیم دکھنی نسخہ کی ساری شاملات کو امین الدین اعلیٰ سے محض اس لیے منسوب کر دیا تھا کہ اس میں چند تصانیف ان کی شامل تھیں۔ بعد کی تحقیقات سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ اس مجموعہ میں دوسرے افراد کی تصانیف بھی شامل ہیں۔ چنانچہ مرغوب القلوب کا ایک نسخہ بھی اس مجموعہ میں شامل ہے۔

تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی تھی جس میں شائع شدہ مقالہ میں ڈاکٹر جمیل جالبی مرغوب القلوب کو بلاشک و شبہ میراں جی شمس العشاق کی تصنیف قرار دیتے ہیں۔ لیکن اپنی دوسری تصنیف تاریخ ادب اردو کے پہلے حصہ میں جو ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی ہے مرغوب القلوب کے بارے میں خاموش ہیں حالانکہ اس بلند پایہ اور مبسوط تاریخ ادب میں میراں جی شمس العشاق اور میراں جی خدا نما کا تفصیلی ذکر ملتا ہے اور دونوں کی تصانیف کی تفصیل بھی دی گئی ہے۔ لیکن مرغوب القلوب یا اس کی شرح کو دونوں میں سے کسی کی بھی تصانیف میں شامل نہیں کیا ہے۔ البتہ مغز مرغوب کا ذکر ہے جو غالباً دوسری ہی چیز ہے۔ اور میراں جی شمس العشاق کی تصنیف ہے۔

مرغوب القلوب اور میراں جی خدا نما کے بارے میں چند اور محققین نے بھی تحقیق کی ہے جن کا حوالہ قطب اشرف صاحب کے ہاں نہیں ملتا۔ ان محققین کی تحریروں کا اقتباس پیش ہے۔

(۱) شمس اللہ قادری لکھتے ہیں:

"ہمارے مخدوم مولانا عبدالحق صاحب نے اسے (شرح مرغوب القلوب کو)

حضرت میراں جی شمس العشاق کی تصنیف بتایا ہے جن کا ۹۰۲ھ میں
انتقال ہوا ہے۔ اس کا ایک نسخہ ہم نے ڈاکٹر محمد قاسم ماہر سمیات
کے کتب خانہ میں دیکھا ہے۔ اس کے خاتمہ سے معلوم ہوتا ہے
کہ یہ حضرت میراں جی خدا نما کی تصنیف ہے۔ یہ بزرگ سلطان عبداللہ
قطب شاہ کے معاصر تھے ۱۰۷۰ میں فوت ہوئے ہیں۔ انھوں نے
تمہیدات عین القضات ہمدانی کی شرح بھی لکھی ہے"۔[۱]

اس کے بعد کتاب کے آغاز سے نمونہ دیا گیا ہے۔

(۲) ڈاکٹر حفیظ قتیل نے میراں جی خدا نما پر تحقیقی کتاب لکھی ہے اور شرح مرغوب القلوب کو انہی کی تصنیف ثابت کرتے ہوئے شمس اللہ قادری کی تائید کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"حکیم صاحب کا مجردیاں بھی اس شرح کے مصنف کے تعین کیلیے
کافی تھا لیکن داخلی شہادت سے بھی اس شرح کا خدا نما کی تصنیف
ہونا ثابت ہوتا ہے چنانچہ شرح تمہیدات اور مرغوب القلوب میں
جو آیات و احادیث مشترک ہیں ان کے ترجمہ کی عبارت کم و بیش
ایک ہی ہے"۔[۲]

اس کے بعد انھوں نے دونوں تصانیف سے آیات کے ترجمہ کا موازنہ کیا ہے۔

---

(۳) ڈاکٹر محمد ہاشم علی نے اپنی تصنیف میراں جی شمس العشاق میں ان سے منسوب کتابوں کا جائزہ لیا ہے۔ گل باس اور جل ترنگ کے بارے میں شبہ کا اظہار کیا ہے۔ سب رس کے بارے میں لکھتے ہیں "یہ مسلم ہے کہ یہ میراں جی شمس العشاق کی تصنیف نہیں ہے۔" البتہ شرح مرغوب القلوب کے بارے وہ اپنی قطعی رائے ظاہر نہیں کرتے بلکہ ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر عبدالحق، شمس اللہ قادری اور ڈاکٹر حفیظ قتیل کے خیالات کی نقل کر دی ہے۔ البتہ لہجہ سے

شمس اللہ قادری اور ڈاکٹر حفیظ قتیل کی تائید کا اظہار ہوتا ہے۔

(۴) ڈاکٹر حسینی شاہد نے اپنے تحقیقی مقالہ میں (جو کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے) کتب خانہ جامعہ عثمانیہ کے اس نسخہ کا تنقیدی جائزہ لیا ہے جس کو عبدالقادر سروری نے امین الدین اعلیٰ سے منسوب کیا تھا۔ اسی مجموعہ میں مرغوب القلوب بھی شامل ہے۔

ڈاکٹر حسینی شاہد تحریر کرتے ہیں۔

"رسالہ نمبر ۴۔ اس رسالہ کے بارے میں پروفیسر سروری رقمطراز ہیں۔ 'موضوع تصوف ہے۔ یہ رسالہ حضرت خواجہ بندہ نواز کی معراج العاشقین سے ملتا جلتا ہے۔ بعض ابتدائی اور درمیانی حصے بالکل مطابق ہیں۔ اکثر مقامات مختلف بھی ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ اس رسالے اور معراج العاشقین کا ایک ہی ماخذ ہو

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اے تن واجب الوجود اس کا مقام شیطانی۔ بات شریعت ذکر جلی۔ نفس امارہ۔ عقل قیاس۔ فرشتہ موکل میکائیل شہادت مبادا۔ نفس لوامہ عقل وہم فرشتہ

"رسالہ دس ابواب پر مشتمل ہے جن کی تفصیل مصنف کے الفاظ میں یہ ہے: پہلا باب توبہ کے بیان میں۔ دوسرا باب پچھانت کرنا نفس۔ دل۔ روح سر۔ نور۔ ذات۔ شریعت طریقت پر تیسرا باب وضو کا۔ چوتھا باب دنیا کو ترک کر دینا۔ پانچواں باب تجرید و تفرید۔ چھٹا باب اپنی پچھانت۔ ساتواں باب عشق کا۔ آٹھواں باب تعشق کا۔ نواں باب فنا در بقا ہونے کا۔ دسواں صفت کا۔

"اس پر رسالہ ختم ہوجاتا ہے۔ معراج العاشقین میں یہ تقسیم نہیں ہے خاتمہ: قولہ تعالیٰ وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ۔ خدا کہیا میں تمہارے

تنا (ثنا) میں ہوں دلے تمہیں دیکھتے نہیں منجے مقصود اس میں مرید منتہی خدا کا وصل ہور قرب یکانکے (یگانگی) تمام ہے۔ ہور جے کوئی مبتلا ئے درد مند ہے اسے سب صحت ہے اگر کوئی عارف اچھے تو اس میں قرآن کے تیس سپارے ہور ایک سو چودا مور ثناں ان میں تمام ہیں۔

تمت شد ۳۷

"اس رسالے کے تعین میں بھی پروفیسر سروری نے غلطی کی ہے اور انھوں نے دو رسالوں کو خلط ملط کر دیا ہے۔ پروفیسر سروری نے آغاز کا جو اقتباس نقل کیا ہے وہ رسالہ وجودیہ یا مصنفہ میراں جی خدا نما کا ہے اور خاتمہ کی عبارت میراں جی خدا نماہی کے ایک اور رسالے شرح مرغوب القلوب کی ہے۔ رسالے کی تفصیل جو خود مصنف کے الفاظ میں نقل کی ہے وہ مرغوب القلوب سے متعلق ہے" ۳۸

مندرجہ بالا تفصیل کے علاوہ ڈاکٹر حسینی شاہد اسی کے ساتھ فٹ نوٹ میں لکھتے ہیں؛

"اس رسالہ کو مولوی عبدالحق رسالہ اردو بابت جولائی ۱۹۲۷ء اور ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ (اردو نثر کا آغاز اور ارتقا ص۱۲۹) اور ڈاکٹر نذیر احمد علی گڑھ (تاریخ ادب اردو ص۲۱۶) نے میراں جی شمس العشاق کی تصنیف قرار دیا ہے جو درست نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو اردوئے قدیم ۱۹۲۷ء ملحقات ص۱۵۹ اور میراں جی خدا نما مصنفہ ڈاکٹر حفیظ قتیل ص۱۲۱ " ۳۹

اوپر کے تسلسل کو جاری رکھتے ہوئے ڈاکٹر حسینی شاہد مزید تحریر کرتے ہیں:

زیرِ بحث مجموعہ میں رسالہ وجودیہ حسبِ ذیل جملوں پر ختم ہوتا ہے
یوں اپس میں خدا کوں دیکھیا ہوا ہر ایک چیز میں بی بوچ ہے اس
کا گواہ (د) خدا دیا ہے۔
قولہ تعالیٰ فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ وَهُوَ مَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ۔ یوں
اپس میں ہیں ذات خدا کی ہور ہر ایک چیز میں دیکھ۔ واللہ اعلم بالصواب[۴۵]
"یہ عبارت جہاں ختم ہوتی ہے نہیں سے" ابتدا کتاب مرغوب القلوب
کُلُّ اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ لَمْ یُبْدَاْ بِهٖ بِسْمِ اللّٰهِ فَهُوَ اَبْتَرُ (ابتر) پیغمبر علیہ السلام کہے ہیں جو کوئی کام کریگا
خدا کا ناؤں نا لے کر تو او کام پایمال ہوے گا ..... لکھ کر مرغوب
القلوب شروع کر دی گئی ہے۔ پروفیسر سروری نے غالباً اس عبارت
پر غور نہیں کیا جس کی وجہ سے انھوں نے ان دونوں رسالوں
کو خلط ملط کر دیا ہے"[۴۶]
آگے حسینی شاہد ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کی رائے پر اظہارِ خیال کرتے ہیں۔
"ڈاکٹر رفیعہ نے مرغوب القلوب کا ذکر تصانیفِ میران شمس العشاق
کے تحت کیا ہے چنانچہ وہ لکھتی ہیں:-
"شرحِ مرغوب القلوب کا ایک مخطوطہ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد
دکن میں بھی موجود ہے لیکن پروفیسر عبدالقادر سروری نے شاہ
امین الدین اعلیٰ کے رسائل میں شمار کیا ہے ....
چنانچہ پروفیسر صاحب نے جو اقتباسات نقل کئے ہیں وہ سب
شرح مرغوب القلوب کے ہیں"[۴۷]
اس کے بارے میں ڈاکٹر حسینی شاہد مزید لکھتے ہیں:-

ا پروفیسر سروری نے دو ہی اقتباس نقل کئے ہیں جن میں سے ایک تو مرغوب القلوب کا ہے لیکن دوسرا اقتباس مرغوب القلوب کا نہیں بلکہ رسالہ وجودیہ کا ہے۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کے اس بیان سے کہ سب اقتباسات مرغوب القلوب کے ہیں یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ پروفیسر سروری کی طرح وہ بھی وجودیہ اور شرح مرغوب القلوب میں امتیاز نہ کرسکیں۔

"رسالہ وجودیہ کے نسخے کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو (۹۵۴) کتب خانہ آصفیہ (۲ ۵۸ تصوف شاملات ۳۲ شاملات) کتب خانہ درگاہ حضرت امین بیجاپور میں اور مرغوب القلوب کے نسخے کتب خانہ آصفیہ (۱۲۶ حدیث ۴۸ جادیاد) ... اور کتب خانہ انجمن ترقی اردو پاکستان میں ملتے ہیں۔ شمس اللہ قادری نے اس کا ایک نسخہ ڈاکٹر محمد قاسم کے کتب خانہ میں بھی دیکھا تھا۔"[۵]

(۵) ڈاکٹر سیدہ جعفر نے ترقی اردو بیورو کے زیر اہتمام شایع شدہ دکنی نثر کا انتخاب مرتب کیا ہے۔ انھوں نے وجودیہ شرح تمہیدات اور مرغوب القلوب تینوں کو میراں جی خدا نما کی تصنیف بتایا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

"میراں جی خدا نما کا شمار ان قدیم نثر نگاروں میں ہوتا ہے جن کی تصانیف نے اردو نثر کی راہ متعین کی اور اس کا معیار قائم کیا۔

میراں جی کے تینوں رسالوں شرح شرح تمہیدات عین القضات، رسالہ وجودیہ اور رسالہ مرغوب القلوب میں مسائل تصوف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اول الذکر عبداللہ بن محمد عین القضات ہمدانی کی عربی تصنیف تمہیدات ہمدانی کا آزاد ترجمہ ہے۔ خواجہ بندہ نواز نے بھی فارسی میں اس کی شرح لکھی تھی جس سے خدا نما نے خوشہ چینی کی ہے۔"[۵۵]

(۶) ڈاکٹر محمد غوث جنھوں نے کتب خانہ جامعہ عثمانیہ کے اردو، فارسی، عربی

مخطوطات کی فہرست مرتب کی تھی اور جو مرتب داخلی شہادت پر ہی کتاب اور مصنف کا تعین کرتے تھے انھوں نے اس مخطوطہ کو جسے سروری صاحب نے ایک مخطوطہ بنایا ہے دو الگ رسالے قرار دیتے ہیں مگر مصنف کے بارے میں کوئی رائے ظاہر نہیں کی۔

(۷) اکبر الدین صدیقی اپنی کتاب بجھتے چراغ میں، وجود یہ، شرح مرغوب القلوب[1] شرح شرح تمہیدات تینوں کو میراں جی سیادحسن خدا نما کی تصنیف قرار دیتے ہیں۔[13]

راقم الحروف نے جامعہ عثمانیہ کے اردو مخطوطات کی فہرست مرتبہ ڈاکٹر محمد غوث پر نظر ثانی کرتے ہوئے اسی مجموعہ کا مطالعہ کیا ہے جس کا ذکر سروری رفیعہ سلطانہ اور حسینی شاہد کرتے ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس مخطوطہ میں ایک مقام پر مصنف نے "حضرت برہانا صاحب فرماتے ہیں" لکھ کر ایک شعر نقل کیا ہے۔ یہ تاریخی ثبوت ہے کہ میراں جی شمس العشاق برہان الدین جانم کے والد محترم تھے۔ اگر میراں جی شمس العشاق اس کتاب کے مصنف ہوتے تو ان الفاظ میں بیٹے کے شعر کا حوالہ نہیں دیتے۔

مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ شرح مرغوب القلوب گولکنڈہ کے میراں جی خدا نما کی تصنیف ہے۔ بیجاپور کے میراں جی شمس العشاق کی نہیں۔

حوالے

[1] شمس اللہ قادری: تاریخ زبان اردو

[2] حفیظ قتیل: میراں جی خدا نما

(یہ کتاب مجھے دستیاب نہ ہو سکی کہ ان کے دلائل کا بھی اندازہ ہو سکتا

بہ حوالہ محمد ہاشم علی کی کتاب میراں جی شمس العشاق سے نقل کیا گیا ہے۔ (ا۔ ذق)

۳ے عبدالقادر سروری۔ فہرست مخطوطات اردو جامعہ عثمانیہ ص۳۱

۴ے حسینی شاہد۔ سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ۔ حیات اور کارنامے ص ۴۶۵-۴۶۶

۵ے حسینی شاہد۔ سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ حیات اور کارنامے ص ۴۶۶ فٹ نوٹ نمبر ۳

۶ے میراں جی خدا نما: موجود بہ خزونہ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ شعبہ مخطوطات

۷ے حسینی شاہد۔ سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ حیات اور کارنامے ص ۲۶۶-۲۶۷

۸ے رفیعہ سلطانہ: اردو نثر کا آغاز اور ارتقاء ص۱۳۹

۹ے فی الوقت کتب خانہ آصفیہ کے مخطوطات گورنمنٹ اورینٹل مینوسکرپٹ لائبریری میں محفوظ ہیں۔

۱۰ے حکیم محمد قاسم کا کتب خانہ حکومت آصفیہ نے خرید لیا اور اسے کتب خانہ جامعہ عثمانیہ آصفیہ اور نظامیہ دواخانہ یونانی میں تقسیم کر دیا۔ مرغوب القلوب کے نسخے بھی جو آصفیہ اور عثمانیہ میں موجود ہیں ان میں سے کسی ایک کو شمس اللہ قادری نے دیکھا ہوگا۔

۱۱ے حسینی شاہد۔ سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ حیات اور کارنامے ص ۴۶۷-۴۶۸

۱۲ے سیدہ جعفر مرتب دکنی نثر کا انتخاب ص۵۵

۱۳ے اکبر الدین صدیقی تحفۂ چراغ ص۲

ابوسعید نورالدین

نئی نسل کے افسانہ نگار — شام بارکپوری

بنگال جسے ندیوں اور طوفانوں کی سرزمین کہا جاتا ہے، اس میں رابندر ناتھ ٹیگور اور قاضی نذر الاسلام جیسے عظیم شاعروں نے جنم لیا اور یہاں کے قدرتی حسن اور گوناگوں انسانی مسائل سے متاثر ہو کر بنگالی ادیبوں نے ادب کے خزانے کو لعل و گوہر سے مالا مال کیا، جسے آج بھی دنیائے ادب حیرت سے دیکھتی ہے۔ یہیں کی نرم و زرخیز مٹی، لہلہاتی فصلوں، رخ بدلتی ندیوں اور تناور درختوں کی فضا میں اردو کے ایک نامور افسانہ نگار شام بارکپوری نے اپنے قلم کی جولانی سے اردو ادب کو تابناک افسانے دیئے ہیں۔

اپنے ماحول کی ترجمانی، بنگلا دیشی عوام کے مسائل کی نمائندگی، اچھائیوں پر ایمان، انسانیت کی عکاسی، ساتھ ہی انسان کو انسان کی نظر سے دیکھنا، امن و آشتی کا پیغام، جبر و تشدد کے خلاف آواز، انسانی کرب کو داخلی اور خارجی حیثیت سے اجاگر کرنا ــــ اور علامتی و استعاراتی اسلوب میں معاشرے، ملک اور ساری دنیا کے آلام و مصائب کو نمایاں کرنا ہی شام بارکپوری کے

ڈاکٹر ابوسعید نورالدین، کوی جسیم الدین ایونیو، اُترا ماڈل ٹاؤن، ڈھاکا (بنگلہ دیش)

افسانوں کی خوبیاں ہیں۔

۱۹۵۷ء میں ان کا سب سے پہلا افسانہ "آنسو" بن کر صفحۂ قرطاس پر ٹپکا تھا۔ جب سے آج تک ان کے افسانے برّصغیر کے معیاری ادبی رسالوں میں مسلسل شائع ہو رہے ہیں۔ چنانچہ برّصغیر کے قارئین کا ایک وسیع حلقہ ان کے مداحوں میں شامل ہو گیا ہے۔ لندن اور کناڈا کے اردو رسالوں میں بھی ان کے افسانے شائع ہو رہے ہیں۔ ان ممالک کے محقق اور نقاد نے بھی ان کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

ان کا پہلا مجموعہ "پدما کی موجیں"، جو ستمبر ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا، نہ صرف بنگلہ دیش میں اردو کا پہلا افسانوی مجموعہ تھا، بلکہ سابق مشرقی پاکستان کے چوبیس سالہ دورِ حیات میں بھی اردو کا کوئی افسانوی مجموعہ اس سرزمین سے شائع نہیں ہوا تھا۔ اس مجموعہ میں افسانہ نگار نے وہ تمام افسانے شامل کر لیے تھے، جو ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۶ء تک کے عرصہ میں لکھے گئے تھے۔ انھوں نے اشاعت کے دوران صرف چیدہ چیدہ افسانے اس لیے شامل نہیں کیے کہ مستقبل کے محقق اور نقاد کو افسانہ نگار کی ذہنی پرداخت اور قوتِ تخلیق کا تجزیہ کرنے میں آسانی ہو۔ اسی طرح انھوں نے اپنے دوسرے افسانوی مجموعہ "میگھنا کی لہریں" میں بھی کوئی ردّ و بدل نہیں کیا، اور ۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۰ء تک کے تمام افسانوں کو شریک کر کے اپنی تحریر کی اصلیت برقرار رکھی۔ وہ مجموعہ ستمبر ۱۹۸۰ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آیا۔ ۱۹۷۱ء سے اگست ۱۹۷۵ء تک افسانہ نگار کا قلم بالکل خاموش رہا۔ طویل خاموشی کے بعد ستمبر ۱۹۷۵ء میں ان کا ایک افسانہ "آٹھ کروڑ کا زخم" منصۂ شہود پر آیا۔ یہ افسانہ بنگلہ زبان میں بھی ترجمہ ہو کر شائع ہوا۔ اس کے بعد افسانوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا، جو آج بھی جاری ہے۔

شام بارکپوری کا تیسرا افسانوی مجموعہ "جمنا کے دھارے" جون ۱۹۸۴ء

میں نکلا۔ یہ اپنی نوعیت کا بالکل اچھوتا اور انوکھا مجموعہ اس سرزمین سے شائع ہوا، جس سے افسانوی دنیا انگشت بدنداں رہ گئی۔ بیانیہ کہانیوں کے علاوہ استعاراتی اور علامتی اسلوب کا یہ مجموعہ گوناگوں خوبیاں اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ بنگلادیش کے ناساعد حالات میں جہاں اردو مغلوب ہوکر رہ گئی ہو اور اس کی شمع ٹمٹما رہی ہو، بادِ مخالف کے تند جھونکوں میں اتنی دیدہ دلیری، جرأت، سچائی اور حق کا چراغ روشن کرنا صرف اور صرف شام بارکپوری ہی کا کارنامہ تھا، جنھوں نے ساری دنیا کو دکھادیا کہ ایک ذمہ دار قلم کار اپنے قلم کی آبرو کا سودا نہیں کرتا، اور اپنی تخلیق میں صداقت کو پیش کرنے میں مطلق پس وپیش نہیں کرتا۔

شام بارکپوری کا قیام کھلنا میں، سُندربن کے قریب ہے، جو بنگلادیش کا سب سے بڑا اور حسین جنگل ہے۔ انھوں نے اُس بانس کو تراش خراش کر افسانوی ادب میں اپنے زورِ بیان سے بانسری کا ایسا سُر پھونکا کہ افسانے کے قارئین سحر زدہ ہوکر رہ گئے۔ ان کے افسانے نہ صرف قاری کے دل ودماغ کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں، بلکہ روح کی گہرائیوں میں اُتر کر خود فراموشی کی کیفیت طاری کردیتے ہیں۔ یہ شام بارکپوری کا کمال ہے کہ اپنے قاری کو ایک لمحہ کے لئے بھی ادھر اُدھر بھٹکنے نہیں دیتے۔ اس کے علاوہ اُن کے فن میں ایک اور خصوصیت در آئی ہے۔ اُن کے بیشتر افسانوں کا آخری جملہ حذف کردیا جائے یا کاٹ دیا جائے تو سرے سے وہ افسانہ ہی معلوم نہ ہوسکے گا۔ یہ اُن کے فن کی معراج ہے۔ چھٹی دہائی کے بعد اردو ادب میں کوئی ایسا افسانہ نگار پیدا نہیں ہوا، جس نے افسانے کی اس تکنیک کی طرف دھیان دیا ہو۔ کوئی اکّا دکّا افسانہ لکھ لے تو اور بات ہے۔ مگر اُسے فن کی حیثیت دینا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ ان کے افسانوں کی کن کن خوبیوں اور پہلوؤں کو گنوایا جائے۔ یہ گویا دریا

کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہوگا۔یہی وجہ ہے کہ شام بارکپوری بنگلا دیش کے دوسرے افسانہ نگاروں سے ایک منفرد حیثیت کے حامل ہیں۔

شام بارکپوری کے افسانوں کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے سے مندرجۂ ذیل باتیں نمایاں طور پر ہمارے سامنے آتی ہیں :

۱۔ مقامی رنگ و آہنگ

شام بارکپوری کے افسانوں میں سب سے اوّل جو بات اپنی طرف مبذول کرتی ہے، وہ ہے مقامی رنگ و آہنگ۔سب جانتے ہیں، بنگلا دیش جغرافیائی اور لسانی طور پر برصغیر میں ایک علیحدہ اور جداگانہ حیثیت رکھتا ہے، یہ حیثیت ازلی ہے۔اس دیس کے سینے کو چیرتی ہوئی کثرت سے چھوٹی بڑی ندیاں خلیج بنگال میں جا گرتی ہیں۔اس پر اُن کی شاخوں کا جال پورے ملک میں بچھا ہوا ہے۔یہی سب نہیں، بلکہ جگہ جگہ بڑی بڑی جھیلیں اور آبی خطّے پھیلے ہوتے ہیں، برسات میں اتھاہ سمندر کا سماں پیش کرتے ہیں۔کثرتِ بارش کی وجہ سے کبھی کبھی سیلاب آجاتا ہے، جو کھڑی فصلوں کو تباہ و برباد کرکے عام لوگوں کے لیے دکھ درد کا باعث بنتا ہے۔مگر دوسری طرف یہی بارش اور پانی لہلہاتے ہوئے سبزہ زار، سینکڑوں قسم کے پیڑ اور درخت، رنگ برنگ پھولوں کے باغات اُگاکر نہایت دلکش اور دل فریب فضا پیش کرتا ہے۔یہاں کی عام زبان بنگلا ہے۔اس کی وجہ سے یہاں کی ہر چیز پر اس زبان کی چھاپ ہے۔لوگوں کے ناموں سے لے کر، ان کی روایات، رہن سہن کے طریقے، کھانے پینے کے طرز، بول چال کے ڈھنگ، بود و باش کی ریت اور پہننے کے لباس وغیرہ سب پر اس مقامی زبان کے نقوش کندہ ہیں۔یہاں تک کہ پیڑوں، پھلوں، پھولوں پرندوں، جانوروں، مچھلیوں، سب کے نام بھی بہت حد تک الگ ہیں۔لہٰذا اردو افسانہ نگار یا ناول نویس جب یہیں کی سرزمین سے اپنی کہانی کا پلاٹ

اخذ کرتا ہے تو ان تمام چیزوں کو قابل برداشت حد تک اردو میں سمونا پڑتا ہے۔ ہمارے خیال میں ہر اس شخص کو جو اردو میں کچھ لکھنا چاہے، اس معاملے میں خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مگر داد دینی چاہیئے کہ شام بارکپوری اس مقام سے بڑی آسانی سے گزر گئے ہیں، اسی بات کو ہم نے "رنگ و آہنگ" لکھا ہے۔ ان کی تحریر شامیں یہی چیز ان کی امتیازی خصوصیت ہے۔ یہ خصوصیت اُن کے ناول، افسانوں اور افسانوی مجموعوں کے ناموں میں بھی، باحسنِ وجوہ پائی جاتی ہے۔ پریم چند کی طرح شام بارکپوری نے بھی عام لوگوں کی زندگیوں کو اپنا موضوع بنایا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پریم چند نے جس ماحول سے اپنے پلاٹ اور کردار لیے، شام بارکپوری کا گرد و نواح اُس سے جدا ہے۔ اس لیے پلاٹ بھی مختلف اور کردار کے قد و قامت، بول چال اور طور طریق الگ۔ اردو میں لکھنے والوں کے لیے برّصغیر کے دیگر علاقوں کی فضا کی بہ نسبت بنگلا دیشی ماحول قدرتی طور پر قدرے زیادہ سنگلاخ ہے۔ لہٰذا اُس منصبِ عُظمیٰ سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں۔

شام بارکپوری کے افسانوں میں بنگلا دیش کی زندگی کی عکاسی بہت نمایاں ہے۔ دیہاتی زندگی کی ترجمانی اُن کے ہاں بہت زیادہ ہے، اور بہت تفصیل سے ہے۔ گاؤں کے غریب کسان، مزدور یا مچھیرے مختلف حالات میں کیسے کیسے روحانی کرب و آلام کا شکار رہتے ہیں، اور کس کس طرح طبقاتی کشمکش میں اُن کی زندگیاں دکھ درد اور پریشانیوں میں مبتلا ہو جاتی ہیں، اور کیسے کیسے وہ اُن ساری مصیبتوں کو انتہائی صبر و شکیبائی سے برداشت کرتے ہیں، ان سب کے حالات و کیفیات کا بیان بڑے درد انگیز لہجے اور دلکش پیرایہ میں شام بارکپوری کے افسانوں میں ملتا ہے، جو اُن کی فنی صلاحیت کا مظہر ہے۔

۲۔ فطرتِ انسانی کا مطالعہ اور مشاہدہ:

شام بارکپوری کے افسانوں میں دوسری اہم بات فطرتِ انسانی کا مطالعہ اور مشاہدہ ہے۔ دنیا میں کوئی بھی لکھنے والا اچھا اور کامیاب افسانہ نگار نہیں بن سکتا، جب تک کہ وہ انسان کا نفسیاتی طور پر گہرا مشاہدہ اور مطالعہ نہ کر سکے۔ یہ ایک خداداد استعداد ہے، جو ان میں ودیعت ہوئی ہے۔ اس کی مدد سے وہ انسانی کردار اور فطرت کا مطالعہ اور مشاہدہ بڑی غائر نظر سے کرتے ہیں۔ اس عمل میں انسان کا نفسیاتی تجزیہ بھی شامل ہے، جو کسی عام آدمی کے لئے ممکن نہیں۔ اُن کو پیش پا افتادہ اشیاء میں بھی وہ حکمت اور راز ہائے سربستہ دریافت ہوتے ہیں، جو ہما شما کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتے۔ شام بارکپوری میں یہ قابلیت کامل طور پر پائی جاتی ہے۔ اس لیے وہ جس پلاٹ پر بھی قلم اٹھاتے ہیں، اس کا حق ادا کرتے ہیں۔ قاری کو کسی بات میں تشنگی محسوس نہیں ہوتی۔

۳۔ جزئیات نگاری:

شام بارکپوری کی کہانیوں کی ایک ذیلی خصوصیت ان کی جزئیات نگاری ہے، جو فطرتِ انسانی کے غائر نظر سے مطالعہ اور مشاہدہ کے نتیجے کے طور پر عمل میں آتی ہے۔ اُن کی یہ بات بالخصوص مناظرِ قدرت کی عکاسی میں پائی جاتی ہے۔ سچ پوچھئے تو کوئی بھی افسانہ نگار اس وقت تک کامیاب افسانہ نہیں لکھ سکتا، جب تک اس کی نگاہ عمیق اور جزرس نہ ہو۔ کسی کردار کا روپ ہو یا کسی منظر کی تصویر کشی، جب تک اس کا بیان تمام ممکنہ جزئیات پر مشتمل نہ ہو، اس وقت تک وہ بیان صرف سپاٹ مضمون رہ جاتا ہے۔ ایسی سادہ تحریر کے پڑھنے میں بھلا کسی کو کیا لطف آسکتا ہے۔ اس معاملے میں شام بارکپوری پر کوئی طعنہ زنی نہیں کر سکتا۔

۴۔ عشق و محبت کا عنصر:

عشق و محبت کا عنصر تخلیقِ آدم کے ساتھ ہی وجود میں آیا۔ لہٰذا اس کی تاریخ بھی بہت قدیم

ہے۔ مگر ہم یہاں اس کی تاریخ میں نہیں جانا چاہتے۔ وہ ہمارے موضوع بحث سے خارج ہے۔ یہاں صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ دنیا میں انسانی آبادی کا سلسلہ تاقیامت قائم رکھنے کے لیے قدرت نے انسان میں ایک تخلیقی قوت عطاکی ہے، جو دو متضاد جنس۔ مرد و زن میں باہمی کشش کا باعث بنی ہوئی ہے، اور اسی کشش کو عشق و محبت کا نام دیا گیا ہے۔ عشق و محبت کے ادبی بہت سے روپ ہیں۔ مگر قصہ کہانی میں اس کا اصلی روپ رہی ہے، جو مرد و زن کے مابین جبلی کشش میں پنہاں ہے، اور جس کے متنوّع بیانات کو اصطلاحاً رومان کہا جاتا ہے۔ دوسری صورتوں کی تفصیلات کے لیے مذہبی کتب یا دیگر ٹھوس ادبی سرمایہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے لیکن وہ صورتیں افسانوی ادب کے لیے موزوں نہیں ہیں۔ بلکہ اُن کے لیے مولانا رومی، حافظ، علامہ اقبال جیسے صوفی شعرا رہے ہیں۔

عشق و محبت کی باتوں میں بڑی رنگینی و رعنائی ہے۔ دنیا میں ہزاروں لوگوں نے لاکھوں طریقے سے حیات انسانی کے اس تصور کو پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں کثرت کثر لکھنے والوں سے لے کر بالکل آزاد اور عُریاں لکھنے والے بھی وجود میں آئے۔ کوئی زبان و ادب زندگی کے اس لازمی عنصر سے مستثنیٰ نہیں۔ بعض ناول نگاروں اور افسانہ نویسوں نے بہت ہی احتیاط برتی، اور شائستگی کے حدود میں رہ کر اپنے شہ پارے پیش کرکے دنیائے ادب میں اپنا سکّہ جمایا، اور بعض نے جن کی تعداد نسبتاً کم ہے، اپنی تحریروں میں عُریانیت کو روا رکھا۔ انھوں نے اس انداز بیان کا جواز یہ پیش کیا کہ یہ چیز تو ہماری زندگی اور معاشرے میں موجود ہے، اور اس کو سب کے سامنے پیش کرنا ہمارے فرض منصبی میں شامل ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس کو انھوں نے ترقی پسندی سے تعبیر کیا۔ یہ ترقی پسندی اچھی ہے کہ بُری، یہاں اس بحث میں ہم جانا نہیں چاہتے۔ اس موضوع پر اب تک بہت کچھ لکھا جاچکا ہے، اور آئندہ بھی لکھا جائے گا۔ ہماری بحث یہاں صرف شام بار کپوری سے ہے۔

اُن کو اس معاملے میں ہم نے کافی محتاط پایا ہے اور شاذونادر ہی ان کو شائستگی کی حدود سے تجاوز کرتے دیکھا۔ یہ اُن کی کریمُ النفسی اور شریفُ الطبعی ہے۔ ورنہ لکھنے کی گنجائش تو بہت تھی۔ کہیں ان کا قلم اگر بے پروا ہو گیا ہے، تو ہمارے خیال میں اُسے محض زیبِ داستان کے لیے سمجھنا چاہیے۔ افسانوی ادب میں بالعموم جن مضامین پر طبع آزمائی کی جاتی ہے، اُن میں اُس حد تک روا رکھا جا سکتا ہے۔

۵۔ زبان و بیان:

شام بارکپوری ایسے ماحول میں پلے بڑھے، جہاں اردو اور بنگلا دونوں زبانیں یکساں طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ اگرچہ بنیادی طور پر اُن کا تعلّق اردو ہی سے رہا ہے، اور اُن کے گھر میں بھی اردو ہی بولی جاتی ہے، لیکن بنگلا زبان و ادب سے بھی اُن کی واقفیت کم نہیں۔ اعلیٰ تعلیم انھوں نے لاہور میں حاصل کی، جو اردو کا ایک اہم مرکز ہے، اور وقت کے بہترین اساتذہ سے اردو پڑھی۔ اردو میں لکھنے کا چسکا تو بچپن ہی میں پڑ گیا تھا۔ اس پر ان کی خداداد ذہانت و فطانت الگ۔ اس لیے زبان خوب منجھ گئی، اور بیان میں نکھار پیدا ہوا۔ طالبعلمی کے زمانے سے لے کر اب تک بیرونی ممالک کا شوقیہ طور پر یا تجارتی اغراض سے سفر بھی کیا۔ بے شمار لوگوں سے ملے اور تبادلۂ خیال کیا۔ بالخصوص بڑ... کے اردو ادیبوں اور شاعروں سے دوستانہ مراسم پیدا کر کے استفادہ ... دیسی بدیسی ادب ہمیشہ زیرِ مطالعہ رہا، لہٰذا فطری طور پر معلومات میں اضـ... ہوتا گیا، اور نظر میں وسعت۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ افسانوی ادب ... اور اس کا طرزِ بیان کیا ہونا چاہیے۔ پلاٹ اور کردار کی مناسبت سے ... الفاظ، اصطلاحات و محاورات اور مکالمے آ جاتے ہیں۔ مگر وہ اردو ... کے تحمّل سے باہر نہیں ہو پاتے۔ یہ سب باتیں افسانے کے پلاٹ ... کی مقتضیات میں سے ہیں۔ ایک مختلف ماحول کی باتوں کو، اردو ... کا ایک مخصوص معیار بنا ہوا ہے، اس قدر سلاست اور روانی سے ...

ندازِ بیان میں ندرت پیدا کرنا، ہمارے خیال میں شام بارکپوری کا کمال ہے۔

شام بارکپوری کے طرزِ بیان میں بڑی شگفتگی ہے۔ وہ ہر چیز کو نہایت آسان، سادہ مگر پُرلطف زبان میں بیان کرتے ہیں۔ قاری جہاں ایک طرف نفسِ کہانی کا لطف اٹھاتا ہے، وہیں اندازِ بیان کی شگفتگی سے بھی محظوظ ہوتا ہے۔ اردو اور بنگلا الفاظ کا شیریں امتزاج، تشبیہات و استعارات کا مناسب استعمال اور انسانی نفسیات کا فنکارانہ تجزیہ۔ یہ باتیں ایسی ہیں کہ اُن کے افسانوں کی دلکشی میں اضافہ کرتی ہیں۔

۶۔ آفاقیت: جیسا کہ پہلے اشارتاً لکھا گیا ہے، شام بارکپوری کا فطرتِ انسانی کا مطالعہ اور مشاہدہ بڑا گہرا اور وسیع ہے جس کی وجہ سے اُن کے افسانوں میں مقامی رنگ و آہنگ کی بھرپور عکاسی کے باوجود آفاقیت پائی جاتی ہے۔ کیوں نہ ہو، انسانی فطرت تو سارے عالم میں قریب قریب ایک ہی قسم کی ہے، اور ایک ہی نوع کے واقعات سے ہر ملک میں لوگ یکساں طور پر حیرت و استعجاب، رنج و غم، نفرت و محبت، کینہ، حسد، رشک و رقابت جیسے فطری جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ ہنسنے اور رونے کے انداز میں بھی کوئی بنیادی تفاوت نہیں ہے۔ شام بارکپوری کے افسانے نفسیاتی مطالعے اور مشاہدے سے پُر ہیں، جو آفاقی رنگ لیے ہیں۔ اسی بنا پر اُن کے ہاں حقیقت شعاری کی مثالیں پیدا ہوگئی ہیں، تمام فطرتِ انسانی کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

۷۔ کردار نگاری: اخیر میں اُن کی کردار نگاری پر کچھ روشنی ڈال کر بات ختم کرتے ہیں۔ شام بارکپوری کے افسانوں کے بعض کردار مثالی ہوتے ہیں، جن کے اقوال و اعمال کو کوئی بھی نمونہ بنا سکتا ہے، اور ان کی فطرت سے سبق لے کر اپنے آپ میں حسن پیدا کرسکتا ہے۔ ان کے افسانوں میں کرداروں کا فطری ارتقا پایا جاتا

ہے۔ یہ بہت مشکل مرحلہ ہے۔ ہر کوئی اُس میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ لغزش ہو جاتی ہے۔ مگر شام بارکپوری اس معاملے میں بہت محتاط ہیں۔ اُس زمین پر ان کے قدم لڑکھڑاتے نہیں، بلکہ نہایت پامردی کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں، اور کرداروں کو جیتا جاگتا بنا دیتے ہیں۔ وہ کرداروں کی خصوصیات نمایاں کرنے کے لیے یا اُنہیں حقیقت کا لباس پہنانے کے لیے خود کردار کی زندگی کے ایسے واقعات پیش کرتے ہیں، جن سے وہ حقیقی معلوم ہوں۔

اختتامیہ: اگر شام بارکپوری کا موازنہ ٹالسٹائی، چیخوف، موپاساں، پریم چند، کرشن چندر، بیدی اور منٹو سے کیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اُن کے افسانوں کے سفر سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی انفرادیت کے ساتھ ایک نئی راہ پر گامزن ہیں۔ اُن کے افسانے جدید کہانیوں کا وہ گلدستہ ہیں، جن میں رنگ برنگ کے پھول سجے ہیں۔ جس طرح باغ میں سینکڑوں قسم کے پھول کھلے ہوتے ہیں، مگر گلاب کی حیثیت الگ ہی ہوتی ہے۔ بنگلادیش کی مٹی سے وہ گلاب کھلا ہے جس کی خوشبو سے اردو افسانوی ادب مہک رہا ہے۔

محمد رضوان اللہ

بہار کا ایک ہندو فارسی گو شاعر

منشی کیولا پرشاد فقیر

ثنا خوانِ علیؑ مرتضا ایم   مشرف بارگاہ مصطفا ایم
اگرچہ کفر باشد شیوۂ من   مگر مقبولِ درگاہ خدا ایم (فقیر)

بارہویں اور پھر تیرہویں صدی ہجری کا دور، بہار میں فارسی ادبیات کا عالم شباب ہے۔ بالخصوص فارسی شاعری، بہار کی مختلف خانقاہوں کی بدولت، بیحد مقبول ہو رہی تھی۔ بلکہ احمد اللہ ندوی کے بقول :۔

"بہار میں فارسی شاعری کا وجود ہی خانقاہوں کی بدولت ہوا[1]"

اس میں دو رائے نہیں کہ بہار میں فارسی شاعری کو عام کرنے میں، خانقاہوں کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ یہی وہ زرین دور ہے جب سرزمین بہار نے حضرت ابوالحسن فرد (صاحب سجادہ خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف) جیسا شاعر پیدا کیا جس کی غزل خوانی سے "بلبل آمد بفغان"، اور "گل ز گریبان بگذشت" بہت سے اساتذہ نے، ہندوستان میں امیر خسرو کے بعد، حضرت فرد ہی کو فارسی

جناب محمد رضوان اللہ آروی معرفت مولوی ثناء اللہ، محلہ شاہ گنج ڈاکخانہ مہندرو۔ پٹنہ

غزل گوئی کا امام تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ مولانا سعید حسرت عظیم آبادی (جو خود بھی صاحب دیوان شاعر ہیں) لکھتے ہیں:۔

در زمینِ ہند حسرت بعد خسرو ہمچو فرد
در گمان ما نشد پیدا غزلخوانے دگر

حضرت فردؔ کے علاوہ، اس دور میں جو صاحب سجادہ، فارسی شاعری کے گیسوئے تابدار کو اور تابدار کر رہے تھے۔ ان میں شاہ نورالحق طپاںؔ (خانقاہ عمادیہ) شاہ احسان اللہ احسان (خانقاہ مخدوم طویلہ بخش) شاہ امین رحمہ شوقیؔ (خانقاہ مخدوم الملک بہار شریف) اور شاہ عطا حسین فانیؔ (خانقاہ منعمیہ ابوالعلائیہ گیا) طور پر لائق ذکر ہیں۔

مختلف خانقاہوں سے اٹھنے والی ان مسلسل صداؤں سے برادران وطن متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ بالخصوص ان میں جو موزوں طبیعت کے حامل تھے، ان کے سمند شوق پر یہ آوازیں ایک تازیانہ ہوئیں۔ چنانچہ ان لوگوں نے بھی ان کی سخن رانی کے ساتھ اپنی سخن سنجی کا آغاز کر دیا۔ اور پھر زیادہ دیر نہیں گذری تھی کہ ہندو فارسی گو شعرا کا ایک پورا قافلہ تیار ہو چکا تھا اور بہار کی فضاؤں میں ان کی آوازیں بھی رچ بس چکی تھیں۔ اور بجا طور پر وہ لوگ یہ دعویٰ کرنے کے قابل ہو چکے تھے کہ ؏:

اپنا لہو بھی سرخیٔ شام و سحر میں ہے

اس دور کے ہندو شاعروں کے اس گروہ میں نند لال گویاؔ، اجاگر چند الفتؔ، لالہ رام چند فرحتؔ، راجہ پیارے لال الفتیؔ اور راجہ رام نرائن موزوںؔ کا ذکر تذکروں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ تاہم موزوںؔ ہی کے خانوادے کا ایک صوفی منش شاعر منشی کیولا پرشاد متخلص بہ فقیر ایک ایسا شاعر ہے جس کے متعلق فصیح الدین بلخی کے علاوہ تمام تذکرہ نگار خاموش ہیں۔

منشی کیولا پرشاد فقیرؔ مظفرپور کے رہنے والے تھے جو اس زمانہ میں ایک قصبہ ہوا کرتا تھا۔ افسوس ہے کہ تلاش بسیار کے باوجود مجھے ان کا سنہ پیدائش اور

سنہ وفات معلوم نہ ہوسکا۔ البتہ آثار و قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ۱۲۸۹ھ تک زندہ رہے۔ اب یہ کہنا تو مشکل ہے کہ اس وقت ان کی عمر کیا تھی۔ تاہم اس وقت تک ان کا کلام ان کی کہولت کا پتہ دیتا ہے۔ اور اس کی تائید مزید اس طرح بھی ہوتی ہے کہ جناب فصیح الدین بلخی نے اپنے تذکرے میں جناب فقیر کو ان "متوسطین ہند و شعرائے بہار" میں جگہ دی ہے جو تیرہویں صدی ہجری میں مشق سخن کرتے تھے[۲]۔ فقیر کی تعلیم و تربیت کا حال بھی پردۂ خفا میں ہے۔ تاہم ان کے کلام کی پختگی اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ وہ فارسی کے علاوہ عربی زبان کا بھی علم رکھتے تھے۔ فصیح الدین بلخی لکھتے ہیں:-

"منشی کیولا پرشاد ساکن مظفرپور۔ بڑے ذی علم انشا پرداز ادیب اور خوش نویس تھے۔ عربی، فارسی، سنسکرت اور اردو میں پوری دستگاہ رکھتے تھے[۳]۔"

ان کی تحصیلات کے ذیل میں بطور خاص ان کی خوشنویسی کا ذکر آتا ہے، اس فن پر عبور کامل رکھنے کی وجہ سے وہ "خورشید رقم" کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔ چنانچہ ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک رباعی کی خوبصورتی کا قصہ فصیح الدین بلخی کی زبانی سنیے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک رباعی اس قدر خوبصورت نستعلیق میں لکھی ہوئی ہے کہ اگر یاقوت المستعصم زندہ ہوتا تو اس کی پوری داد مل سکتی تھی۔ دیکھنے والوں کا اس صفحہ سے نظر ہٹانے کو جی نہیں چاہتا[۴]۔"

اور وہ رباعی یہ ہے:

اے کشور عیش زیر فرمان تو باد	بر خلق دو جہاں ہمیشہ احسان تو باد
ذات تو مقدس است و مقبول جہاں	ایں عید و ہزار عید قربان تو باد

شاعری میں فقیر کو، داروغہ سید مبارک علی بالا لب (ایک غیر معروف شاعر) سے تلمذ حاصل تھا، جن کی کئی غزلیں دیوان فقیر میں شامل ہیں۔ فقیر کی سوانح حیات

کا واحد ذریعہ ان کی ایک اردو مثنوی ہے جس سے ان کے حالات پر دھندلی سی روشنی پڑتی ہے۔ اس کے بعض اشعار اس بات کی طرف اشارہ کناں ہیں کہ منشی کیولا پرشاد، راجہ رام نرائن موزوں کی اولاد میں تھے۔ وہ کہتے ہیں: ؎

میں احوال اپنا لکھوں مختصر　　نہیں کذب کا اس میں کچھ ہے اثر

کہ تھے از بزرگان من رنگ لال　　دو فرزندان کو لکھوں ان کا حال

یہاں "دو فرزندوں" سے مراد رام نرائن اور ان کے بھائی دھیرج نرائن ہیں۔

منشی کیولا پرشاد کے آثار میں، فصیح الدین بلخی نے ایک اردو دیوان قلمی، ایک اردو مثنوی اور چند قلمی وصلیوں کا ذکر کیا ہے جو انہیں سید شاہ تقی حسن بلخی کے کتب خانہ سے دستیاب ہوئے تھے۔ مگر حیرت ہے کہ ان کی نگاہ سے فقیر کا ایک مطبوعہ فارسی دیوان مخفی رہ گیا۔!!!

فصیح الدین بلخی نے اپنا تذکرہ جولائی ۱۹۶۱ء میں مکمل کیا ہے جبکہ فقیر کا فارسی دیوان ۱۸۷۲ء ہی کے آس پاس مطبع متصلہ مظفرپور سے شائع ہو چکا تھا۔ اس دیوان کا ایک نسخہ خدابخش لائبریری میں محفوظ ہے

سر ورق کی اس عبارت سے دیوان کا مختصر صوری تعارف ہو جاتا ہے:۔

"من تصنیفات شاعر بے مثال شیریں مقال عاشق زار جیدر کرار منشی کیولا پرشاد صاحب خورشید رقمی لاجواب مسمی بہ دیوان فقیر معروف بہ عاقبت بخیر حسب فرمائش شیخ بہرام علی صاحب طالب العلم بمطبع متصلہ دھرم اودے واقع قصبہ مظفرپور ررونق طبع یافت۔"

دیوان کا کاتب، فتح محمد نامی ایک شخص ہے جو خود کو فقیر کا شاگرد کہتا ہے۔ دیوان کی طباعت ۱۸۷۲ء کے قریب عمل میں آئی ہے جیسا کہ آخری صفحہ کی عبارت سے پتہ چلتا ہے:۔

"کاتب فتح محمد، شاگرد مصنف رسالۂ ہذا ۳۱ دسمبر ۱۸۷۲ء"

اور یہیں پر ایک دلچسپ انکشاف بے محل نہ ہوگا۔ خدابخش لائبریری کی فہرست

ساز نے سنہ طباعت کے خانہ میں دیوان فقیر کی سنہ طباعت ۱۸۷۱ء لکھی ہے لیکن جیسا کہ درج بالا عبارت سے ظاہر ہوا کہ کاتب شیخ محمد کتابت کا کام ۱۸۷۲ء میں ختم کرتا ہے، پھر اس سے ایک سال قبل ہی ۱۸۷۱ء میں دیوان کس طرح چھپ سکتا ہے؟ اس مغالطہ نے دراصل یوں راہ پائی کہ آرہ کے ایک نامور حکیم قمرالدین حسین صاحب کی وفات ۱۸۷۱ء میں ہوئی۔ فقیر نے ان کی تاریخ وفات اس شعر سے نکالی:ـ

از سرِ چرخ چہارم بگذشت　　شمس طب کردہ غروب ای آہ آہ

۱۸۷۱ء

مصرعِ ثانی کے نیچے ۱۸۷۱ء لکھا ہے اور شعر کے نیچے یہ عبارت درج ہے:-

"در مطبع منظہر العجائب اور سے منظفر پور با ہتمام ابوالسکر کے چھاپی گئی"

اس عبارت پر دیوان ختم ہو جاتا ہے۔ ۱۸۷۱ء سے اس عبارت کا کوئی تعلق نہیں۔ وہ حکیم قمرالدین حسین کا سنہ وفات ہے نہ کہ دیوان کا سنہ طباعت۔

جناب فقیر کا یہ منفرد دیوان صرف حضرت علی کی منقبت پر مشتمل ہے۔ لہٰذا اس میں تنوع کی تلاش بے سود ہوگی۔ مجھے یاد آتا ہے کہ حضرت شاہ پھلواروی کے صاحبزادے حضرت علی حبیب نصر پھلواروی کے مجموعۂ کلام "دیوان معجز بیان" کا تعارف پیش کرتے ہوئے ایک اسکالر نے اپنے کسی مقالہ میں کہا تھا کہ یہ فارسی کا منفرد دیوان ہے جو صرف نعت رسولؐ پر مشتمل ہے۔ اسی طرح دیوان فقیر کے علاوہ، کوئی بھی ایسا دیوان میری نظر سے نہیں گذرا جو صرف حضرت علی کی منقبت و توصیف کے لیے وقف ہو۔ تاہم جس طرح حضرت نصر کے دیوان میں نعت کے علاوہ، چند منقبتیں بھی مل جاتی ہیں، اسی طرح دیوان فقیر میں منقبت کے علاوہ نعتیں بھی جلوہ نما نظر آتی ہیں ——— ذات رسالت مآبؐ سے جناب فقیر کی جذباتی وابستگی کا ثبوت دیوان کا پہلا ورق الٹتے ہی مل جاتا ہے۔ دیوان کے آغاز میں ہی لفظ "بسم اللہ" کے فوراً بعد درود شریف دیکھ کر بعد از خدا

بزرگ توئی،، کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ان کی نعت کا ہر شعر ان کے جذبۂ خلوص کا عکاس اور ان کی والہانہ عقیدت کا مظہر ہے :۔

یا شفیع عاصیاں یا پیشوای انبیا — یا محمد مصطفےٰ محبوب ذاتِ کبریا
ہر در عالم سر بسر مشکور فیض عام تو — فیض بخشِ دو جہان و دستگیر اغنیار
ور ددار د نام تو یا رحمۃ للعالمین — ایں گدای مضطر و عاجز فقیر بے نوا

اور آنحضورؐ کے تئیں ان کا جذبۂ عقیدت جب مزید نکھرا تو حیرت انگیز طور پر وہ ٹوٹ کر بکھر گئے۔ معلوم ہوتا ہے اب وہ اس حقیقت کا سراغ پا چکے تھے کہ یہی وہ "ادب گاہ" ہے جو "زیر آسمان" عرش سے بھی نازک تر ہے لہٰذا یہاں ٹوٹے ہوئے دل اور بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ ہی آنا چاہیئے۔ دیکھیے کتنی بے بسی کے ساتھ فریاد کناں ہیں :۔

بسر بار گراں دارم اغثنی یا رسول اللہ — تحمل زان نمی آرم اغثنی یا رسول اللہؐ
شفیع عاصیاں ہستی شفیع لمذنبیں امت — خداوندا گنہگارم اغثنی یا رسول اللہؐ
فقیر بے نوا خواند بایمان ولیقین از دل — توئی شاہا مددگارم اغثنی یا رسول اللہؐ

تاہم میری نگاہ میں ذات رسول سے ان کی عقیدت کا اصل شناس نامہ ان کا وہ "ہفت بند" نعت شریف ہے جو انھوں نے ۱۲۸۶ھ میں مظفر پور میں قلمبند کیا اور جس کا پہلا بند فصیح الدین بلخی نے اپنے تذکرہ میں نقل کیا ہے۔ یہ معرکۃ الآرا نعت، ان کے دیوان میں شامل نہیں۔ فصیح الدین بلخی کی تحریر کے مطابق یہ کلام انہیں خانقاہ نئو حہ کے کتب خانہ سے دستیاب ہوا جس کے صفحۂ اول پر یہ عبارت درج ہے :۔

"بعنایت الٰہی ہفت بند نعت شریف فقیر عاصی کیولا پرشاد خورشید رقمی طبع زاد خود بقصبہ مظفر پور قلمی نمود۔ ۱۲۸۶ھ ؁ "

پہلے بند سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے، اور اس کافر کی مومنانہ شان پر قربان جائیے :۔

السلام اے فیض ذاتت باعث دنیا و دیں — السلام اے ذات پاکت رحمۃ للعالمین
السلام اے بارگاہت، بارگاہ کبریا — السلام اے آستانت مہبط روح الامین
از طفیل خیر تو، معدوم شد شر از جہاں — خود خدا فرمود داستان تو خیر المرسلین
درد دارد دہر نفس شاہا فقیر بے نوا — یا محمد مصطفیٰ دریا علی مرتضیٰ

لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا، جناب فقیر کا اصلی کارنامہ حضرت علی کی منقبت ہے، جس سے ان کا سارا دیوان بھرا پڑا ہے۔ مجموعی طور پر ان کے دیوان میں ۱۳۲ غزلیں ہیں، جن میں سے بیشتر غزلیں پانچ شعروں پر مشتمل ہیں۔ دوسرے شعراء کی سات غزلیں بھی شامل دیوان ہیں۔ غزلوں کی ترتیب ردیف وار حروف تہجی کے اعتبار سے رکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اٹھاون رباعیات بھی اس دیوان کی زینت ہیں۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ چند ایک غزلوں سے قطع نظر تمام غزلیات و رباعیات کا عنوان "یا علی مدد" رکھا گیا ہے۔ اس عنوان سے جناب فقیر کے "عاشق زار حیدر کرار" ہونے کا ثبوت مل جاتا ہے۔ لیکن ایک رنگ میں ہونے کے باوجود، جناب فقیر کا دیوان دلچسپی سے خالی نہیں۔ ایک مضمون میں پورا دیوان تیار کر دینا اور آخر تک دلچسپی برقرار رکھنا، آسان کام نہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں یہ جناب امیرؑ کے عشق کا اعجاز ہے کہ جناب فقیر کے اس "یک رنگے" دیوان میں "دھنک رنگ" کی سی کیفیت دیکھنے کو ملتی ہے۔ دیوان کی پہلی غزل، دیوان حافظ کی پہلی غزل کی زمین میں ہے۔ جناب امیر کی شان میں، جناب فقیر کہتے ہیں:

شود آساں ز نام تو جہاں را جملہ مشکلہا — یقین فیض عام تو چہ افزا است دلہا
بہ بحر عشق غواصم، تموج دارم از مستی — نمیدانند حال ما سبکساران ساحلہا
بہ عشق مرتضیٰ مستم، فقیر بے ریا ہستم — دلم گوید بیا دنیا کہ اُہمل ثمّ اہملہا

اسی طرح حافظ کی ایک دوسری غزل "غلام نرگس مست تو تاجدارانند" کی زمین میں جناب فقیر کی یہ منقبت بھی ایک خاص کیف کی حامل ہے۔ وہ کہتے ہیں:

غلام سرور کونین تاجدارانند — فدائی حضرت حسنین شہریارانند

بہشت خلد مقام است خادمان علی — کہ خادمانِ علی خاص دوستدارانند
ہزار شکر خدا می کند فقیر گدا — کہ دوستانِ علی جملہ کامگارانند

جس دل میں حُبّ علی نہ ہو، اسے جناب فقیر "زجاج" سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے: ؎

گوہر است الّا اگر حُبّ تو نیست — بی گمان دانیم او را چوں زجاج

اور کیوں نہ ہو، جب "تکمیل ایمان" کی شرط ہی "حُبّ علی" ٹھہری۔ فقیر ہی کا شعر ہے: ؎

باعث تکمیل ایماں حُبّ تو — والیٔ اسلام و ایمان الغیاث

جناب فقیر کو شیعہ تو قرار نہیں دیا جا سکتا اس لیے کہ بقول خود وہ "بروں از اسلام" ہیں۔ تاہم شیعہ عقائد سے وہ انتہائی متاثر نظر آتے ہیں، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ کہیں کہیں حضرت علی کی مدح و توصیف میں غلو کی حد تک آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ان کے اس مزاج کو سمجھنے میں ان کی یہ رباعی ہماری بڑی مدد کرتی ہے: ؎

علی شیر خدا و یار او مشکل کشائی من — علی مرتضیٰ در دردِ عشقِ او دوائی من
بروں از کفر و اسلام نہ شیعہ ام نہ سنی ام — علی را من خدا خوانم علی باشد خدائے من

اس کی روشنی میں جب ہم ان مبالغہ آمیز اشعار کو دیکھتے ہیں تو ہمیں کوئی تعجب نہیں ہوتا: ؎

نباشد مومناں را اندریں شک — بُوَد قرآن کلام شاہِ مرداں

اور: ؎

نبوت راز ذاتت فیض و فخر است — زیارت نور ایماں آفریدند

گمان غالب ہے کہ فقیر کی اس انتہا پسندی کی وجہ سے ان کے مخالفین کا ایک گروہ ان کے درپئے آزار ہو گیا تھا۔ فقیر کھل کر اس کا اعتراف تو نہیں کرتے تاہم ان کے بعض اشعار سے اس کا اشارہ ملتا ہے۔ مثلاً: ؎

از جفائی ناسزایان خاطرم صد پارہ شد | دور کن از خاطرم، رنج دمحن یابوتراب

از نرس پامال فرما، دشمنم را ہچو فرش | این خر علیسٰی است ناحق درپئے آزار ما

کاش، اس "خر علیسٰی" کا پتہ چلتا تو بہت سی دلچسپ باتیں سامنے آتیں۔

تاہم ان تمام باتوں کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ دیوان نقیر میں ایسی انتہاپسندی کی مثال آٹے میں نمک کی سی ہے۔ عمومی طور پر انھوں نے حضرت علی کی مدح سرائی مثبت انداز میں کی ہے۔ وہ منفرد طریقہ سے بارگاہ علی میں حاضر ہوتے ہیں اور مختلف انداز و آہنگ سے اپنی غلامی کا اعتراف اور اپنی وفاداری کا اقرار کرتے ہیں ـــــ چونکہ ان ساری غزلوں کا موضوع ایک ہی ہے، صرف طرز اظہار میں فرق ہے، اس لیے میں بغیر کسی تبصرہ کے، مختلف غزلوں سے متفرق اشعار پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ آپ اس "گلستاں" سے پوری "بہار" کا اندازہ کر سکتے ہیں ؎

جاں نثارم بر غلامت یا علی مرتضیٰ | ہر نفس ورد است نامت یا علی مرتضیٰ
این فقیر بینوا ممنونِ احسانت مدام | مستفیض فیض عامت یا علی مرتضیٰ

بر حال ما نظر کن شیر خدا خدا را | شاہا عجب چہ باشد سلطاں کنی گدا را
در ظاہری فقیرم در باطنی امیرم | مولاست دستگیرم ہیچ است دو سرا را

ذرہ ام لیکن ز مہر بوتراب | آشنا ہم آشنا ہم آفتاب
این فقیر ناتواں از دور چرخ | چارہ باشد یا علی زار و خراب

بجز مدح علی کارم نباشد | ز نام کس سر و کارم نباشد
ز خاک پائی شاہ بوتراب ہم | زمیں را نیز آزارم نباشد

زکوبت باغ رضواں آفریدند — زمویت سنبلتاں آفریدند
نبوت راز ذاتت فیض وفخر است — زنامت نور ایماں آفریدند
چساں من شکر ایں نعمت گذارم — کہ مارا منقبت خواں آفریدند

پاشاہ دیں پناہ شود عاقبت بخیر — از لطف یک نگاہ شوق عاقبت بخیر
در خادمم چوں عشق شہ مرتضیٰ شود — بی ریب و اشتباہ شود عاقبت بخیر

یکی از خادمانِ خاندانم — بمدح مرتضیٰ رطب اللسانم
فزاید روح از فیضان نامش — بذکر مرتضیٰ بس شادمانم
زفیض حضرت والا بعالم — فقیر حیدری نام دنشانم

عرش ہم بالا نباشد از آستانت یا علی — عرش و کرسی ہست قربان مکانت یا علی
آرزو دارند ہر جن و بشر حور و ملک — بر در دولت شوم از خاندانت یا علی
ایں فقیر نا تواں راہست امید قوی — از طفیل فیض عام کامرانے یا علی

ان اشعار کے تناظر میں، جناب فقیر کی یہ تعلّی گراں نہیں گذرتی ایسی اردو رباعی میں وہ مستانہ وار کہتے ہیں:-

ہے نقل ہفت بند وظیفہ فقیر کا — منشی ہوں بارگاہِ تخت جناب امیر کا
مولا نے وہ عروج دیا اس فقیر کو — چکرا رہا ہے ہوش فلک پر دبیر کا

جناب امیر کے علاوہ، فقیر نے خاص طور پر دو اور بزرگوں کی مدح کی ہے۔ ان میں ایک حضرت سیدنا امیر ابو العلا قدس سرہ ہیں جو سلسلہ کے بانی بھی ہیں۔ اور دوسرے حضرت شاہ منیر عرف شاہ منیری علیہ الرحمۃ

اس سلسلہ کے نامور پیر طریقت بھی رہے ہیں ——— واضح رہے کہ ابوالعلائیہ سلسلہ کے بزرگوں کو امام زین العابدینؓ سے نسبت فرزندی حاصل رہی ہے اور ان کا مادری نسب نامہ امام علی موسیٰ رضاؓ سے جا ملتا ہے۔ اس طرح جناب نقیر کی یہ دونوں منقبتیں حضرت علی سے الگ ہوتے ہوئے بھی ان سے الگ نہیں۔ یہ جناب نقیر کے "شیعیانہ مزاج" کا بڑا اہم اور باریک نکتہ ہے جسے سمجھنے کے لیے ہمیں تاریخ کی تفصیل میں جانا ہوگا۔

حضرت سیدنا امیر ابوالعلا قدس سرہ، حضرت امیر تقی الدین کرمانی رح کی اولاد میں تھے، جو بقول سید شاہ عطا حسین فانی:

"نسبت فرزندیت بہ سادات حسینی العابدی دارند و نسب فرزندی مادری بحضرت خواجہ عبیداللہ احرار نقشبندی قدس سرہ می رسانند"

جناب نقیر کے لیے ایک تو یہ سبب باعث کشش تھا، لیکن خاص طور پر ان کی "شبلی حس" کو جس چیز نے برانگیختہ کیا وہ میرے خیال میں یہ روایت تھی جسے صاحب کیفیت العارفین نے بایں الفاظ نقل کیا ہے:-

"شبی ذات بابرکات (یعنی حضرت امیر سید ابوالعلا) از ارواح طیبات حضرت نبینا سید المرسلین محمد و آلہ وسلم و حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ و شہزادگان سلطین سعیدین، شہیدین، سیدنا ابی محمد الحسن و سیدنا ابی عبداللہ الحسین سید الشباب اہل الجنۃ رضی اللہ عنہما بوا… باب گردید دراں عالم حضرت نبینا صلی اللہ علیہ وسلم موئے سر ارشاد… حضرت شیر خدا کرم اللہ وجہہ خرقۂ خلافت عرفانی پوشانیدند"

حضرت امیر ابوالعلا کا وصال ۱۰۶۱ھ میں ہوا اور آگرہ میں دفن ہوئے۔

ان حالات کی روشنی میں جناب نقیر کے ان اشعار کو سمجھنا زیادہ آسان ہوگا جو انھوں نے حضرت امیر ابوالعلا کی مدح میں کہے ہیں:-

جلوہ نور خدا یا ابوالعلا　　نور عین مصطفیٰ یا ابوالعلا یا ابوالعلا

حامیِ دینِ محمد، جانشینِ مرتضیٰ | قدرتِ دستِ قضا یا بوالعلا یا بوالعلا
از قدومت آگرہ شد رونقِ ہندوستاں | چون نباشد جانفزا یا بوالعلا یا بوالعلا
وردِ ما بادر ثنایت ہر نفس شام و سحر | این فقیرِ بینوا یا بوالعلا یا بوالعلا

دوسرے بزرگ، جیسا کہ میں نے عرض کیا، حضرت شاہ منیر عرف شاہ منیری علیہ الرحمۃ ہیں، جو حضرت مخدوم منعم پاک قدس سرہ کے مرید و خلیفہ تھے۔ ان کے حالات میں عطا حسین فانی نے یہ چند سطور لکھنے پر اکتفا کیا ہے: ؎

"شاہ منیری علیہ الرحمۃ متوطن علاقہ بہار در مجلس حضرت قطب العالم (ملقب مخدوم منعم پاک قدس سرہ) حاضر شدہ یکے از معتقداں گشتہ شرفِ بیعت حصول نمودند، بعدہ در صحبتِ عالیہ ماندہ اند توجہ و تعلیم مراقبہ و اذکار تربیت یافتہ مشرف بہ خلافت گردیدہ بہ یاران تربیت می نمودند از سال و ماہِ وصال ایشان مطلع نیست شد۔"

ان کی شان میں جناب فقیر کہتے ہیں: ؎

این ہند مستفیض زفیضِ بہار شد | از حضرت منیر ہمہ پُر بہار شد
جنّ و بشر طواف کنند این مقام را | ہندوستان را شرفی از بہار شد
فیاضی بہار فزوں از خیال خلق | از حضرت بہار جہاں کامگار شد

دیوان کے آخر میں چند قطعاتِ تاریخ ہیں۔ پہلا قطعہ شاہ امام علی صاحب، برادر بزرگ حضرت مولوی امداد علی صاحب خان بہادر کے لیے ہے جنھیں جناب فقیر اپنا مرشد کہتے ہیں۔ یہ چار اشعار کا قطعہ اس اعتبار سے ندرت کا حامل ہے کہ اس کے ہر شعر کے پہلے حرف سے تاریخ نکالی گئی ہے: ؎

راہِ جنت گرفت مرشد من | مستفیض فیوض لم یزلی
غیرتِ مہر و ماہ بود رخش | اسم او سید امام علی
فکرِ تاریخ آں چو کرد فقیر | گفت ہاتف بعد خلوص دلی
حرفِ اول بگیر از ہر شعر | جملہ تاریخ شد بطرز جلی
۱۲۸۵ھ

اس کے بعد بالترتیب راحت علی قاضی پوری اور مولوی عبدالعزیز بکھروی کے قطعات تاریخ ہیں۔ مولوی عبدالعزیز بکھروی مرحوم کے قطعۂ تاریخ میں جناب نقیرؔ نے ایک عجیب شعر کہا ہے:۔ ؎

دمی وا پسیں یا علی گفت ومُرد   زہی اعتقادات عبدالعزیز

پھر آرہ کے ایک رئیس اور مشہور حکیم جناب قمرالدین حسین کے لیے تین قطعات تاریخ ہیں۔ ایک اردو میں اور دو فارسی میں۔ آخر میں لالہ امرت لال نامی ایک شخص کا قطعۂ تاریخ ہے۔ ان کی ذات سے متعلق جناب نقیرؔ نے کوئی صراحت نہیں کی۔ تاہم لفظ "عزیز دلم" سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کے فرزند تھے۔ نقیرؔ کہتے ہیں:۔ ؎

از جہاں رفت چون عزیز دلم   نام او بود لالہ امرت لال   الخ

مجموعی طور پر بلحاظ کمیت، دیوانِ نقیرؔ شاید قابل اعتنا نہ ٹھہرے تاہم کیفیت کے اعتبار سے اس کی اہمیت اور قدر و قیمت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ پورے دیوان کا صرف حضرت علی کی مدح و توصیف پر مشتمل ہونا بجائے خود ادبی دنیا کا ایک نادر واقعہ ہے اور اس پر مستزاد صاحبِ دیوان کا غیر مسلم ہونا اور بالخصوص بہار کے لیے یہ بات باعثِ افتخار ہے کہ سب سے پہلے یہ اعزاز اس صوبہ کو حاصل ہوا۔ لہٰذا ان حقائق کے تناظر میں، منشی کیولا پرشاد نقیرؔ کے اس دیوان کو بہار کی "اوّلیات" میں شمار کرنا چاہیے۔

حواشی

۱؎ احمد اللہ ندوی۔ تذکرہ مسلم شعرائے بہار (حصہ اول) دیباچہ

۲؎ فصیح الدین بلخی۔ تذکرہ ہندو شعرائے بہار۔ صفحہ ۲۹

۳؎ ایضاً

۴ے فصیح الدین بلخی، تذکرہ ہندو شعرائے بہار صفحہ ۱۵۱
۵ے ایضاً صفحہ ۵۰
۶ے شاہ عطا حسین فانی، کیفیت العارفین صفحہ ۲
۷ے ایضاً صفحہ ۳
۸ے ایضاً

بقیہ تبصرہ و تعارف

جگہ تشریحی حواشی بھی لکھے ہیں اور نامکمل حوالوں کی تکمیل کے علاوہ بہت سے نئے دلائل کا اضافہ بھی کیا ہے۔ چنانچہ "حرف آغاز" کے تحت وہ لکھتے ہیں کہ:

"ابتداً احقر نے اس رسالے کا اردو ترجمہ کیا، مگر پھر محسوس ہوا کہ اگر اس میں کچھ اضافے اور کر دیئے جائیں تو انشاء اللہ یہ بہت مفید کتاب بن جائے گی۔

" چنانچہ احقر نے اس پر تحقیقی اور علمی حواشی کا اضافہ کیا، اور جس جس مقام پر تفصیل و وضاحت کی ضرورت تھی وہاں شرح و بسط سے کام لیا۔"

کتاب کے شروع میں ایک طویل مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں انسان کے فطری تقاضوں اور عقل اور وحی الٰہی کی روشنی میں ان کا حل نیز موسیقی کے مفسدات سے بھی تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ "تکملہ" کے تحت غنا کی اباحت کے سلسلے میں رائج شبہات کا تفصیلی و تحقیقی جواب دیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں مفصل کتابیات بھی درج ہے۔ مجموعی طور پر یہ کتاب متعلقہ موضوع پر گرانقدر اضافہ ہے۔

محمد عرفان

تبصرہ وتعارف

نام کتاب : اسلام اور موسیقی (مصنفہ مفتی محمد شفیع رح)
نام مترجم : محمد عبدالمعز
ناشر : مکتبہ الفلاح، دیوبند (یو۔پی)
قیمت : ۴۸ روپے

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سامان تفریح انسان کی قوت کار میں اضافہ کا ذریعہ بنتے ہیں اور ایک تھکے ماندے شخص میں عمل کی نئی روح پھونکتے ہیں۔ اسلامی طرز زندگی میں بھی، جو کسی انسان کے فکر وتدبر کا نتیجہ نہیں بلکہ خالق کائنات کا بنایا ہوا طرز زندگی ہے، اور جس میں کسی قسم کا کوئی غلطی اور خطا نہیں، تفریح طبع کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے، البتہ صرف ان تفریحات کی اجازت دی گئی ہے کہ جو تعمیری اور مفید ہیں اور ایسی تفریحات کی ممانعت کر دی گئی ہے جو تخریبی اور مضر ہیں۔ موسیقی کے بارے میں علماء میں اختلاف کی ایک بڑی وجہ شاید یہ رہی ہے کہ بعض اسے فن لطیف نہیں بلکہ تخریبی تفریح اور لہو ولعب سمجھتے ہیں جبکہ دوسرے جو اس کی اباحت کے قائل ہیں ان کا خیال اس کے برعکس ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں بعض کتابیں بھی سامنے آئی ہیں مثلاً شاہ محمد جعفر پھلواروی کی اسلام اور موسیقی جو گزشتہ برسوں میں کافی عرصہ تک بحث کا موضوع رہی۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی کتابیں ہیں جن میں موسیقی کا جواز تلاش کیا گیا ہے۔ ان کتابوں میں عموماً جو دلیلیں دی جاتی ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں کہ غنا وموسیقی انسان کے ذوق جمال کی تسکین کا ذریعہ ہیں اور ذوق جمال ایک فطری جذبہ ہے اس لیے کہ انسان بہت لطیف جذبات دے کر پیدا کیا گیا ہے علاوہ ازیں تخلیق کائنات میں بھی ان لطیف جذبات

کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ بعض حضرات جو اباحت غنا کے قائل ہیں یہ بھی کہتے ہیں کہ موسیقی روح کی غذا ہے اور ایسی چیز جو روح کی غذا ہو حرام نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح یہ دلیل بھی دی جاتی ہے کہ غنا و مزامیر کو حرام کہنا اس لیے صحیح نہیں کہ بائیبل کے صحیفہ زبور کے مطابق حضرت داؤد علیہ السّلام گیت گاتے اور دف و بانسری بجایا کرتے تھے نہ صرف یہ بلکہ انھوں نے ایسے لوگوں کا ایک پورا گروہ بنا رکھا تھا۔ اس بات کا اقرار شارح بخاری علامہ بدرالدین عینی اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی کیا ہے۔ ایک اور دلیل یہ بھی دی جاتی ہے کہ صحابہ کرام تابعین تبع تابعین فقہاء اور محدثین میں بعض ایسے افراد نظر آتے ہیں جو غنا و مزامیر سے لطف اٹھاتے تھے خصوصاً صوفیائے کرام تو اس معاملے میں پیش پیش تھے اور ان سب حضرات کو خطاکار و گمراہ کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ اور اسی طرح کی متعدد دلیلیں ہیں جو غنا و موسیقی کی اباحت کے سلسلے میں عام ہیں اور ان سے عوام تو درکنار بعض علماء تک غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں۔ چنانچہ پاکستان کے مشہور عالم مولانا مفتی محمد شفیع مرحوم نے ان تمام دلائل کے رد میں "کشف العناء عن وصف الغناء" کے نام سے عربی میں ایک رسالہ تالیف کیا تھا جو درحقیقت ان کی مشہور عربی کتاب احکام القرآن کا ایک جز تھا۔ اس میں انھوں نے قرآن و حدیث، فقہائے امت کے اقوال، مستند صوفیائے کرام اور اصحاب طریقت کے حوالوں سے موسیقی کی شرعی حیثیت واضح فرمائی اور ثابت کیا ہے کہ موسیقی قرآن و حدیث کی روشنی میں ناجائز ہے اور فقہاء امت کے چاروں مکاتب فکر اس مسئلے پر متفق ہیں۔

یہ رسالہ چونکہ عربی زبان میں تھا اس لیے اس کے اردو ترجمہ کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کی جا رہی تھی اور یہ کام مولانا عبدالمعز صاحب (استاذ و رکن دارالتصنیف، دارالعلوم کراچی) نے بہت خوبی کے ساتھ انجام دیا۔ انھوں نے نہ صرف اصل کتاب کا سلیس اور شگفتہ اردو میں ترجمہ کیا بلکہ جگہ

(بقیہ صفحہ ۳۲۵ پر)

سالانہ قیمت ۱۵ روپے

جامعہ

قیمت فی شمارہ ڈیڑھ روپے

جلد ۸۳ | بابت ماہ دسمبر ۱۹۸۶ء | شمارہ ۱۲

فہرست مضامین

مجلس ادارت

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی۔ مطبوعہ جمال پریس دہلی ۶۔ ٹائیٹل۔ فائن پریس دہلی۔

شذرات

اکتوبر اور نومبر کے مہینے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں مذاکرہ کی چار محفلیں منعقد ہوئیں، ان میں تین تو سمینار کے طرز کی تھیں اور ایک سمپوزیم تھا، اکتوبر میں شعبہ سیاسیات کی طرف سے جو سمینار ہوا اس کا موضوع 'پنڈت نہرو قومی زندگی اور بین الاقوامی معاملات' تھا، اسی مہینے میں جامعہ ملیہ کے یوم تاسیس کے موقع پر شعبۂ تاریخ کی جانب سے ایک سمپوزیم منعقد کیا گیا۔ سمپوزیم کا موضوع تھا 'قومی اتحاد و یکجہتی'۔ نومبر کے وسط میں جامعہ ملیہ اسلامیہ اور حکومت ہند کے اقلیتی کمیشن کے اشتراک سے 'تعلیم اور امن' کے موضوع پر سمینار منعقد ہوا جس میں ملک میں بڑھتے ہوئے تشدد کے پیش نظر سیکولرزم کے نظریے پر کئی زاویۂ نگاہ سے بحث کی گئی۔ چوتھا سمینار جو شعبۂ اسلامک اور عرب ایرانین اسٹڈیز کے زیر اہتمام ہوا اور جس کا موضوع 'سعدی اور ہندوستان' تھا بین الاقوامی حیثیت کا تھا جس میں ایران کے تین اسکالرز اور روس کی ایک خاتون اسکالر شریک ہوئیں۔ ان کے نام یہ ہیں: آغای محمد اعظم زادہ خراسانی (دانشگاہ مشہد)، علی اکبر الٰہی خراسانی زبنیادپژوہشہای اسلامی آستان قدس رضوی، مشہد)' آغای مصطفیٰ رضوی (تہران یونیورسٹی) اور ڈاکٹر لیلا احمد جانووا (سوویٹ یونین) یہ چاروں مذاکرے بہت کامیاب رہے، بڑے اچھے مقررین اور مقالہ نگاران میں شریک ہوئے جن کے ارشادات سے ہمارے طالب علموں اور دوسرے سامعین کو بھی بڑا علمی فائدہ پہونچا۔ انھیں عرصہ تک یاد رکھا جائے گا۔

'سعدی اور ہندوستان' کے موضوع پر جو سیمینار ہوا وہ تین دن پر پھیلا ہوا تھا، اس میں کلیدی مقالہ پروفیسر نذیر احمد کا تھا جو ایک لحاظ سے سیمینار کا خطبۂ افتتاحیہ بھی تھا، بڑا عالمانہ تھا یہ مقالہ، اور اس میں نئی نسل کے فارسی زبان و ادب کے محققین کے لیے تلاش و تحقیق کے کئی گوشے سامنے لائے گئے تھے، اس سیمینار میں کل انتیس مقالے پڑھے گئے اور کئی اہم تقریریں ہوئیں، فارسی زبان میں جو مقالے پڑھے گئے وہ زبان و معنی دونوں اعتبار سے قدر مکرر کا مرتبہ رکھتے تھے۔ کلکتہ، پٹنہ، علی گڑھ، لکھنؤ، دہلی (دہلی یونیورسٹی، جواہر لعل یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ) کی یونیورسٹیوں اور عثمانیہ یونیورسٹی (حیدرآباد) کے مندوبین اس سیمینار میں شریک ہوئے، پورے سیمینار میں ایک عالمانہ وقار پایا گیا اور جو مقالے پڑھے گئے وہ بحیثیت مجموعی بڑے معیاری تھے۔

---

۱۴ نومبر کو 'سعدی اور ہندوستان' والے سیمینار کے افتتاحی جلسے کی صدارت مدیر جامعہ نے کی تھی۔ اس نے جامعہ کی طرف سے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ "سعدی جہانیاں جہاں گشت تھے، اپنی سیاحتوں کے دوران نہ معلوم انھیں کتنی مختلف ثقافتوں کا سامنا اور تجربہ ہوا ہوگا، اس نے ان کی شخصیت کو ایک عالمی اور ہمہ جہتی شخصیت بنا دیا تھا، ایک کوسموپولیٹن شخصیت، ایسی شخصیت کے افکار و اقوال کے لیے ہندوستان کی سرزمین جہاں کثرت میں وحدت کا جلوہ پیدا تھا اور جس کی تہذیب مختلف رنگ کی ثقافتوں سے مل کر بنی تھی، بڑی سازگار تھی، اس لیے اس سیمینار کے موضوع میں بڑی گہرائی اور وسعت ہے۔ پھر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد، تعمیر و تشکیل اور ارتقا کا جو مزاج رہا ہے، وہ بھی سعدی کی طبیعت کی فراخی، ذہن کی وسعت و کشادگی اور ان کی بالغ نظری سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ جامعہ میں فارسی شعر و ادب کا ہمیشہ سے چرچا رہا ہے، یہاں کے ارباب علم و دانش نے فارسی شاعری کے حسن سے اپنی تحریروں میں دلکشی اور اثر آفرینی پیدا کی ہے، اس میں مذکور تہذیبی اعلا اخلاقی قدروں کو اپنے نثر پاروں میں موضوع سخن بنایا ہے، اور سعدی کی گلستان اور بوستان میں معا

آداب اور اخلاق و عمل صالح کا جو درس دیا گیا ہے، یہاں کے معلموں نے اُس سے اپنے طالب علموں کی سیرتوں کی تعمیر میں بڑا کام لیا ہے۔"

مدیر جامعہ نے یہ بھی کہا کہ "ہندوستان نے فارسی شعر و ادب کا ذوق کھو کر اپنے آپ کو ایک بڑی دولت سے محروم کر لیا ہے۔ صدیوں سعدی کی گلستان و بوستاں ہندوستان میں دانشمندی کے نصاب کا جزو خاص رہی ہیں جسے ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی، خاص طور پر شمالی ہندوستان میں، بھی پڑھتے تھے اور رائج اسکولوں میں اخلاقی تعلیم دینے کا جو مطالبہ ہے اور جس کی کمی ہمارے ماہرین تعلیم بہت زیادہ محسوس کر رہے ہیں، وہ کمی ان کتابوں (یعنی فارسی) کے مذکورہ نصاب سے صدیوں پوری ہوتی رہی، اب اس سلسلے میں ہمارے یہاں ہر طرف محرومی ہے، خلا ہے، اور راستہ صاف دکھائی نہیں دیتا، سعدی کی گلستاں و بوستاں آج بھی اس راہ میں ہماری مدد کر سکتی ہیں، بشرطیکہ ہم تنگ نظری اور تعصب سے کام نہ لیں اور جہاں سے جو اچھی چیز ملے اسے لینے کے لیے آمادہ ہوں۔"

فارسی شعر و ادب نے عام طور پر اور سعدی کی گلستاں اور بوستاں نے خاص طور پر ہندوستان کی مقامی زبانوں کو زبان و ذہنی دونوں لحاظ سے متاثر کیا ہے، ہندی زبان و ادب پر تو ہمیں اس کے اثر کا بہت کچھ علم ہے، سعدی کے کتنے ہی اقوال و امثال ابھی کچھ دنوں قبل عام طور پر ہماری زبانوں پر ہوتے تھے اور آج بھی بعض حلقوں میں ان کا چلن ہے، اکثر بغیر یہ جانے ہوئے کہ یہ فقرے اور یہ امثال کس کی جودت طبع کا نتیجہ ہیں۔ چند فقرے ملاحظہ ہوں: اندک اندک بہم شود بسیار، قطرہ قطرہ سیلے گردد (تھوڑا تھوڑا بہت ہو جاتا ہے اور قطرہ قطرہ دریا بن جاتا ہے۔)، ہر جا کہ گلست، خار است (جہاں پھول ہے وہاں کانٹے بھی ہیں)، نہ ہر چہ بقامت کہتر، بقیمت بہتر (نہ ہر چیز جو قامت میں بڑی ہو ضروری نہیں کہ قیمت میں بھی بہتر ہو)، دروغ مصلحت آمیز بہ کہ راستی فتنہ انگیز (مصلحت آمیز جھوٹ بہتر ہے یا ایسا سچ جس سے فتنے پیدا ہوں)، خفتہ را خفتہ کے کند بیدار

(سوئے ہوئے کو سویا ہوا کیسے بیدار کرسکتا ہے) بے عمل درخت بے بر، زاہد بے علم خانہ بے در (بے عمل شخص ایسا درخت ہے جس پر پھل نہیں آتا اور بے علم زاہد ایسے مکان کی مانند ہے جس میں دروازہ نہیں ہوتا)، جور استاد بہ زمہر پدر (استاد کی سختی باپ کی محبت سے بہتر ہے)۔

مولانا محمد عمران خاں کی وفات

۸ ارا کتوبر ۱۹۸۶ء کو ایک طویل علالت کے بعد بھوپال میں مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب کی وفات ہوگئی، اور علم و تدبر اور تبلیغ و ارشاد کے حلقے میں ایک جگہ اور خالی ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کے مراتب بلند سے بلند تر فرمائے، آمین۔

مولانا محمد عمران خاں مرحوم ندوی تھے، ازہری تھے لیکن ان باتوں سے بڑھ کر بات تھی کہ مولانا میں بعض اوصاف ایسے تھے جو کم لوگوں میں ہوتے ہیں، مثلاً ان کے دل میں بڑا سوز و گداز اور بڑی خستگی اور بنستگی تھی، یہ دولت بیدار اللہ کی خاص نعمت ہے جو کبھی فقط ایک ہی "نگرش" سے مل جاتی ہے اور کبھی اس کے لیے سخت اور ایک عمر کی ریاضت کی جگہ سوزیوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ اسی کا اثر تھا کہ ان کی تقریر میں بڑا اثر ان کے اہتمام و انتظام میں بڑی جاذبیت اور ان کے تبلیغی کام میں بڑی برکت تھی۔

بھوپال میں انھوں نے اس شہر اور ریاست میں انقلاب کے بعد، کتنے ہی افسردہ اور شکستہ دلوں میں امید کا نور پیدا کیا، بڑے بڑے اجتماعات کر کے وسطی ہندوستان کی فضاؤں، اس کے پہاڑوں اور جنگلوں کو توحید کی تکبیروں سے معمور کر دیا، اور ایک کام تو ایسا اللہ تعالیٰ نے ان سے لیا جو شاہانِ وقت سے لیا جاتا ہے، وہ کام تھا تاج المساجد کی تعمیر و تکمیل۔ اس کام میں جیسا خلوص، جیسی لگن، جیسا عمل پیہم اور استقلال مستحکم ان کی طرف سے دیکھنے میں آیا اس کی مثالیں شاذ ہیں تاج المساجد کو نواب شاہجہاں بیگم نامکمل چھوڑ گئی تھیں اور یہ جگہ ویران سی ہو چلی تھی۔ مولانا محمد عمران خاں مرحوم نے اس عظیم الشان مسجد کو تعمیر کرایا، یہ مسجد واقعی مسجدوں کا تاج ہے۔ مولانا زندہ رہتے اور صحت ٹھیک رہتی تو اپنے عزم اور مستعدی کی صلاحیتوں سے نہ معلوم ابھی کتنے کام کرتے، لیکن اللہ کو کچھ اور منظور تھا اور ہمیں بھی وہی منظور رہے جو اسے منظور ہو، رہے نام اللہ کا۔

مختار الدین احمد

مولانا اکبرآبادی کی ڈائری کے آخری اوراق

مولانا سعید احمد اکبرآبادی جن کا گزشتہ سال کراچی میں انتقال ہوا ہندوستان کے مشہور عالموں اور ممتاز مصنفین میں تھے۔ عرصہ تک مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل رہنے کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شعبہ دینیات کے صدر اور پھر فیکلٹی کے ڈین مقرر ہوئے ــــ وہ ندوۃ المصنفین کے بانیوں میں تھے اور مفتی عتیق الرحمن صاحب کے خاص دوستوں میں۔ رسالہ برہان کی انھوں نے چالیس سال تک ادارت کی۔ صحت ان کی بہت اچھی تھی، لیکن مولانا کے آخری دن علالت کی نذر ہو گئے اور جو تکالیف انہیں آخر زمانے میں ہوئیں ان سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔ خدا ان پر رحمت و مغفرت کے پھول برسائے۔

کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہوگی کہ مولانا ڈائری لکھنے کا التزام کرتے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد سے لکھنا شروع کر دیا ہو تو عجب

پروفیسر مختار الدین احمد، شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ ۲۰۲۰۰۱

[redacted]

نہیں لیکن جب سفر یورپ سے ۱۹۵۶ء میں واپس آیا تو یہ جان کر خوشی ہوئی کہ مولانا ڈائری اہتمام سے لکھ رہے ہیں۔ ایسا بھی نہیں کہ وہ التزاماً روزانہ ہی لکھتے ہوں یا بہت تفصیل سے حوادث و واقعات سپردِ قلم کرتے ہوں۔ کبھی کبھی صرف اشاروں پر اکتفا کرتے ہیں کبھی سفر کی کچھ تفصیلات درج کرتے ہیں جس پر بعد کو ان کے سفرنامے کی بنیاد ہوا کرتی تھی۔

محبی ڈاکٹر محمد اسلم نے مجھے اطلاع دی کہ حسن اتفاق سے مولانا کی لکھی ہوئی بیشتر ڈائریاں محفوظ ہیں اور یہ کہ وہ انہیں مرتب کرنا چاہتے ہیں۔ میں ان کے عزم سے بہت خوش ہوا اور میں نے تعاون کا پورا وعدہ کیا ہے۔ ۱۹۸۵ء مولانا کی پریشانیوں کا زمانہ تھا لیکن اس زمانے میں بھی وہ کچھ نہ کچھ اپنے تاثرات ڈائری پر ثبت کرتے رہتے۔ حسن اتفاق سے یہ ڈائری عزیزہ مسعودہ بی کی عنایت سے کچھ دنوں تک میرے پاس رہی اور ان کی اجازت سے میں نے اس کی نقل لے لی جو آج ناظرین جامعہ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

ضروری حواشی لکھ دیئے گئے ہیں، کراچی کے بعض اعزہ واصحاب کی تعیین میں ڈاکٹر محمد اسلم سے مدد ملی ہے جن کا میں شکر گزار ہوں۔

جس دن حکیم محمد سعید نے ان کا آخری معائنہ کیا اور انہیں فیصلہ سنا دیا کہ کینسر کے مرض میں مبتلا ہیں اور مرض بہت آگے بڑھ چکا ہے اسی دن مولانا کی ہمت نے جواب دے دیا اور اس دن کے اندراج میں وہ صرف حکیم صاحب کا نام لکھ رہ گئے ہیں۔ دل چاہتا ہے کہ اس دن کے ان کے تاثرات معلوم ہو سکتے۔

۳؍جنوری ۱۹۸۵ء آج سے میں حکیم عبدالحمید دہلوی[1] کے زیر علاج
۹ ربیع الثانی ۱۴۰۴ھ ہوں۔ وہ خود مجھے میڈیکل کالج میں دیکھنے تشریف لائے
اور اچھی طرح معائنے کے بعد ان کی رائے ہوئی کہ وہ ان
کا تجویز کیا ہوا نسخہ استعمال کریں۔

۸؍جنوری آج شام کو مسعودہ[2] بی سلمہا کا ٹیلی گرام ملا ہے کہ وہ
کل شام PIA سے دہلی پہنچ رہی ہیں۔

۹؍جنوری آج صبح کی ٹرین سے خورشید اور نشاط[3] مسعودہ بی
کے استقبال کے لیے دہلی روانہ ہوگئے۔ اور یہ تینوں ایرانڈیا
سے شب کو ۱۱½ بجے علی گڑھ پہنچ گئے۔ عزیزہ مسعودہ کے
آجانے سے مجھ کو بڑی تقویت ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ وہ
مجھ کو کراچی اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آئی ہیں۔ علاوہ
ازیں میری دوا دارو اور کھانے پینے کے سب انتظامات
انھوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیے۔

۱۰؍جنوری آج میرے دوست احباب حسب معمول مزاج پرسی

---

[1] طبی دنیا کی مشہور شخصیت اور ہندوستان کے مشہور ادارے ہمدرد کے
مؤسس جو مولانا اکبرآبادی پر بہت مہربان تھے۔

[2] مولانا کی بڑی صاحبزادی جو کراچی میں مقیم ہیں۔ ان کی تعلیم علی گڑھ میں
ہوئی کراچی کے ایک ادارے میں معلم ہیں۔

[3] خورشید احمد اسسٹنٹ انجینئر مولانا کے منجھلے صاحبزادے،
نشاط مولانا کے بھانجے پروفیسر مجتبیٰ احمد (مظہر علوی) (شعبۂ تاریخ
مسلم یونیورسٹی) کے بھتیجے جنھوں نے علی گڑھ سے ایل ایل بی
کیا ہے۔

کے لیے آتے رہے اور مسعودہ بی بھی ملنے ملانے میں
مصروف رہیں۔

۱۴ جنوری آج مسعودہ بی میاں محمود کو ساتھ لے کر دہلی گئیں
اور وہاں میرے لیے VISA اور ۱۸ جنوری کے لیے
PIA میں اپنے اور میرے لیے ریزرویشن کا انتظام کر
شام کی ٹرین سے واپس آگئیں۔

۱۵ جنوری آج بھی احباب پرسش حال کے لیے صبح سے شا
تک آتے رہے۔

۱۸ جنوری آج پاکستان کے لیے روانگی ہے اس لیے صبح سے
ہی گھر عورتوں اور مردوں سے بھرا ہوا ہے۔ شاہ آباد سے
عزیزم مصطفیٰ احمد[4] ایک دن پہلے اور قاضی زین العابدین[5]
شاہدہ اور نسیمہ کے ساتھ دو دن پہلے ہی آگئے تھے۔
ایک بجے کے بعد ونود کمار[6] صاحب کی کار میں پالم کے
روانہ ہوا۔ دولہن، خورشید اور محمود میاں ہمراہ گئے۔ گھر سے
عورتوں اور مردوں کے ایک جم غفیر نے بچشم گریاں اور دعاؤں کے

---

۴ مولانا کے دیرینہ خادم، شعبہ دینیات میں ملازم ہیں۔
۵ مولانا سجاد میرٹھی ہندوستان کے مشہور عالم اور مصنف، شعبہ دینیات علی گڑھ کی مختلف
مجالس کے رکن اور مولانا کے پرانے دوست جو بعد کو ان کے سمدھی بھی۔ یعنی خورشید
میاں کے خسر ہوئے، شاہدہ اور نسیم قاضی صاحب کی صاحبزادیاں ہیں۔
۶ مولانا کے ایک مہربان پڑوسی۔
۷ قاضی صاحب کی صاحبزادی، عزیزی خورشید احمد کی دولہن جو علی گڑھ میں
مولانا کی خدمت کرتی رہیں۔

ساتھ رخصت کیا۔

ہوائی جہاز ٹھیک شام ۳۰-۷ پر اڑا اور ۴۵-۹ پر کراچی پہنچ گیا۔

اگرچہ کراچی تار نہیں پہنچا تھا پھر بھی ہوشؔ[8]، جناب میاں مظفر، فوزیہ، شاہین[9]، ایرپورٹ پہنچ گئے تھے۔ اللہ کا شکر ہے یوں پورا سفر خیریت تمام پورا ہوا۔

۱۹ جنوری — فون پر احباب کو اطلاع کر دی گئی تھی، اس لیے صبح سے ہی احباب آنے لگے۔ نام یہ ہیں۔ سید محمد قاسم[10] اور ان کی بیگم جو چھوٹی آپا کہلاتی اور مولانا کی بہن ہیں، شیخ فرید الحق[11]،

۸؎ ابو المحمود سعید، ہوشؔ گھر کا نام ہے۔ مولانا کے منجھلے داماد، خان بہادر ابو سعید عبداللہ پرنسپل گوہاٹی کالج کے صاحبزادے، کھلنا (مشرقی پاکستان) میں ان کا بہت بڑا کاروبار تھا۔ انتقال کے بعد یہ کراچی گئے اور انھوں نے وہاں اپنا نیا کاروبار پھیلایا۔ عزیزی جنید احمد، مولانا کے منجھلے صاحبزادے جو کراچی میں ایک سرکاری ادارے میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔ مظفر صاحب مسعودہ بی کے داماد، فوزیہ کے شوہر ہیں۔ فوزیہ جیسا کہ ذکر ہوا مولانا کی نواسی ہیں۔

۹؎ مولانا کی بڑی صاحبزادی محمودہ بی کی بڑی بیٹی، کراچی یونیورسٹی سے بی۔اے کر کے کسی اسکول میں ملازم ہیں۔

۱۰؎ مولانا کے برادر نسبتی حکومت پاکستان کے سیکورٹی پریس کے سربراہ تھے اب اپنی بیگم کی وفات کے بعد اسلام آباد میں مقیم ہیں۔

۱۱؎ شیخ فرید الحق کراچی کے مشہور ریٹائرڈ وکیل، جو مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے احفاد میں ہیں، ادب کا بہت ستھرا ذوق رکھتے ہیں، متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ اقبال کے خطوط بنام مولانا راغب حسن (کلکتہ) انھی کے پاس محفوظ تھے۔ اب اپنے مقدمے کے ساتھ انھوں نے کراچی سے شائع کر دیے ہیں۔ ان کی بی بی زبیدہ مرحومہ، مولانا انور شاہ کی رشتے میں بھتیجی تھیں دس بارہ کتابیں انکی تصنیف ہیں۔

ادریس مینائی صاحب[12] ان کی بیگم ریاض آپا[13]۔ ایس ام محمود،[14] اقبال حسن، مرزا ارقام چغتائی[15] اور چھوٹے میاں[16] آئے۔

۲۰ جنوری — RM ۲۰۔۱ میاں مونا کے بلانے پر ڈاکٹر ایس ایم رب[17] جو کراچی کے نامور ڈاکٹر ہیں، انھوں نے خوب غور اور توجہ سے معائنہ کیا اور خون پیشاب کے علاوہ ULTRA SOUND TEST ٹسٹ بھی تجویز کیا اور استعمال کے لیے چند دوائیں تجویز کیں۔

۲۱ جنوری — آج جو احباب آئے:

ادریس مینائی، ان کی بیگم ریاض آپا، سید محمد قاسم

---

[12] امیر مینائی کے پوتے، مولانا کے علی گڑھ کے رفیق پروفیسر قاضی مظہر الدین احمد بلگرامی کے برادر نسبتی نیشنل بنک آف پاکستان کے مینجنگ ڈائرکٹر تھے، اب کراچی میں مقیم ہیں۔

[13] قاضی مظہر الدین احمد صاحب کی بہن نے علی گڑھ سے انگریزی میں ایم اے کیا، وہ ایک زمانے تک ویمنس کالج، مسلم یونیورسٹی میں استاد رہیں۔ اب عرصے سے کراچی میں مقیم ہیں۔

[14] مولانا کے ایک عزیز مقیم ناظم آباد کراچی

[15] چغتائی صاحب ماہنامہ وجدان کراچی کے ایڈیٹر ہیں اور مولانا سے بہت محبت کرتے ہیں۔

[16] چھوٹے میاں کا نام مظفر جاوید، مسعودہ بی کے ماموں زاد بھائی PIA سے منسلک ہیں۔

[17] ڈاکٹر عبد الرب جناح ہسپتال سے منسلک، جنھوں نے مولانا کا علاج بہت توجہ سے کیا۔

میاں پرویز[18]، مولانا محمد طاسین[19]۔ ڈاکٹر اسرار احمد لاہور[20]، رانی (شیخ عبدالرشید کی صاحبزادی[21]) اور ان کے شوہر چشتی صاحب، زینت[22] (حسین بخاری کی اہلیہ)

۲۲ جنوری آج تین بجے CALIPTON LABORATORIES میں ULTRA SOUND TEST ڈاکٹر میسرت نے دیا۔ اس ٹسٹ کی رپورٹ سے معلوم ہوا کہ جگر بڑھا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں کوئی خرابی نہیں ہے البتہ GALL BLADDER میں ریت کے ذروں کی طرح بے شمار چھوٹے چھوٹے پتھر جمع ہیں۔

۲۳ جنوری آج کے آنے والے:
افضل مبین صاحب، ڈاکٹر طاہرہ[23]، میاں محمد امین، میمن ایم

---

[18] مولانا کے چھوٹے بھائی مقیم کراچی۔

[19] کراچی کے نامور عالم مجلس علمی کراچی کے سربراہ اور مشہور عالم مولانا یوسف بنوری کے داماد۔ یہ بہت ستھرے ذوق اور سلجھے ہوئے دماغ کے علماء میں شمار ہوتے ہیں۔ مولانا کے مسلک صلح کل سے بہت قریب۔

[20] پاکستان کے مشہور عالم، مقرر، مفسر، انجمن خدام القرآن کے سربراہ اور متعدد کتابوں کے مصنف۔

[21] پروفیسر شیخ عبدالرشید، سابق صدر شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی محقق، بہت کامیاب استاد اور متعدد کتابوں کے مصنف۔ مثنات ماہر جو پہلی مرتبہ شیخ صاحب نے مرتب کر کے علی گڑھ سے شائع کی، متقاعد ہونے کے بعد۔ رانی شیخ صاحب کی منجھلی صاحبزادی جنکی شادی شکور چشتی (انشورنس کمپنی کے مینجنگ ڈائرکٹر) سے ہوئی۔

[22] زینت کراچی میں مولانا کی منھ بولی بیٹی۔

[23] طاہرہ کراچی یونیورسٹی میں شعبۂ فارسی کی صدر ہیں۔

(کریم صاحب مرحوم[۲۴] کے داماد) میاں مظفر سلمہ، ان کے
بہنوئی[۲۵]، بہن، والدہ صاحبہ وغیرہم۔
میاں صادق[۲۶]، بھابی، (چھوٹے میاں کی والدہ) شیخ
فریدالحق

۲۶ جنوری

RAIHANA BI ARRIVES FROM
LAHORE BY TAIZ GAM
WHICH WAS LATE BY 3 HOURS

آج کے آنے والے:
میاں پرویز بیوی بچوں کے ساتھ، میاں اطہر[۲۸] بیوی

۲۴۔ کریم صاحب تو [illegible] کے منجھلے صاحبزادے جنید احمد کے خسر۔
۲۵۔ نام حسام الدین بہت سلجھی ہوئی طبیعت کے نوجوان۔ کراچی کی کسی فرم میں ملازم ہیں۔ بی بی کا نام تہمینہ ہے۔
۲۶۔ صادق صاحب، مولانا کے برادر نسبتی عاشق علی مرحوم کے متبنی۔ بیگم مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے ایک ہی بھائی تھے اور وہ عاشق علی۔
۲۷۔ ریحانہ بی مولانا کی منجھلی صاحبزادی۔ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے (فارسی) ہیں۔ ان کا عقد نکاح تاریخ ۱۱ مارچ ۱۹۶۷ء کو علی منزل، ڈگی روڈ علی گڑھ میں ہوا۔ ڈاکٹر محمد اسلم کیمبرج کے تعلیم یافتہ ہیں جہاں سے انھیں ۱۹۶۷ء میں تاریخ میں ڈاکٹریٹ تفویض ہوئی۔ اب وہ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ میں استاد ہیں۔ یہ پنجاب کے نامور محقق ہیں اور مشہور مصنف۔ مولانا ان کی سعادت مندی اور ان کے ذوق علمی کی بنا پر ان سے بیحد محبت کرتے تھے۔ ان کے نام مولانا کے خطوط قابل مطالعہ ہیں جو جلد ہی شائع ہونے والے ہیں۔
۲۸۔ اطہر، فریدہ، اقبال یہ سب مولانا کے اعزہ ہیں جو ان کی عیادت کیلئے برابر آتے رہتے تھے۔

کے ساتھ فریدہ بیگم، میاں اقبال، ان کی بیوی اور بچے

۲۰ جنوری — آج آنے والے:

مشفق خواجہ[۲۹]، ان کی بیگم، لطف اللہ خاں صاحب[۳۰]،

---

۲۹ - مشفق خواجہ صاحب، اردو زبان کے مشہور محقق، نغز گو شاعر، صاحب طرز انشا پرداز اور شاید ممتاز کالم نویس بھی۔ شاید اس لیے کہ کالم اپنے نام سے نہیں بلکہ فرضی ناموں سے لکھتے ہیں۔ مولانا سے تعلق خاطر رکھتے تھے۔ ان کی بیگم آمنہ صاحبہ بھی ایم اے ایک مقامی کالج میں لکچرر ہیں اور متعدد کتابوں کی مصنفہ۔ کراچی میں اپنی مہمان نوازی اور ضیافتوں کے لیے مشہور رہیں۔

۳۰ - اگر کوئی پڑھا لکھا آدمی کراچی گیا اور وہ لطف اللہ خاں صاحب سے نہ ملا تو اس نے کچھ نہ کیا اور اپنا پیسہ اور وقت ضائع کیا۔ جنوبی ہند کے رہنے والے ہیں اب عرصے سے کراچی میں سکونت پذیر ہیں۔ ایک مشہور اشتہار کی کمپنی کے ڈائرکٹر یا مالک ہیں لیکن ایسے لوگ تو آپ کو کراچی میں اور بھی مل جائیں گے۔ وہ بہت اچھے مصور ہیں اور ہندوستان اور پاکستان کی بیشتر اہم شخصیات کی تصاویر انھوں نے لی ہیں۔ اور ان کے ذخیرے میں ایسے سلیقے سے رکھی ہوئی ہیں کہ جس کی تصویر آپ چاہیں وہ ایک منٹ میں نکال کر پردہ تصویر پر آپ کو دکھا دیں گے۔ اس سے اہم اور دلچسپ مجموعہ ان کے پاس مشاہیر کی آواز کا ہے۔ مقرروں، مغنیوں اور شاعروں ہی کے نہیں تقریباً سارے نامور ادیبوں کی آواز ان کے یہاں کیسٹ میں محفوظ ہیں۔ مولانا کی ایک اہم تقریر بھی جو انھوں نے خاص لطف اللہ کے لیے کی تھی ان کے کیسٹ میں بند ہے۔ لطف اللہ صاحب کا غائبانہ تعارف مولانا ہی نے مجھ سے کرایا اور ان ہی کے اصرار پر ۱۹۸۲ء میں شرق اوسط کے سفر سے واپسی پر ڈاکٹر جمیل جالبی کی معیت میں ان سے ملا جس قدر میں نے سنا تھا انہیں اس سے بڑھ کر پایا۔ بڑے وضعدار، خلیق و متواضع اور نہایت خوبیوں کے انسان ہیں۔ ان کے چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ دیکھی۔ کراچی جیسے غدار شہر میں ان کو کبھی کسی کا شاکی نہیں پایا۔ گفتگو کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے پھول جھڑتے ہیں۔ خدا انہیں خوش و خرم رکھے۔ ان کی بیگم، ان سب صفات میں جن کا اوپر ذکر ہوا ان کی شریک ہیں ورنہ ان کی سچی رفاقت اور مضبوط تعاون کے بغیر لطف اللہ خاں صاحب کے ذوق کی تکمیل ممکن نہ تھی۔

ان کی بیگم، سید قاسم علی صاحب، مرزا ارقام اور ان کی دونوں بیٹیاں۔

۲۸ جنوری آج کے آنے والے:

ڈاکٹر غلام محمد حیدرآبادی[۳۱]، مولانا محمد طٰسن، مولانا بنوری کے صاحبزادے[۳۲]، افضل مبین۔

۳۱ جنوری آج عزیزہ فریحہ سلمہا[۳۳] کی سالگرہ میاں مظفر کے مکان پر تھی، میں بھی شریک ہوا تھا۔ سب سے ملاقات کر کے طبیعت بڑی خوش ہوئی۔

آج ارقام چٹنائی آئے۔

یکم فروری ۷ PM، میں کریم صاحب مرحوم کے گھر گیا اور سب سے مل کر تعزیت کی۔

آج کے آنے والے:

میاں صادق، بھابھی صاحبہ (بیوہ سید عاشق علی مرحوم) ایک آگرہ آبادی صاحب جو اس علاقے کی طرف سے الکشن میں امیدوار ہیں۔

۲ فروری آج کے آنے والے:

اقبال حسن، ان کی بیوی، لڑکیاں اور بہو، چھوٹے میاں، اس کی بیوی اور بچے۔

---

۳۱ علامہ سید سلیمان ندوی کے مشہور شاگرد، مرید، خلیفہ اور پاکستان میں "سلیمانیات" کے ماہر اور متعدد کتابوں کے مصنف۔ کراچی میں قیام ہے۔

۳۲ مولوی محمد بنوری، مولانا محمد یوسف بنوری کے صاحبزادے۔

۳۳ خدیجہ، مسعودہ بی کی نواسی، یعنی فوزیہ کی بیٹی، مظفر صاحب مسعودہ کے داماد فوزیہ کے شوہر ہیں۔

شیخ زاہد الحق، ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری۔[34]

۴۔ فروری آج کے آنے والے :

شاہدہ[35] (اپنے بھائی کی بیٹی) اس کی بہن شمیم جو برسوں سے لندن میں مقیم ہے اور آج یہاں آئی ہوئی ہے، اور ان دونوں بہنوں کے بچے۔

۵۔ فروری آج ریحانہ بی بی کام سے لاہور واپس آگئیں۔ 5 PM

6 PM بجے احباب ذیل تشریف لائے۔

مشفق خواجہ، ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری، سید یوسف بخاری[36]، عقیل صاحب، مسعود احمد برکاتی[37]… ٹریننگ کالج کے انگریزی کے ایک استاد۔

---

[34] مشہور مصنف اور اردو کے لائق استاد۔ پاکستان میں غلام رسول مہر مرحوم کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی و تصانیف کے شاید سب سے بڑے ماہر۔ مولانا آزاد پر متعدد کتابیں انھوں نے شائع کی ہیں۔ برابر علمی کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ مولانا سے بہت عقیدت رکھتے ہیں۔

[35] شاہدہ اور شمیم اقبال حسن کی بہنیں ہیں۔

[36] بخاری صاحب مشہور انشا پرداز ہیں اور دہلی کے روڑے، دہلی کی زبان لکھنے پر جو قدرت انھیں حاصل ہے وہ کم لوگوں کو ہوگی۔ اب معلوم ہوا کہ شعر بھی کہتے ہیں۔ ان کا مجموعۂ کلام کچھ دن ہوئے کراچی سے شائع ہوا ہے۔

[37] صاحب ذوق اور بڑے شستہ آدمی، قدیم تہذیب کے حامل، بڑے علمی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور خود بھی لکھنے پڑھنے کا بہت اچھا ذوق رکھتے ہیں، حکیم محمد سعید کے مؤسسہ ہمدرد سے منسلک ہیں اور مصروفیات کے باوجود کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں۔ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔

۷ PM اعزہ و رشتہ داروں میں یہ لوگ آئے:

میاں محمد سلطان[۳۸]، ان کی بیوی اور بچے، میاں خالد (چندا بی کی لڑکی غزالہ کے شوہر)، اور عزیزہ میمونہ خاتون[۳۹]۔ ۸ PM ڈاکٹر حسین ناصر، جن کے میں زیر علاج ہوں تشریف لائے اور میرا معائنہ کرنے کے بعد اطمینان اور خوشی کا اظہار کیا۔ ساتھ ہی چند ٹسٹ بتا گئے ہیں، وہ ہو جائیں گے تو ڈاکٹر صاحب آگے بڑھیں گے۔

میاں جنید سلمہ حسب معمول شام کو دفتر سے آنے کے بعد سے ۸½ بجے تک موجود رہے۔

۶ / فروری آج شام کو ۵½ بجے کلفٹن ساحل سمندر پر بیس، مونا، شاہین اور رمہ جبیں[۴۰] کے ساتھ گیا۔ وہاں پیدل بھی چلا اور الحمد للہ طبیعت ہشاش بشاش رہی

آج آنے والے:

مسٹر افضل مبین، سید جمال حسن شیرازی، میاں فیروز اقبال[۴۱]۔

---

[۳۸] محمد سلطان، اقبال حسن کے چھوٹے بھائی۔

[۳۹] میمونہ خاتون، بیگم پروفیسر مجتبیٰ احمد علوی کی بڑی بہن جو کراچی میں مقیم ہیں۔

[۴۰] شاہین اور رمہ جبیں مولانا کی نواسیاں جو محمودہ بی کی بیٹیاں ہیں۔ اب وہ اپنی والدہ محمو صاحبہ کے ساتھ کراچی میں مقیم ہیں۔ تعلیم یافتہ اور برسر روزگار۔ ان کی تیسری بہ ناہید میری شاگرد ہیں، انھوں نے علی گڑھ سے عربی میں ایم اے کیا ہے اور ا کراچی میں ملازم ہیں۔

[۴۱] اقبال حسن صاحب کے صاحبزادے، حکومت کے ایک ادارے میں کراچی میں ملازم ہ

۷ر فروری آج کے آنے والے:
ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری، غازی عبدالرحمٰن پشاوری شہید پر اپنی کتاب دے گئے۔
۶ P.M بجے قریب مونا اور مسعودہ کے ساتھ HAIR CUTTING SHOP گیا۔

۸ر فروری آج شام کو ہم سب لے۔ کریم صاحب مرحوم کے چہلم میں شریک ہوئے، عورتوں اور مردوں کا بڑا مجمع تھا، مغرب کے بعد سب نے مکلف کھانا کھایا۔
۱۰ P.M۔ میاں مظفر، فوزیہ اور فریحہ آئے۔

۹ر فروری آج کے آنے والے:
چھوٹے میاں[۴۲]۔

۱۰ر فروری CENTRE OF KARACHI DIGNOSIS
میں میرا سب سے بڑا ٹسٹ ہوا جس کا نام CAT SCANNING ہے ڈاکٹر (کا) نام مقبول عباس ہے۔ اس کو ULTRA SOUND ٹسٹ کی اعلیٰ اور ترقی یافتہ شکل کہنا چاہیے۔ وہ نصف گھنٹہ میں ہوگیا تھا، اس نے دو گھنٹے چالیس منٹ لے لیے۔

آج شام کو مولانا محمد طٰسن اور ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری تشریف لائے۔

۱۱ر فروری آج کے آنے والے:

---

[۴۲] منظر جاوید کاظمی کے بیٹے اور عاشق علی مرحوم کے پوتے۔

مولانا محمد احمد تھانوی[۴۳] اور ان کے ساتھی، وہ اپنی تازہ تالیف فقہ القرآن کی ج ۴ دے گئے ہیں بڑی معرکۃ الآراء اور فکر انگیز کتاب ہے۔ فجزاہ اللہ

۱۲ فروری — آج CAT SCANNING کی رپورٹ آگئی اور میاں مونا اس پر ڈاکٹر حسین عامر سے گفتگو کر آئے۔ اللہ کے فضل و کرم سے رپورٹ بہت اچھی اور حوصلہ افزا ہے۔ یعنی جگر کو صاف بتایا ہے، البتہ GALL BLADDER میں چھوٹے چھوٹے پتھریلے ذرات کا اجتماع بتایا ہے۔ بہرحال اب علاج اسی کا کرنا ہے۔

۱۳ فروری — آج ملاقات کے لیے آنے والے مولانا محمد طسن، ڈاکٹر رشید احمد جالندھری[۴۴]؛ موصوف چار

۴۳ھ مولانا ظفر احمد تھانوی کے لائق صاحبزادے اور مشہور مصنف، ان کی کتاب فقہ القرآن جو چھ جلدوں میں ہے میری نظر سے گزری اور بہت پسند آئی۔ مصنف نے اس کتاب پر بہت محنت کی ہے اور اس میں موضوع کے سارے پہلوؤں پر انھوں نے روشنی ڈالی ہے۔

۴۴ھ علوم متداولہ کی تحصیل کے بعد کیمبرج گئے جہاں انھوں نے پروفیسر آربری کی نگرانی میں القشیری پر کام کیا اور جس پر انھیں وہاں سے ڈاکٹریٹ ملی۔ واپسی پر علما اکیڈمی لاہور کے ڈائرکٹر ہوئے۔ پھر حکومت کے ادارۂ تحقیقات اسلامی کراچی کے سربراہ مقرر ہوئے۔ اب یہ ادارہ اسلام آباد منتقل ہوگیا ہے اور پروفیسر شیر محمد زماں کی نگرانی میں کام کر رہا ہے۔ ڈاکٹر رشید احمد متعدد قابل قدر کتابوں کے مصنف ہیں۔ افسوس ہے حالات کی وجہ سے انھیں کسی ایک جگہ جم کر علمی کام کرنے کا موقع نہ ملا۔

پانچ برس سے امریکہ کی HARWORD UNIVERSITY
میں پروفیسر ہیں۔ آج کل اپنے وطن آئے ہوئے ہیں۔ مجھ سے پہلے
سے خوب واقف اور میرے قدردان ہیں۔ برابر برابر پڑھتے رہے
ہیں۔ کہتے تھے کہ مولانا عبیداللہ سندھی پر میری کتاب کو انھوں نے
کئی بار پڑھا ہے۔

عصر کے بعد شیخ فریدالحق آئے۔ مغرب کے بعد گئے۔

۱۴ فروری
آج کوئی نہیں آیا۔ مغرب کے بعد میں کار میں تفریح کے
لیے گیا۔

۱۵ فروری
آنے والے:
قاری شرف الدین اور ان کے فرزند جن کو پاکستان میں اپنی
کتابوں کی اشاعت کی اجازت دی ہے۔
سید قاسم علی اور ان کی دختر شاہین جنھوں نے CANADA
میں سکونت اختیار کر لی ہے۔ وہ بھی آئیں اور میرے لیے تحفہ
بھی لائیں۔
جناب تابش دہلوی[۴۵] بھی آئے اور اپنا نیا دیوان دے
گئے۔ یہ نظموں کا مجموعہ ہے۔

۱۶ فروری
اس مرحلہ پر جب ڈاکٹروں کے نزدیک آپریشن کے
سوا چارہ نہیں ہے میاں مونا کی رائے ہوئی کہ کسی ہومیوپیتھ ڈاکٹر
کی رائے بھی لے لی جائے۔ چنانچہ آج دو بجے وہ کراچی کے نامور
ڈاکٹر محمد طلحہ صدیقی کو لے آئے۔ ڈاکٹر صاحب نے جدید آلات

---

[۴۵] اردو کے مشہور کہنہ مشق شاعر۔ ترک وطن کر کے کراچی میں مقیم ہوگئے ہیں۔ مولانا
سے دہلی کے قیام کے زمانے سے تعلقات ہیں۔

کے ذریعہ میری آنکھیں، زبان، پیر، جگر اور اس کے حوالی کا بغور معائنہ کیا اور فرمایا کہ کبھی آپ کو ملیریا ہوا تھا اور اس میں کونین کا استعمال زیادہ ہو گیا۔ یرقان اسی کا نتیجہ ہے، مگر اب یرقان برائے نام رہ گیا ہے۔ بہر حال جو کچھ بھی باقی ہے میں اس کے لیے دوا دوں گا۔ اس کے علاوہ پتّے میں جو سنگ ریزے جمع ہیں ان کو بھی گھلانے کی دوا دوں گا۔ چنانچہ دو ہفتے کے لیے انھوں نے دوائیں تجویز کر دیں۔

ڈاکٹر صاحب دراصل غازی پور کے رہنے والے اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے خاندان سے ہیں، تعلیم کلکتہ میں پائی، ۱۹۷۰ء میں پاکستان منتقل ہو گئے۔

۱۷ر فروری آج سے ہومیوپیتھک علاج شروع ہو گیا جو چار روز تک چلے گا۔ مغرب کے بعد ڈاکٹر غلام محمد صاحب حیدرآبادی مع اپنے ایک مرید عبدالرزاق صاحب ٹمبر مرچنٹ کے تشریف لائے۔ وہ خود اعلیٰ درجے کے ہومیوپیتھ ڈاکٹر ہیں، ان کی رائے ہے کہ اس صورت میں آپریشن ناگزیر ہے۔ ہومیوپیتھ علاج سے کچھ نہ ہو گا۔[۴۶]

۱۹ر فروری آج کے آنے والے:

ڈاکٹر اسرار احمد (لاہور) مسٹر نورالدین، میرے کلکتہ کے زمانے میں یہ کلکتہ مدرسہ کے ہائی اسکول میں

---

[۴۶] ان کی رائے صحیح تھی۔ مولانا کا مرض اس قدر بہت آگے بڑھ چکا تھا کہ عمل جراحی کے سوا چارہ نہ تھا لیکن اس عمر میں اور موجودہ صحت میں صحت یابی یقینی امر نہیں تھی اور اس کا بھی امکان تھا کہ عمل جراحی مولانا برداشت نہ کر پاتے۔

طالب علم تھے اور ایسٹ ہوسٹل میں رہتے تھے۔

مسٹر افضل میاں، مسز روزا اقبال، چندہ بیگم اور ان کے فرزند ارجمند محمد اقبال۔

۲۳ر فروری آج شام کو میں مع مونا و مسعودہ بی کے جناب ادریس مینائی کے گھر پہونچے، مغرب کی نماز وہیں ادا کی، پھر دیر تک بڑی اچھی علمی و ادبی گفتگو ہوتی رہی۔

۲۴ر فروری آج مفتی ضیاء الحق دہلوی آئے۔ انھوں نے ترک وطن کر کے پاکستان کی شہریت لے لی ہے اور آج کل عزیز آباد کراچی میں اپنی بڑی بہن کے ساتھ مقیم ہیں۔

آج بارہ بجے سے شام کے پانچ بجے تک پورا وقت مع مسعودہ بی، شاہین و مجیب، جنید میاں، اقبال کے گھر گذارا۔ اچھے بھائی بھی وہیں آ گئے تھے۔ سب عزیزوں سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔

موسٰی پاریکھ[۴۸] کا ٹیلی گرام ملا ہے کہ وہ کل کراچی پہنچ رہے ہیں۔

---

۴۷ مولانا کی ایک رشتے دار، پروفیسر مظہر علوی (علی گڑھ) سے قرابت قریبہ رکھتی ہیں۔

۴۸ موسٰی پاریکھ اور ان کی بیوی زبیدہ مولانا کے بڑے معتقدوں میں ہیں۔ موسٰی صاحب جوہنسبرگ (جنوبی افریقہ) کے کامیاب تاجروں میں ہیں۔ مولانا سے ملنے کئی بار علی گڑھ آئے۔ ان سے پہلی بار ملاقات مولانا کے یہاں کھانے پر ہوئی جس میں انھوں نے پاریکھ سے ملنے کے لیے مجھے خاص طور پر مدعو کیا تھا۔ پھر دوسری بار جب وہ آئے تو مولانا انھیں لے کر میرے گھر ملاقات کے لیے آئے۔ دونوں میاں بیوی بڑے صالح اور دیندار ہیں اور مولانا کے فدائیوں میں ہیں۔

۲۵ فروری آج موسیٰ پارک اور ان کی بیوی زبیدہ کراچی پہنچے۔ کل یہ دونوں مجھ سے ملنے کے لیے بمبئی سے دہلی پہنچے تھے لیکن جب انھیں یہ پتہ چلا کہ میں کراچی (میں) ہوں تو وہ یہاں آ گئے۔

یہاں ایک ہوٹل میں مقیم ہیں۔ بارہ بجے میاں مونا اپنی کار میں ان کو گھر لے آئے اور لنچ انھوں نے یہیں کھایا۔ جس کو مسعودہ بی نے بڑے اہتمام سے تیار کیا تھا۔

شام کو بی (طاہرہ بہن) کے بیٹے لڈن جو کراچی میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولس ہیں مع اپنی بیوی اور دو بچوں کے آئے۔

آج پاکستان کی نیشنل اسمبلی کے انتخابات کا دن ہے۔ شہر میں ہما ہمی ہے، عوام نے اس میں بڑے جوش و خروش کا مظاہرہ کیا ہے، ۴ بجے شام کو میں بھی ایک BOOTH پر گیا تھا، وہاں مسعودہ بی کو ووٹ ڈالنا تھا۔

۲۶ فروری شام کو ڈاکٹر حسین ناصر کے چیمبر میں گیا۔ انھوں نے پھر ٹسٹ کیا۔ ہر چیز کو دیکھا، اس کے بعد خون اور پیشاب کا ٹسٹ ہوا جس کی رپورٹ کل ملے گی۔

آج موسیٰ پارک نہیں آئے، دن بھر مصروف رہے۔

۲۷ فروری آنے والے:

موسیٰ پارک، ان کی بیگم زبیدہ، میاں صادق، ان کی بیوی اور بھابی صاحبہ (اچھی بی)

۲۸ فروری آج موسیٰ پارک اور ان کی اہلیہ ۱۲ بجے گھر آ گئے تھے۔ پانچ بجے تک یہیں رہے۔ لنچ یہیں کھایا۔ یہاں سے رخصت ہو کر وہ ایرپورٹ گئے، وہاں سے ۷-۳۰ پر جدہ کے لیے روانہ ہو گئے۔

یکم مارچ آج جمعہ کی نماز میں نے مسجد میں پڑھی، پھر شام کو شاہین

Friday **22** MAR 1985

Vikrami—9 Chait | Shaka—1 Chait

Samvat—1 Chait Sudi | Hijri—29 Jamadi II

शुक्रवार २२ मार्च चैत्र सुदी १ प्र० १ चैत्र सं० २०४१

5.0 p.m. دو [illegible] کے علما آئے اور بڑے تپاک اور عقیدت سے دیر تک باتیں کرتے رہے

ڈاک میں

(۱) [illegible] محمد حنیف الٰہی صاحب [illegible] جامع مسجد محمدیہ کبیر والا ضلع ملتان پنجاب

(۲) بینات کا [illegible] جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی

7 p.m. جناب مشفق خواجہ اور ڈاکٹر جمیل جالبی دونوں حضرات تشریف لائے دیر تک مزاج پرسی کی اور علمی و ادبی گفتگو کرتے رہے ڈاکٹر صاحب نے دو نمبر قومی زبان کے [illegible] کے چند مقالات بہ اہتمام شائع کیے ہیں ایک کاپی میرے لئے لیتے آئے تھے جو نذر کی

عکسِ تحریر مولانا سعید احمد اکبر آبادی

کے ساتھ جناح پارک گیا جو INTERNATIONAL HOTEL کے پیچھے ہے۔ اس میں خوب چلا پھرا۔ مغرب کی نماز جماعت سے مذکور ہوٹل میں ادا کی۔

۶ رمارچ آج شام کو بتن (میمونہ کی لڑکی)[49] اپنے شوہر کے ساتھ آئیں، بارہ برس کے بعد ملاقات کر کے بڑی خوشی ہوئی۔

۸ رمارچ آج میاں جنید اپنے گھر لے گئے تھے، میں دن بھر وہیں رہا۔ شام کو آٹھ بجے میاں مونا، مسعودہ بی بی، شاہین اور مہ جبین سب وہاں پہنچ گئے اور ڈنر جو نہایت پر تکلف تھا اسے کھا کر واپس آ گئے میں بھی ان کے ساتھ واپس آ گیا۔

۹ رمارچ آج مفتی ضیاء الحق اور ان کی بیگم آ گئیں اور لنچ کھا کر واپس ہوئے۔ ۲۔P.M ڈاکٹر محمد طلحہ صدیقی آئے، میرا خوب اچھی طرح معائنہ کیا اور خون اور پیشاب کی رپورٹیں دیکھیں اور اپنے اطمینان کا اظہار کیا۔ انکا علاج جاری ہے۔

۱۰ رمارچ آج شام کو میں شیخ عبدالرشید[50] صاحب کے گھر گیا۔ دیر

---

[49] مظہر علوی کی سالی کی بیٹی۔

[50] شیخ صاحب علی گڑھ کے باقیات الصالحات میں ہیں۔ پروفیسر محمد حبیب کی نگرانی میں تاریخ میں ایم۔ اے کیا۔ یہیں لکچرر، ریڈر اور پھر پروفیسر اور صدر شعبہ ہوئے۔ **منشآت ماہرو** پہلی بار مرتب کر کے یہیں علی گڑھ سے شائع کی۔ متقاعد ہونے کے بعد پاکستان تشریف لے گئے اور ریسرچ سوسائٹی پاکستان کے سربراہ مقرر ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ کے صدر بھی رہے پھر قائد اعظم یونیورسٹی اسلام آباد کے شعبہ تاریخ میں ایک سال تک بحیثیت پروفیسر انھوں نے کام کیا۔ اب کراچی میں مقیم ہیں۔ ان کی پیدائش ۱۹۰۸ء کی ہے۔ پیرانہ سالی کے باوجود تاریخ کے جزئیات انھیں اب تک مستحضر ہیں۔ خدا صحت و عافیت کے ساتھ ان کی عمر طویل فرمائے۔ ق۔

تک گفتگو رہی۔ موصوف کی بیگم عرصے سے صاحب فراش ہیں۔ ان کی عیادت بھی کی، رانی اور چشتی صاحب سے بھی گفتگو ہوتی رہی۔ واپسی میں ہم لوگ فوزیہ کے گھر گئے، نو بجے واپس ہوئے۔

۱۱ مارچ — A.M ۱۱ مولانا عمر احمد عثمانی مع اپنے رفیق کے تشریف لائے اور اپنی کتاب فقہ القرآن کی شروع کی تین جلدیں بھی دیے گئے دونوں ماشاء اللہ بڑے وسیع النظر عالم ہیں اور خوب کام کر رہے ہیں۔

۱۲ مارچ — A.M ۱۱ مولانا محمد حسن، لاہور کے ایک عالم کے ساتھ تشریف لائے، پھر قاری محمد شریف بھی آگئے۔ اور لاہور کے خورشید احمد خاں[۱۵] بھی آگئے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ ان حضرات سے خوب گفتگو رہی۔

۱۳ مارچ — آج مغرب کے بعد ہم لوگ جمال شیرازی صاحب کے گھر گئے، دیر تک بڑی اچھی اور معلومات افزا گفتگو رہی، بڑی محبت کے آدمی ہیں اور ساتھ ہی نہایت قابل، تجربہ کار اور شگفتہ طبع۔

۱۴ مارچ — A.M ۹-۴۵ میں، مونامیاں کے ساتھ شام ہمدرد میں شریک ہوا جو تاج محل ہوٹل میں منعقد ہوئی۔ وہاں

۱۵؎ پنجاب یونیورسٹی سے انھوں نے اردو میں ایم۔ اے کیا، ادبی ذوق بہت اچھا رکھتے ہیں اور اچھی اور نادر کتابیں جمع کرنے کا شوق۔ اختر شیرانی کے داماد ہیں۔ انھوں نے دو تین سال ہوئے فقیر محمد جہلمی کی کتاب حدائق الحنفیۃ جو کمیاب ہو گئی تھی، اپنے حواشی کے ساتھ شائع کی ہے۔

حکیم محمد سعید صاحب[۵۲]، سید الطاف علی بریلوی[۵۳] اور بعض اور حضرات سے بھی ملاقات ہوئی۔ مغرب کی نماز کے بعد واپسی ہوئی۔

۱۵ مارچ — آج شام کو چار علماء ملاقات کے لیے آئے، ان کے نام یہ ہیں:

حافظ محمد حنیف صاحب آسی شیخ الہند (ملتان)[۵۴]

۵۲ے پاکستان کی مشہور شخصیت موسسہ ہمدرد کراچی کے سربراہ حکیم عبدالحمید دہلوی کے چھوٹے بھائی، بین الاقوامی شہرت کے مالک۔ طبیب حاذق اور بڑے علم دوست انسان، وہ ہمدرد کی مصروفیات کے باوجود دنیا بھر میں طبی اور علمی کانفرنسوں اور سیمناروں میں شرکت کرتے رہتے ہیں۔ کتاب الصیدلۃ اور کئی دوسری اہم کتابوں کے مرتب و مصنف ہیں۔ اردو میں متعدد سفرنامے انھوں نے لکھے ہیں جو قابل مطالعہ ہیں۔

۵۳ے سید الطاف علی بریلوی، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے سکریٹری ہیں اور حیات حافظ رحمت خاں جیسی فاضلانہ کتاب کے مصنف۔ علی گڑھ کے اولڈ بوائے اور علی گڑھ پر ہمیشہ نثار رہے۔ طلبا کی مدد اور ادیبوں شاعروں کے تعاون پر ہر وقت آمادہ، علی گڑھ میں صدر یار جنگ سے پہلی ملاقات ۱۹۴۲ء میں سید صاحب نے کرائی آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے روح رواں تھے اور رسالہ مصنف کے کامیاب ایڈیٹر تقسیم ہند کے بعد کراچی آگئے۔ اب آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے سکریٹری ہیں مجلہ العلم ان کی ادارت میں نکل رہا ہے۔ پیرانہ سالی کے باوجود اب بھی سید صاحب نوجوانوں جیسی ہمت رکھتے ہیں۔ خدا انہیں صحت مند رکھے۔

۵۴ے حافظ صاحب کبیر والا سے آئے تھے۔ ان دنوں یہ ضلع ملتان کی تحصیل تھی اب خانیوال میں شامل ہے۔

عبدالخالق آزاد، جامعۃ العلوم الاسلامیہ، بنوری ٹاؤن کراچی،
عبدالخالق آزاد[۵۵] مدرسہ عربیہ تعلیم القرآن دبھاو سنگرا محمود الحسن
معلم جمعیۃ تعلیم القرآن کراچی پاکستان۔

۱۶ مارچ — 9.A.M حکیم محمد سعید کو ان کے مطب ہمدرد میں دکھایا۔ بہت غور و توجہ سے دیکھا اور تمام رپورٹیں بھی لے لیں اور کہا کہ معاملہ پیچیدہ ہے ایسی سرجنوں سے مشورہ کرکے آپ کے مکان پر آکر آپ کو بتاؤں گا۔ اور ساتھ ہی ایک نسخہ لکھ کر اس کی دوائیں میرے سپرد کیں۔

۱۷ مارچ — ۳ P.M ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری آئے اور دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔

۱۸ مارچ — A.M. ڈاکٹر اسرار احمد صاحب تشریف لائے اور فرمایا کہ میری تنظیم اسلامی کی نسبت آپ کے جو خیالات ہیں ان کو ٹیپ ریکارڈ کرا دیجئے میں کل اپنے آدمی (کے ساتھ) پہنچوں گا۔ میں نے کہا بہت اچھا!

۱۹ مارچ — ۱۱ A.M آج میں نے ایک مختصر تقریر ریکارڈ کرائی جس میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تنظیم اسلامی کے بارے میں میں نے اپنے تاثرات و خیالات ظاہر کئے تھے۔

۲۰ مارچ — شام کو کلفٹن پارک سیر و تفریح کے لیے گیا۔
۷.۳۰ بجے اتفاق سے ڈاکٹر حسین ناصر خود پرسش حال کے لیے آگئے۔ کراچی میں یہ بہت بڑی بات ہے۔

---

۵۵ غلطی سے نام مکرر ہو گیا ہے یہاں پر کوئی اور نام ہونا چاہیئے۔

۲۱ر مارچ آج کوئی نہیں آیا۔

۲۲ر مارچ ۵ P.M دو علمار آئے اور بڑی محبت اور عقیدت سے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ نام یہ ہیں:

(۱) حافظ محمد حنیف امینی صدر شیخ الہند سوسائٹی محلہ و جامع مسجد محمدی، کبیر والا ضلع ملتان، پنجاب۔

(۲) مولوی عبدالخالق آزاد جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی۔

۷ P.M، جناب مشفق خواجہ اور ڈاکٹر جمیل جالبی[۵۶] دونوں حضرات تشریف لائے۔ دیر تک مزاج پرسی اور علمی و ادبی گفتگو کرتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بزم خوش نفساں کے نام سے شاہد احمد دہلوی کے چند خاکے اپنے تین مقالات کے ساتھ شائع کئے ہیں۔ ایک کاپی میرے لیے لیتے آئے تھے، وہ نذر کی۔

۵۶ے پاکستان کے مشہور ادیب اور نقاد اور ممتاز مصنف۔ تاریخ ادب اردو کے مصنف جس کی دو جلدیں اب تک شائع ہو چکی ہیں اور ہندوستان اور پاکستان کے اہل ذوق سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں۔ مغربی مصنفین اور نقادوں کو اردو دنیا سے روشناس کرانے میں جالبی صاحب کا بڑا حصہ ہے آج کل کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں۔ جلسوں کی صدارت کرتے ہیں اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر تقریریں، کتابوں پر مقالے بھی خوب لکھتے ہیں۔ شاہد احمد خواجہ کی بزم خوش نفساں ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہے۔

۵۷ء یہ ڈائری کا آخری فقرہ ہے جو ان کے قلم سے ۲۳ مارچ کو نکلا۔ جس دن ان کو معلوم ہوا کہ انہیں کینسر ہے اور یہ کہ مرض بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ حکیم صاحب قبلہ ہفتہ عشرہ پہلے عمان (اردن) کی کانفرنس میں مجھے بتا چکے تھے کہ میں نے مولانا کا تفصیلی معائنہ اپنے رفقاء کے ساتھ کیا ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انہیں کینسر ہے اور وہ ایڈوانس اسٹیج میں ہے اس کا علاج آپریشن ہے لیکن آپریشن کے بعد بھی صحت کی ضمانت نہیں، میں اسی وقت مایوس ہو گیا اور عمان سے جب کراچی آیا تو ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دعوت کی بشارت انھوں نے سنائی، میں نے کہا مولانا دعوت تو اس دن ہو گی جب آپ تندرست ہو کر علی گڑھ تشریف لائیں گے۔ مولانا کھل گئے اور خوشی سے ان کا چہرہ دمک اٹھا۔ میری بیگم سے کہنے لگے میں ستمبر میں انشاء اللہ علی گڑھ آ رہا ہوں۔ ۲۰ اپریل ۱۹۸۵ء کی بات ہے۔ اس کا مطلب ہے مولانا بالکل مایوس نہیں ہوئے تھے اور امید کی کرن ان کے دل میں روشن تھی۔

جامعہ ملّیہ پر مضامین

اس شمارے میں جامعہ ملیہ پر جو مضامین ہیں وہ امسال ۲۹ اکتوبر کو یوم تاسیس کے جلسے میں پڑھے گئے تھے۔ اس جلسے کا انتظام شعبہ اسلامک و عرب ایرانین اسٹڈیز کی طرف سے کیا گیا تھا۔

شمس الرحمٰن محسنی

جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ علی گڑھ میں

آج سے تقریباً ستر برس پہلے ہندوستان میں یہ خبر گرم تھی کہ انگریز پہلی جنگ عظیم کے ختم ہوتے ہی انتظام حکومت میں کچھ ایسی اصلاحات لائیں گے جس سے ہندوستانیوں کو اپنے ملکی معاملات میں خود فیصلہ کرنے کا حق مل جائے گا۔ مگر ایسا کچھ نہ ہوا اور ہندوستانیوں میں آزادی کے جذبات بھڑک اٹھے اور جوش و عمل کے بہت سے چشمے پھوٹ نکلے۔ انڈین نیشنل کانگریس پر انتہا پسندوں کا قبضہ ہو گیا۔ اُدھر یورپ کی بعض دوسری طاقتوں کے ساتھ مل کر حکومت برطانیہ نے ترکی سلطنت کا بہت بڑا علاقہ چھین کر آپس میں تقسیم کر لیا تھا۔ ترکی کے حکمران، مسلمانوں کے لیے خلیفہ یا مذہبی پیشوا کی حیثیت رکھتے تھے۔ مسلمانوں میں اس کی وجہ سے برطانوی حکومت کے خلاف غم اور غصّے کی لہر دوڑ گئی۔ ہندوستان میں جا ریار تعلیم یافتہ مسلمانوں اور ان کے مذہبی رہنماؤں نے جو ایک عرصہ سے باہم دست و گریباں تھے، اپنے اختلافات بھلا دیے، خلافت کی حفاظت کے لیے ایک کمیٹی قائم کی اور دونوں اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے۔ خلافت کمیٹی اور انڈین نیشنل

پروفیسر شمس الرحمٰن محسنی، ۱۵۸ ذاکر نگر، جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

کانگریس نے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ترکِ موالات اور عدم تعاون کی تحریک چلائی، جس نے صرف شہروں اور پڑھے لکھے حضرات کو نہیں، دیہاتوں اور ان پڑھ لوگوں کو بھی اپنی طرف کھینچ لیا۔ ہندوستان میں سب ہی چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان، سکھ ہوں یا عیسائی، آزادی کی جنگ میں کود پڑے۔ گنگا جمنی تہذیب کے یہ مختلف دھارے جب قومی تحریک کے سنگم میں ملے تو ایک زبردست طاقت بن گئے۔ بدیسی حکومت نے کیا کچھ دار و گیریں نہ کیں مگر وہ آزادی کے ان بڑھتے ہوئے جذبات کو نہ دبا سکی اور آزادی کی تحریک ملک بھر میں پھیلتی چلی گئی۔ جن لوگوں کے دل وطن کی محبت سے لبریز تھے اور جن میں آزادی حاصل کرنے کا شوق اور ولولہ تھا، انھوں نے سرکاری ملازمتیں چھوڑ دیں اور بدیسی سرکار کی عدالتوں سے اپنا رشتہ توڑ لیا۔ آزادی کے متوالے، استاد اور طالب علم، ایسی یونیورسٹیاں، کالج اور اسکول چھوڑ کر باہر نکل آئے جو انگریزی سرکار کی سرپرستی میں کام کر رہے تھے۔ ملک کے گوشے گوشے میں قومی اسکول اور کالج کھل گئے۔ بنارس ہندو یونیورسٹی کے طالب علم اور استاد اس سے باہر نکل آئے اور انھوں نے کاشی ودیاپیٹھ کی داغ بیل ڈال دی۔ علی گڑھ کالج کو بدیسی سرکار کے زیر سایہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تبدیل کرنے کے منصوبے بن رہے تھے۔ بہت سے طالب علم اسے چھوڑنے کے لیے آمادہ ہو گئے اور اپنے رہنماؤں سے کہا کہ وہ اُن کے لیے ایک آزاد تعلیمی ادارہ قائم کر دیں۔

خواتین و حضرات!

یہ تھے وہ حالات جن میں جامعہ کی بنیاد رکھی گئی۔ جامعہ کے فلسفی اور مفکر ڈاکٹر سید عابد حسین مرحوم فرماتے تھے کہ یہ حالات جن کی گود میں جامعہ ملیہ اسلامیہ نے آنکھیں کھولی تھیں، تین تحریکوں کے سنگم سے پیدا ہوئے تھے۔ ان میں سے علی گڑھ تحریک جدید مغربی تعلیم کی علمبردار تھی۔ دیوبند کی تحریک مذہبی اور اخلاقی زندگی میں نئی جان ڈالنے کے لیے کوشاں تھی۔ تیسری تحریک گاندھی جی نے چلائی تھی اور وہ

ہندوستان میں قومی اتحاد اور قومی خدمت کی روایات مضبوط بنیادوں پر قائم کر رہی تھی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وجود میں یہ تینوں رنگ مل گئے۔ چھیاسٹھ ۶۶ برس پہلے آج ہی کے دن، دیوبند کے سردار شیخ الہند مولانا محمود حسن کے ہاتھوں علی گڈھ کالج کی مسجد میں اس کا افتتاح ہوا۔ شیخ الہند نے اپنے خطبہ صدارت میں کہا کہ ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سستے داموں کے غلام پیدا کرتے رہیں۔ انھوں نے یاد دلایا کہ بغداد میں جب اسلامی حکومت نے مدرسہ سلطانیہ کی بنیاد رکھی تھی، تو علماء نے جمع ہو کر ماتم کیا تھا اور کہا تھا کہ افسوس آج سے علم حکومت کے عہدے اور منصب حاصل کرنے کے لیے پڑھایا جائیگا۔ شیخ الہند نے فرمایا کہ ہندوستان میں جو تعلیمی ادارے بدیسی حکومت کی سرپرستی میں چل رہے ہیں، ان سے بھلا یہ کیسے امید رکھی جا سکتی ہے کہ وہ ملک کے مفاد اور اس کی فلاح و بہبود کا خیال رکھیں گے۔ انھوں نے آگے چل کر اس بات پر بھی زور دیا کہ مسلمانوں کے تعلیمی اداروں میں جدید علوم کے ساتھ مذہبی تعلیم کا بھی انتظام ہونا چاہیئے کہ طالب علم اسلامی روایات سے واقف رہیں اور ان میں برابر اپنی ملت اور اپنے ہم قوموں کی حمایت کا جذبہ پرورش پاتا رہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لیے جو فاؤنڈیشن کمیٹی یا مجلس تاسیسی بنی، اس میں دیوبند اور علی گڈھ دونوں کے نمائندے شامل تھے۔ اور وہ سب گاندھی جی کی قومی اتحاد اور قومی خدمت کی تحریک سے وابستہ تھے۔ ان میں سے مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا حسین احمد مدنی اور دوسرے بہت سے حضرات دیوبند سے تعلق رکھتے تھے۔ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور ان کے ساتھی علی گڈھ کالج کے اولڈ بوائز میں سے تھے۔ اس کمیٹی کے اراکین میں حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی تھے۔ وہ تینوں جدید تعلیم اور مذہبی تعلیم دونوں کو ضروری سمجھتے تھے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ذریعے، یہ سب لوگ ایسی تعلیم کو رواج دینا چاہتے تھے جو مذہب کی روح کو برقرار رکھے مگر اس طرح کہ اس میں مذہبی تعصب اور تنگ نظری نہ پنپنے

پائے، جو سائنس کی روح کو نشو و نما دے مگر بے ادبی اور بے حرمتی کی آمیزش کے بغیر، جو قومیت کے جذبے کو اُبھارے مگر اس طرح کہ قومی تنگ نظری کی بو اور قومی تعصب کی ملاوٹ نہ آنے پائے۔ ایسے ترقی پسند نظام تعلیم کے لیے ضرورت تھی اور آج بھی ہے کہ زندگی کا ایک نقشہ تیار ہو جس میں الگ الگ مذہبی روایات کے ساتھ ہندوستان کی قومی تہذیب کا وہ رنگ بھی اُبھر آئے جو عام انسانی تہذیب میں کھپ سکے۔

صاحبو!

جیسا کہ میں نے پہلے بتایا جامعہ کے قیام کے وقت ہندوستان کے سب فرقوں میں خوشگوار تعلقات تھے اور وہ سب گاندھی جی کی سرکردگی میں ہندوستان کی آزادی کیلیے سرگرم عمل تھے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو جن لوگوں نے قائم کیا تھا، اُن کا اِسی جماعت سے تعلق تھا۔ پھر بھلا وہ کیسے چاہتے کہ اُس میں صرف مسلمان طالب علم پڑھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ اُس کے دروازے سب کے لیے کھلے رہیں۔ جامعہ کے پہلے امیر جامعہ حکیم اجمل خان نے اُس کے پہلے جلسہ تقسیم اسناد یا کنووکیشن کے موقعہ پر اس پہلو پر زور دیتے ہوئے کہا تھا کہ آج سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندوستان کے مختلف فرقوں کے طالب علم نہ صرف مل جل کر رہنا سیکھیں اور ایک دوسرے کے مذہب، تہذیب اور تمدن سے اچھی طرح واقفیت حاصل کریں بلکہ اُن میں ایک دوسرے کے لیے قدردانی اور قدرشناسی کی وہ صلاحیتیں بھی بیدار ہو جائیں جن کے بغیر قومی اتحاد اور متحدہ قومیت کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی مجلس تاسیس نے اپنے پہلے ہی جلسے میں کچھ ایسے فیصلے کئے تھے جو تعلیمی پالیسی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی کی روشنی میں مولانا محمد علی نے مسلمانوں کی قومی تعلیم کی اسکیم بنائی تھی۔ اس تعلیمی پالیسی میں جو باتیں شامل تھیں وہ یہ ہیں:۔

۱۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں غیر مسلم طلبہ کو بھی داخل کیا جائے گا۔

۲۔ ہر طالب علم کو اُس کے اپنے مذہب کی تعلیم دی جائے گی۔

۳۔ مسلمان طالب علموں کو عربی سکھائی جائے گی اور ہندو طلبہ کو سنسکرت۔

۴۔ اردو ذریعہ تعلیم ہوگی اور انگریزی کی تعلیم ثانوی زبان کی حیثیت سے دی جائے گی۔

۵۔ نظری تعلیم کے ساتھ پیشہ ورانہ تعلیم کا بھی انتظام کیا جائے گا۔

۶۔ یہ انتظام بھی ہوگا کہ ہر صوبے کے اسکول اور کالج جامعہ سے الحاق کر سکیں اور وہ اُن کی نگرانی کے فرائض انجام دے سکے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ تقریباً چار سال تک علی گڑھ میں رہی اور اسے خلافت کمیٹی سے مالی امداد ملتی رہی۔ ابتدا میں اُس پر سیاسی رنگ غالب رہا۔ اُس کے اونچے درجے کے طلبہ کو عدم تعاون اور ترک موالات کی تحریک میں کام کرنے کی تربیت دی جاتی۔ اس کے بعد وہ ملک کے مختلف مقامات پر بھیج دیے جاتے، جہاں وہ آزادی کی تحریک کا پرچار کرتے ہوئے گرفتار ہو جاتے تھے۔ جامعہ ملیہ کے قیام کو ابھی چھ مہینے ہی گزر رہے تھے کہ اس کے پہلے شیخ الجامعہ مولانا محمد علی کو انگریزی سرکار نے گرفتار کر لیا اور رہائی کے بعد وہ کانگریس کے صدر چن لیے گئے۔ اُن کی جگہ پر بیرسٹر عبدالمجید خواجہ شیخ الجامعہ مقرر ہوئے، اُن کی رہنمائی میں جامعہ ملیہ نے خلافت کمیٹی کے سیاسی اثرات سے آزادی حاصل کی اور ایک خالص تعلیمی ادارے کی حیثیت سے نشو و نما پائی۔ ۲۲ء تک اُس میں ابتدائی مدارج سے لے کر بی۔ اے اور بہت سے مضامین میں بی۔ اے آنرز کی تعلیم کا انتظام ہو گیا تھا۔ مختلف صوبوں کے کئی کالج اور اسکولوں نے اُس سے اپنا الحاق کرا لیا تھا۔ نظری تعلیم کے علاوہ، خطاطی، نجاری، جلد سازی، قفل سازی، بلاک سازی اور ان جیسے بہت سے دوسرے ہاتھ کے کام سکھائے جانے لگے تھے۔ صحافت اور پرنٹنگ سکھانے کا بھی انتظام تھا۔

۲۲ء میں عدم تعاون کی تحریک ملتوی ہوگئی اور ۲۴ء میں مصطفےٰ کمال پاشا نے ترکی میں خلافت کو ختم کر دیا۔ خلافت تحریک بے جان ہو کر رہ گئی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کو خلافت کمیٹی سے جو مالی امداد ملتی تھی وہ بند ہوگئی۔ تقریباً تین سال تک ایک آزاد آل انڈیا نیشنل مسلم یونیورسٹی کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد اُس کے کام کا پیمانہ چھوٹا ہوتا چلا گیا

پہلے ملحقہ اسکول اور کالجوں کی نگرانی اور رہنمائی کا کام بند ہوا۔ پھر آہستہ آہستہ پیشہ ورانہ تعلیم کی سہولتیں ختم ہوئیں۔ بی۔ اے آنرز کی تعلیم کا کام بھی بند کرنا پڑا۔ اس کے اسکول اور کالج میں استاد، طلبہ اور کارکن سب ملا کر تعداد میں سو سے بھی کم رہ گئے۔ علی برادران اور اُن کے ساتھیوں کی رائے تھی کہ اُسے بند کر دیا جائے۔ اب انھیں نہ تو یہ امید تھی کہ اُس کے کام سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، قوم پرستوں کے زیر اثر آ جائے گی اور نہ اس کی ضرورت کہ کسی سیاسی تحریک کے لیے والنٹیر تیار کیے جائیں۔ مگر جامعہ کے طالب علم اور استاد، حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری، عبدالمجید خواجہ اور ان سب کے ہم نواؤں کا خیال تھا کہ اُسے قائم رکھنا چاہیے کہ اُس جیسے آزاد، ترقی پسند اور قوم پرور تعلیمی ادارے کی ملک کو آج بھی ضرورت ہے۔ مہاتما گاندھی بھی اس خیال سے متفق تھے۔ انھوں نے کہیں سے ایک سال کے اخراجات کے لیے سرمایہ فراہم کر دیا۔ حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری یورپ میں ڈاکٹر ذاکر حسین اور اُن کے ساتھیوں سے ملے۔ وہ سب جامعہ کے لیے اپنی زندگیاں وقف کرنے کے لیے تیار تھے۔ مالی وسائل اور کارپرداز دونوں مل گئے تو حکیم اجمل خاں اُسے علی گڑھ سے دہلی لے آئے دہلی آکر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لیے نئی زندگی کے سامان پیدا ہوتے چلے گئے۔

محمد طیب جامعی

جامعہ ملیہ اسلامیہ قرول باغ میں

قرول باغ کی جامعہ کے متعلق مجھے کچھ عرض کرنا ہے اور آپ کے سامنے حاضری کا حکم شاید اس لیے ملا ہے کہ میں جگ بیتی کم اور آپ بیتی زیادہ سنا سکوں گا۔ جامعہ کی تاریخ تو قلم بند ہے اور قلم بند ہوتی بھی رہتی ہے لیکن یہاں تو صرف ان باتوں کا ذکر کروں گا جن کا تعلق براہ راست طالب علموں کا مزاج اور طالب علموں کی سیرت بنانے سے تھا۔

اب میں اپنی بات ذرا سے پس منظر سے شروع کرتا ہوں۔ سنہ ۱۹۲۵ء کا زمانہ ہے۔ جامعہ علی گڑھ میں ہے۔ تحریک ترک موالات دم توڑ چکی ہے، خلافت کمیٹی کی امداد بند ہو گئی ہے اور یہ سوچا جا رہا ہے کہ جامعہ کو بند کر دیا جائے۔ کارکنوں اور طلباء کی ایک مختصر سی جماعت کا، جو جامعہ کو چلانے کے لیے ہر قسم کی مصیبتیں جھیلنے کے لیے تیار تھی، یہ خیال تھا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب جو اس وقت اعلیٰ تعلیم کے لیے جرمنی گئے ہوئے تھے، جامعہ کو چلا لے جائیں گے۔ ان لوگوں نے ذاکر صاحب کو تار دیا کہ ارباب جامعہ، جامعہ کو بند کرنے پر غور کر رہے ہیں، آپ کا کیا مشورہ ہے، جواب آیا، ہماری واپسی تک بند نہ ہونے دیا جائے۔ یہ وفد پھر حکیم اجمل خان صاحب سے ملا، حکیم صاحب نے فرمایا، اگر

جناب محمد طیب صاحب۔ ۲۷۲۔ جامعہ نگر نئی دہلی۔ 110025

میں جامعہ کو دہلی لے آؤں تو تم کس حد تک قربانیاں دینے کے لیے تیار ہو، جواب دیا ہم جامعہ کو قائم رکھنے کے لیے بلامعاوضہ کام کرنے کے لیے تیار ہیں، حکیم صاحب نے فرمایا، جامعہ کو تو چلانا ہی ہوگا، آپ کو روپے کی دقت ہے تو میں بھیک مانگ لوں گا۔

۱۲ مارچ ۱۹۲۵ء کو یہ طے ہو گیا کہ گرمیوں کی تعطیل میں جامعہ کو دہلی منتقل کر دیا جائے۔ قرول باغ میں چند کوٹھیاں کرایہ پر لی گئیں اور جامعہ ان میں منتقل ہو گئی۔ اس وقت طاہر ایس محمدی صاحب قائم مقام شیخ الجامعہ کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ فروری ۱۹۲۶ء میں ذاکر صاحب، سید عابد حسین صاحب اور محمد مجیب صاحب جامعہ آ گئے، ۱۵ اگست ۱۹۲۶ء کو میں اور مجھ سے چھوٹے دو میرے ماموں زاد بھائی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے جامعہ پہنچے۔ میری عمر اس وقت گیارہ بارہ سال کی تھی۔ دہلی ریلوے اسٹیشن سے قرول باغ تک بہت سا حصہ غیر آباد تھا، قرول باغ میں ابھی سڑکیں بھی نہیں بنی تھیں، سڑکوں کی جگہ البتہ تھی، بجلی بھی نہیں آئی تھی۔ اس غیر آباد علاقہ میں جامعہ کا پتہ بھی مشکل سے معلوم ہوا اور بہت سا بھٹکنے کے بعد ہم جامعہ کی عمارتوں کے قریب پہنچے۔ یہاں کوئی جگہ ایسی نظر نہیں آئی جسے کالج یا اسکول کہا جا سکتا۔ کسی عمارت پر درس گاہ کا کوئی بورڈ یا نشان بھی نہیں تھا ہم نے ابھی تانگہ سے سامان اتارا نہیں تھا کہ چند نوجوان تیز تیز قدموں سے ہماری طرف آتے ہوئے نظر آئے۔ انھوں نے ہمیں سامان اتارنے نہیں دیا، خود اتارا اور خود اٹھا کر ایک عمارت کی طرف چلے جو بچوں کا دارالاقامہ تھا، معلوم ہوا یہ نوجوان کالج کے طالب علم ہیں۔ کتنا خلوص، کتنی یگانگت اور کتنی محبت تھی ان طالب علموں میں۔

بے سروسامانی کا زمانہ ہے، بورڈنگ میں نہ فرش ہے اور نہ فرنیچر، بکسوں سے میز اور ڈیسک کا کام لیا جاتا تھا۔ لیکن یہ سب چیزیں کمرہ میں سلیقہ سے تھیں اور بہت سی جگہ کاغذ پر جلی حرفوں میں لکھا تھا "جو چیز جگہ پر نہ ہو کوڑا ہے"۔ اس کے بار بار کے تکرار سے بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ چیزیں جگہ پر نہ ہوں۔ صبح کی نماز سے عشاء کے بعد مطالعہ تک ایسے مسلسل پروگرام تھے کہ طالب علم بار محسوس نہیں کرتا تھا بلکہ ان میں منہمک رہتا تھا۔

دو سال گذرے تو یہ بے سروسامانی ذرا کم ہوگئی۔ کمرہ میں ٹاٹ کا فرش بچھ گیا تھا، اور اب یہ شان تھی

بوریا جائے من و جائے تونگر قالین　　　　شیر قالیں دگر و شیر نیستان دگر است

قرول باغ میں اب بجلی بھی آگئی تھی۔ بجلی کے استعمال کے سلسلہ میں ہمیں ہدایت تھی کہ جب بجلی کی ضرورت نہ ہو تو سوئچ آف کردیا جائے۔ اس کی کچھ ایسی عادت ہوگئی تھی کہ کمرہ سے نکلتے وقت بے خیالی میں بھی ہاتھ سوئچ کی طرف چلا جاتا تھا۔

بورڈنگ میں اتالیق کی حیثیت باپ یا بڑے بھائی کی سی تھی۔ اتالیق کا بس نہیں تھا کہ وہ تمام خوبیاں جو ایک طالب علم میں ہونی چاہئیں، اسے گھول کر پلا دے، چوبیس گھنٹہ کا ساتھ، سونے، جاگنے، پڑھنے اور کھیلنے میں ہر جگہ ساتھ اور ہر جگہ شریک، ایک اتالیق تو ایسے تھے کہ طالب علم کے قصور پر روزہ رکھ لیتے تھے، یا کوئی ایسی سختی برداشت کرنی شروع کردیتے تھے جس کا طالب علم اثر لیتا تھا اور کوشش کرتا تھا کہ ان کی ناگواری دور ہو جائے۔ کچھ دن بعد ان ہی اتالیق نے یہ رسم بھی ڈالی کہ مغرب کی نماز کے بعد وہ علیحدہ ایک گوشہ میں بیٹھ جاتے تھے، ایک ایک طالب علم ان کے پاس آتا تھا اور یہ بتاتا تھا کہ دن بھر میں اس نے کیا کیا غلطیاں کی تھیں۔ اس بیان پر کوئی سزا نہیں ملتی تھی۔ اس کے اظہار سے کسی حد تک طالب علم کی اصلاح بھی ہوتی تھی اور اتالیق اس کی کمزوریوں سے کچھ نہ کچھ باخبر بھی ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد وہ یہ سوچتا تھا کہ اس خامی کو کس طرح دور کی جاسکتی ہے۔

گرمیوں کی تعطیل میں اتالیقوں کے ذاتی خطوط طالب علموں کے پاس پہنچتے تھے جو بالکل ذاتی نوعیت کے ہوتے تھے اور ان میں طالب علم کے مزاج کے مطابق کوئی نہ کوئی مخصوص بات بھی ہوتی تھی۔ اس خط و کتابت کا یہ فائدہ تھا کہ طالب علم اور استاد کا رشتہ خاندان والوں کا سا تھا، جس میں والدین بھی شریک ہو جاتے تھے۔

تعطیل کے بعد جب لڑکے واپس آتے تھے تو بیشتر کے ساتھ کچھ نہ کچھ ناشتہ ہوتا تھا، اس ناشتہ کو لڑکے بہت چھپا کر رکھتے تھے اور یہ دوسرے لڑکوں کی سمجھداری اور دانائی

پر منحصر تھا کہ وہ اس ناشتہ کو چرالیں اور طالب علم کی بے چارگی کا لطف اٹھائیں۔ ہمارے اتالیقوں نے یہ طرح ڈالی کہ جو ناشتہ لائے وہ دوسروں کی ضیافت کرے لیکن مخصوص دوستوں کی نہیں بلکہ ڈائننگ ہال میں کھانے کے ساتھ وہ ناشتہ بھی لگا دیا جائے۔ یک ہفتہ تک دسترخوان پر انواع واقسام کی چیزیں نظر آتی تھیں جنھیں ٹھکانے لگانا مشکل ہو گیا تھا۔

مہتر کے کام کے علاوہ تمام کام طالب علم خود کرتے تھے جس میں کمرہ میں جھاڑو دینا بھی شامل تھا۔ ایک کلاس کی سفیدی اور رنگ خراب ہو گیا تھا۔ مزدور سے یہ کام کرانا ممکن نہیں تھا، ایک دن ذاکر صاحب نے توجہ دلائی کہ کیا ایسا ممکن نہیں ہے کہ یہ کام ہم خود کرلیں۔ سب نے طے کیا کہ ہم خود ہی کریں گے۔ آپس میں چندہ کیا اور سامان لے آئے۔ یہ کام طلبار کو چھٹی کے دن کرنا تھا۔ دن بھر محنت کی اور شام کو یہ نتیجہ نکلا کہ رنگ پر سرخ دھبے نمایاں ہو گئے۔ اگلے دن ذاکر صاحب نے دیکھا اور ناگواری کا اظہار کیا۔ آنے والے جمعہ کو پھر اس میں لگ گئے۔ لیکن وہ خامی دور نہ کر سکے۔ ذاکر صاحب نے مزید ناگواری کا اظہار کیا لیکن کچھ ایسے اشارے کئے جن سے پتہ چلا کہ رنگوں کی آمیزش سے پہلے یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ کون سا رنگ کس رنگ میں ملایا جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ ٹھیک ہوا اور طلبار نے اطمینان کا سانس لیا۔ کام کرنے کی یہ عادت بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچی کہ جلسوں کا انتظام، پنڈال کا سجانا، مہمانوں کا استقبال اور ان کی بس بھر رات روزمرہ ہو گیا۔ اس میں ایسی لگن اور اتنا انہاک تھا کہ ہر طالب علم اسے اپنا ذاتی کام سمجھتا تھا۔ ترکی سے حسین رؤف بے اور کچھ وقفہ کے بعد خالدہ ادیب خانم آئیں تو دہلی کے معززین میں سے شاید ہی کوئی بچا ہو گا جو ان جلسوں میں شریک نہ ہوا ہو۔ اس زمانہ میں قرول باغ میں ٹریفک پولس کا کوئی انتظام نہیں تھا اور جامعہ یوں بھی معتوب تھی، حکومت کسی طرح کی مدد کرنے سے گریز ہی کرتی تھی، یہ انتظام بھی تمام کا تمام طالب علموں ہی نے کیا تھا اور غیروں سے اس کی تعریف سنی تھی۔

صبح کی ورزش اور شام کے کھیلوں میں کیلاٹ صاحب نے جان ڈال دی تھی اور

سے ایسا دلچسپ بنادیا تھا کہ وہ بچے جو قاعدے کی باتوں اور پابندیوں سے جی چراتے ہیں ذوق و شوق سے حصہ لیتے تھے۔ ورزش کے ساتھ وہ یہ بھی بتلاتے رہتے تھے کہ یہ کیوں ضروری ہے۔ کیلاٹ صاحب اس بات پر زور دیتے تھے کہ ہر برائی سے بچنے کے لیے تندرست جسم اور تندرست دماغ ضروری ہے اور تندرست جسم کے بغیر دماغ تندرست نہیں ہو سکتا۔ کیلاٹ صاحب ٹیم کی ہار اور جیت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے، وہ تو اس پر زور دیتے تھے کہ یہ کام پوری ٹیم کو مل کر کرنا ہے۔ کھلاڑیوں میں کس حد تک تال میل ہے اور سب کھلاڑی اپنی اپنی پوزیشن سنبھالے ہوئے ہیں۔ گیند کو زیادہ دور تک تنہا لے جانا ان کے یہاں جرم تھا۔ چھوٹے چھوٹے پاس ہوں اور جلد جلد گیند ایک دوسرے کے پاس پہنچتی رہے۔ کیلاٹ صاحب کی نگرانی اور تنظیم میں فوجی جھلک تھی۔ وہ فوج میں رہے بھی تھے۔ وہ ہر غلطی کو بر وقت ٹوکتے تھے اور نظرانداز کرنا ان کے یہاں ناقابل معافی جرم تھا۔ روپے کی قلت کے باوجود کیلاٹ صاحب نے سالانہ اسپورٹس کرائے اور اس کے نظم و ضبط کو اتنا باوقار بنادیا کہ اس میں شہر کے لوگوں کو بھی دل کشی محسوس ہونے لگی۔

سنہ ۲۰ء میں پہلی مرتبہ طلبا کے کام کی نمائش کا اہتمام کیا گیا۔ بے سروسامانی ویسی ہی تھی جیسی سنہ ۲۶ء میں تھی۔ کوئی ایسا ہال بھی نہیں تھا جس میں اس نمائش کو سجایا جاتا۔ کلاسوں کی ان دیواروں پر جو صحن کی طرف تھیں ہاتھ کی بنائی ہوئی چیزیں چسپاں کی گئیں تھیں۔ طالب علموں میں سے ایک دو نے بہت خوبصورت چھپی ہوئی تصویریں حاصل کیں اور وہ چسپاں کر دیں۔ ذاکر صاحب ان کاموں پر دور نظر ڈالتے تھے، چھپی ہوئی تصویر پر نظر پڑی تو اسے اکھاڑا اور پھاڑ کر ایک طرف ڈال دیا۔ کہنے لگے یہ تصویریں تو بہت مل جائیں گی۔ مجھے تو آپ کے ہاتھ کی ٹیڑھی میڑھی لکیریں پسند ہیں۔ آپ جو کچھ بنا سکتے ہوں وہ بنا کر لگائیے۔ ایک طالب علم نے بہت خوبصورت پھولوں کا حاشیہ بنا کر بیچ میں حکیم اجمل خاں صاحب کی تصویر چسپاں کی تھی اور اس کے نیچے یہ شعر لکھا تھا۔

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آں ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

کچھ زمانہ گذرا تو یہ نمائشیں بڑی معیاری ہو گئیں۔

۱۴ اپریل کو جلیان والا باغ کی یاد میں قومی ہفتہ منایا جانے لگا۔ اس روز چپراسیوں، بیروں، باورچیوں، بھشتیوں اور مہتروں کو چھٹی دیدی جاتی تھی اور سب استاد اور لڑکے اپنا کام آپ کرتے تھے۔ کاموں کی تقسیم میں اس وقت لطف بھی آتا تھا جب پاخانوں کی صفائی کا کام کسی کو اپنے ذمہ لینا ہوتا تھا۔ بیشتر طلباء اس سے کتراتے تھے اور پھر ان کا نمبر آتا تھا جو اُن میں زیادہ کارگذار اور زیادہ بردبار ہوتے تھے۔ دوپہر کا کھانا ہونے تک یہ دلچسپ کام جاری رہتا تھا۔ وہ وقت بھی پرلطف ہوتا تھا جب کھانے کی میز پر کسی کو مہتروں کے درمیان بیٹھنا ہوتا تھا۔ مہتر اس عزت پر ممنون اور بیٹھنے والا نازاں کہ، کارے کردم۔

شام کے وقت جلسہ ہوتا تھا، ایک دفعہ شیخ الجامعہ نے اپنی تقریر میں کہا،

"آزادی اس کو ملتی ہے اور اسی حد تک ملتی ہے جس حد تک کوئی شخص یا جماعت اسے قائم رکھنے کی اہل ہو۔ آزادی ایک مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتی، یہ روزانہ حاصل کرنے کی چیز ہے اور اس کے لیے وقتی جوش یا جذبہ کارگر نہیں ہوتا بلکہ مستقل عادتوں کی ضرورت ہوتی ہے، یعنی اچھی سیرت کی، اور اچھی عادتیں مشق سے پیدا ہوتی ہیں۔

کھلی ہوا کا مدرسہ شہر سے دور کسی کھلی جگہ میں ہوتا تھا۔ خیمے لگائے جاتے تھے، جگہیں تقسیم کی جاتی تھیں، دراصل طلباء میں یہ ذوق پیدا کرنا تھا کہ ماحول کو کس طرح بنائیں اور اس سے کس طرح مانوس ہوں۔ وسائل نہ ہوتے ہوئے ضرورتیں کس طرح پوری کی جائیں۔ کیا منظر ہوتا تھا، استاد اور طالب علم یکساں اس ماحول میں مگن ہیں اردگرد کو کس طرح سنواریں، ضرورتیں کس طرح پوری کریں، ہر شخص اسی میں لگا ہے اور اس کوشش میں ہے کہ اس کی جگہ دوسروں سے بہتر نظر آئے۔

سنہ ۳۱ء تھا۔ چند طلباء نے یہ طے کیا کہ سری نگر تک سائیکل سے سفر کیا جائے۔ تجربہ کے طور پر دہلی سے پانی پت کا سفر سائیکلوں سے کر بھی ڈالا تاکہ یہ معلوم ہو کہ یہ جرأت ممکن بھی ہے یا نہیں۔ سفر تو کر لیا، اور یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ مزید

بھی کیا جا سکتا ہے لیکن نہ تو راستوں کا علم، نہ نشیب و فراز سے واقفیت، نہ کوئی تجربہ، نہ اتنا پیسہ کے راستہ کے اخراجات برداشت کئے جا سکیں۔ ایک استاد نے یہ مدد کی کہ سرکاری دفتر سے راستوں کے وہ نقشے حاصل کر دیئے جو غیر سرکاری لوگوں کو نہیں دیئے جاتے۔ یہ نقشے اتنے مکمل تھے کہ ایک ایک بستی کا نام اور ایک ایک فاصلہ اس میں درج تھا۔ چند گز تک کے نشیب و فراز بھی اس میں درج تھے۔ ان نقشوں کو سمجھنے کی مشق کرائی گئی، پڑاؤ کی جگہیں طے کی گئیں، اگر وہاں کوئی جامعہ کا ہمدرد تھا تو اس کے پتے معلوم کئے گئے اور پلان تیار ہو گیا۔ اب اخراجات کے لیے روپے کی فراہمی کی بات رہ گئی، اس زمانہ میں جاپانی سائیکل بیس روپے میں آتی تھی۔ لیکن بیس روپے صرف ایک آئٹم پر صرف کر دیں تو باقی اخراجات کا کیا ہوگا، چنانچہ سائیکلیں کرایہ پر لی گئیں اور یہ طے پایا کہ واپسی میں بیس روپے فی سائیکل کرایہ کے دینے ہوں گے۔ بہت حقیر سی رقم گھر سے مل سکی اور یہ قافلہ روانہ ہو گیا۔ واپسی میں اس جماعت کا ہاتھ بالکل خالی ہو گیا تھا۔ اس وقت جامعہ نے دو سو روپے کا منی آرڈر بھیجا اور یہ لوگ خیریت سے دہلی واپس آ گئے۔ اٹھارہ دن میں سرینگر پہنچے اور بارہ دن واپسی میں لگے۔ کیسے کیسے راستوں سے گذرے، کیسے کیسے لوگوں سے دوچار ہوئے، کیسی کیسی صعوبتیں برداشت کیں، لیکن اتنا کچھ سیکھا اور سمجھا کہ کسی اور ذریعہ سے اتنا حاصل ہونا ممکن نہیں تھا۔

امتحان میں جب، ذاکر صاحب کا پرچہ ہوتا تھا تو وہ پرچہ دینے کے بعد یہ کہہ کر چلے جاتے تھے کہ پولس والا نہیں ہوں کہ ڈنڈا لے کر نگرانی کروں۔ آپ خود بھی اپنی نگرانی کر سکتے ہیں۔ میں اس مدت کو کسی اور بہتر کام میں صرف کروں گا۔ مجھے یاد نہیں کہ ان کے چلے جانے کے بعد کسی نے نقل کرنے کی جرأت کی ہو۔

جامعہ یونیفارم کی قائل نہیں تھی۔ ان کا خیال تھا کہ طالب علم کی صورت اور وضع سے درس گاہ کا پتہ چلنا چاہیئے نہ کہ مخصوص لباس سے۔ ایک موقع پر انھوں نے کہا تھا۔

"جن لڑکوں کی تعلیم ہماری نگرانی میں ہو وہ تندرست ہوں، ان کی چال ڈھال اچھی ہو، وہ لوگوں سے اچھی طرح صفائی اور وضاحت کے ساتھ بات چیت کر سکیں، ان کی گفتار میں حسن اور رفتار ہو، وہ صاف ستھرے رہتے ہوں، سچ بولتے ہوں، اپنے ماحول کے حسن و خوبی سے لطف اندوز ہو سکتے ہوں اور اسے حسین اور خوب تر بنانے کی آرزو رکھتے ہوں۔ ہمدردی اور اخلاق کی بنیادیں ان کی ابتدائی زندگی میں ایسی استوار رکھی گئی ہوں کہ بڑے ہو کر یہ اچھے ہندوستانی اور سچے مسلمان یعنی کامل انسان ہوں"

یہ چار نمونے تھے جو میں نے آپ کے سامنے پیش کئے۔

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ را

بقیہ خواتین جامعہ

جیالے پن اور صبر کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیا اور اکثر یہیں جمی رہیں یہ ایک الگ کہانی ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد دوبارہ جامعہ جب جمی تو دلی کے حالات بے حد خراب ہونے کے باوجود یہ خواتین پھر اپنے بکھرے اجڑے گھر بسانے آگئیں۔ جامعہ میں بہار آئی۔ میلے ہوئے، ڈرامے ہوئے اور جامعہ کی لڑکیوں اور خواتین نے ان میں بھرپور حصہ لینا شروع کیا۔

اور اب تو جامعہ بدل ہی گئی۔ اس کا اسٹیٹس بدل گیا۔ اس کے لوگ بیشتر بدل گئے۔ بہت سی خواتین یہاں پڑھانے لگیں کام کرنے لگیں۔ زندگیاں اور ہوگئیں اور اس تیس سال کی زندگی کی چھاپ شاذ و نادر کسی پر رہ گئی۔ لوگ جامعہ کی عورتوں کو کیا خود جامعہ کے ان خادموں ہی کو بھول گئے جن کے خون جگر کے یہ پھول کھلے نظر آتے ہیں۔

ہاں زمانہ بدل گیا جامعہ بڑھی اور بڑھے گی، بلندیوں پر پہنچے گی۔ اس کے ساتھ جامعہ کی خواتین جو اس کی کارکن ہیں ان کا نام بھی روشن ہوگا۔ مگر وہ بزم تو خالی ہو گئی۔ خدا اس نئی بزم کو نیا عزم اور حوصلہ عطا کرے، سچا عزم، درخشاں عزم ہو گا

عبداللہ ولی بخش قادری

جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر میں

اپنے قیام کے تقریباً پندرہ برس بعد جامعہ کو اپنی سرزمین نصیب ہوئی اور یکم مارچ ۱۹۳۵ء کو اوکھلا گاؤں میں دہلی کے جنوبی سرے پر اس کی عمارتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ سب سے پہلے مدرسہ ابتدائی کی عمارت تعمیر ہوئی جس کا سنگ بنیاد رکھنے کا فخر اس کے سب سے کم سن طالب علم کو حاصل ہوا۔ اگلے سال یہاں زندگی نے انگڑائیاں لینا شروع کر دیا اور یہی نئی بستی جامعہ نگر کہلائی۔ یہاں کی نصف صدی کی زندگی میں نمایاں طور پر تین دور نظر آتے ہیں جو اپنے واقعات اور معاملات میں ایک دوسرے سے جداگانہ صفات رکھتے ہیں۔ پہلے دور میں قرول باغ سے جامعہ نگر کو منتقلی کا سلسلہ برابر جاری رہا ہے۔ یہاں پر مدرسہ ابتدائی کو ایک اقامتی ادارے کی حیثیت دی گئی لیکن قرول باغ میں بھی ان کا مدرسہ قائم رہا۔ اس مرکزی ابتدائی مدرسے نے اقامتی زندگی کے آداب، انتظام اور طور طریقوں کو قائم کرنے، برتنے اور سنوارنے کی نہایت مفید تعلیمی اور تربیتی خدمت انجام دینے کے علاوہ علمی، تفریحی، اور سماجی طور پر بار آور مشاغل کو بھی خوب پروان چڑھایا بلکہ ان میں بڑی اُپج اور جدت طرازی بھی دکھائی۔ یہ مدرسہ عام روش سے ہٹ کر چھٹی جماعت تک کا تھا لیکن اُسے اچھے

جناب عبداللہ ولی بخش قادری شعبۂ اساس تعلیم، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی۔

سے اچھی استعداد اور اہلیت کے اساتذہ نصیب ہوئے اور وہ شیخ الجامعہ سے لے کر جملہ جامعہ برادری کی آنکھ کا تارا بنا۔ یہاں عام کھیل کود کے علاوہ تیراکی اور کشتی کا بھی اہتمام ہوا۔ بچوں کا بنک، بچوں کی دوکان، بچوں کا خوانچہ، جیسے حقیقی زندگی سے مطابقت رکھنے والے مشاغل شروع کیے گئے۔ دیواری اخبار کی ابتدا ہوئی، حرفوں کو تعلیم کا جزو بنایا گیا، بچوں کو تقریر، تحریر، آداب مجلس میں طاق بنانے کی کوشش کی گئی، صحت و صفائی اور پابندی اوقات کو روزانہ زندگی کا معمول قرار دیا گیا، مرغی خانہ، چڑیا گھر، قائم کیے گئے، ڈراما، کیمپ فائر، جیسی دلچسپیاں ایک تعلیمی وسیلہ بن گئیں، پروجیکٹ میتھڈ، کو اپنایا گیا۔ اس منصوبی طریقہ تعلیم کو جس طور اور جتنا یہاں برتا گیا اور اس کے موضوعات میں جو تنوع یہاں لایا گیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ کھلی ہوا کا مدرسہ منعقد کرنے کی راہ دکھائی گئی۔ غرضیکہ بچوں کے مشاہدات، تجربات اور معلومات سے تعلیمی مواد فراہم کرنے اور ان کا ذوق جستجو ابھارنے کی بھرپور کوشش کی گئی۔

جامعہ کی تاریخ کا ایک درخشاں واقعہ ۴ اگست ۱۹۳۶ء کو استادوں کے مدرسے کا افتتاح ہے۔ یہ تقریب تو قرول باغ میں منعقد ہوئی تھی لیکن تین روز بعد ہی ۷ اگست کو جامعہ نگر میں اس کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ یہ رسم جناب کے۔ سنتانم نے ادا کی تھی جنھوں نے عمارت کے لیے عطیہ بھی دیا تھا۔ اس موقع پر مجیب صاحب نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ

> "جامعہ والے ایک چھوٹی سی جماعت ہیں مگر اس جماعت کی ساری محنت اور سارا کام بے کار جائے گا اگر وہ اپنی ملت میں فنا ہو کر اپنے نصب العین کو ہندوستان کے مسلمانوں کا نصب العین نہ بنا سکی۔"

مقصد کی اس یاد دہانی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی جتلا دیا تھا کہ

> "کہیں ہم یہ نہ بھول جائیں کہ عمارت کام کے لیے بنتی ہے اور ہمیں اپنا کام اس طرح بڑھانا ہے کہ اس کے لیے کوئی عمارت کافی نہ ہو۔"

آج یہ حقیقت تو ہمارے سامنے ہے کہ عمارتوں کے سلسلے میں یہ آواز دل

کس قدر درست ثابت ہو رہی ہے لیکن حصولِ نصب العین کے بارے میں ہمیں اپنے دل میں جھانکنے سے ہی پتہ چل سکے گا۔ اگلے سال یہ مدرسہ اپنی عمارت میں جامعہ نگر میں منتقل ہو گیا۔ یہی وہ مدرسہ ہے جو اسم بامسمّیٰ ہونے کے علاوہ اوّلاً ٹیچرس ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ، بلکہ ٹی۔ ٹی۔ آئی، کے نام سے مشہور رہا، پھر ٹیچرس کالج، کے نام سے اپنی شناخت قائم کی اور آج فیکلٹی تعلیم کی صورت میں ہمارے درمیان موجود ہے۔ اس کا قیام نہ صرف اس بستی یا جامعہ کا ایک اہم سنگ میل ہے بلکہ ملک کے تعلیمی نقشے میں بھی اس کا اپنا مقام ہے اور وہ ہماری جدوجہدِ آزادی کی تحریک کے ایک علمبردار اور مبلّغ کی بھی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا قیام ایک قومی ضرورت کے تحت عمل میں آیا تھا۔ اُس وقت پہلی بار متعدد صوبوں میں کانگریس کی حکومتیں قائم ہوئی تھیں اور بنیادی قومی تعلیم کا نفاذ اُن کی پالیسی قرار پایا تھا۔ لیکن اس نئی تعلیم کے لیے اساتذہ کہاں تھے۔ لہٰذا گاندھی جی نے اپنی نگرانی میں سیوا گرام کے زیرِ تربیت اساتذہ کا انتظام کرنے کا فیصلہ کیا اور ذاکر صاحب پر جامعہ میں استادوں کا مدرسہ قائم کرنے کی ذمہ داری ڈالی۔ اس کے علاوہ مدرسے کے لیے ہندوستانی تعلیمی سنگھ سے مالی امداد بھی حاصل ہوئی اور جناب جی۔ رام چندرن جیسے حضرات بھی مدرسے میں کام کرنے کے لیے آئے۔ یہ وہی رام چندرن جی ہیں جو اس وقت گاندھیائی فکر کے نہایت ممتاز اور معتبر مفسّر و مبلّغ تسلیم کیے جاتے ہیں اور گاندھی گرام، میں تعلیمی اور تعمیری کام میں مصروف ہیں۔ اگرچہ تربیتِ اساتذہ کے یہ دونوں مرکز ایک ہی غرض سے معرضِ وجود میں آئے تھے لیکن ایک جگہ آشرم کی زندگی کی چھاپ زیادہ گہری پڑ گئی اور وہ تعلیمی دنیا کو متاثر کیے بغیر ہی ختم ہو گیا لیکن دوسری جگہ وہ تمام ملک میں بنیادی تعلیم کے اساتذہ کی تربیت کا سب سے ممتاز ادارہ قرار پایا۔

اسی سال انجمن طلبہ ہائے قدیم، کی عمارت کا سنگ بنیاد بھی رکھا گیا۔ ذاکر صاحب کو جامعہ کا سب سے پہلا طالب علم بھی تسلیم کیا گیا ہے۔ اسی حیثیت سے اُنھوں نے اس عمارت کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔ اس موقع پر جو بصیرت افروز تقریر اُنھوں نے

فرمائی تھی اس کے چند جملے ملاحظہ ہوں۔

"جب بھی جامعہ میں کسی نئی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا جاتا ہے تو میرا دل تھرتھراتا ہے۔ ایسے موقعوں سے فائدہ اٹھا کر میں اہل جامعہ کو یاد دلاتا ہوں کہ عمارتوں کی کثرت کسی ادارے کے لیے قابل فخر نہیں ہے۔ اکثر عمارتیں یا تو مقبرے ثابت ہوتی ہیں یا قیدخانہ۔ اگر عمارت میں رہنے والے اصل مقصد کو بھول جائیں تو وہ عمارتیں اُن کے مقاصد اور ارادوں کا مقبرہ بن جاتی ہیں، اگر عمارتیں ہی مقصود بالذات بن جائیں تو وہ جیل خانہ ہیں جن سے حوصلوں، اُمنگوں اور ولولوں کو نکلنے کی راہ نہیں ملتی۔"

۱۹۳۹ء میں مدرسہ ثانوی کی عمارت تعمیر ہوئی اور چند اساتذہ نے بھی اپنے ذاتی مکانات بنوا لیے۔ اگلے سال مدرسہ ثانوی اور کالج بھی جامعہ نگر منتقل ہو گئے۔ اس طرح بیشتر شعبے یہاں کام کرنے لگے۔ اسی سال جامعہ نے اوکھلا گاؤں کا مدرسہ قائم کیا۔ اگرچہ کالج میں طلبا کی تعداد کم رہتی تھی کیونکہ اس وقت تک سندیں تسلیم نہیں کی گئی تھیں تاہم طلبہ میں قومی خدمت اور رفاہِ عام کا جذبہ بڑا قوی ہوتا تھا اور مطالعہ نہایت وسیع۔ اُن میں سے بیشتر قلم کے دھنی بھی نکلتے تھے نیز اساتذہ کا تخلیق کردہ ادبی اور علمی سرمایہ نہایت وقیع تھا۔ ثانوی مدرسے میں بھی ابتدائی مدرسے کی طرح مختلف دلچسپ مشاغل کا اہتمام کیا گیا تھا اور طفیل کورد کا معیار بلند رہتا تھا۔ یہاں 'تفویض کا طریقہ' رائج کیا گیا تھا اور بہت جلد مقامی تاریخ کا کمرہ، جغرافیہ کا کمرہ، نمایاں حیثیت اختیار کر گئے تھے۔

۱۹۴۱ء میں یہاں 'بنیادی قومی تعلیم' کی دوسری سالانہ کانفرنس منعقد ہوئی جس کا افتتاح ڈاکٹر راجندر پرشاد نے فرمایا تھا۔ اس کانفرنس میں مختلف صوبوں، ریاستوں اور قومی جماعتوں کے تقریباً ڈیڑھ سو مندوبین شریک ہوئے تھے۔ اس طرح جامعہ نگر بحیثیت ایک بستی یا مقام ہندوستان بھر میں متعارف ہوا اور 'بنیادی قومی تعلیم' کی تاریخ میں اس کا نام ثبت ہو گیا۔ ۱۹۲۹ء میں پہلی بار بچوں کا میلا شروع کیا گیا جو کچھ عرصے بعد 'تعلیمی میلا' قرار پا گیا اور شہر دہلی کے لوگ بھی اس میں شرکت کرنے لگے۔

اب جامعہ نگر کی بستی نے اپنا روپ اختیار کر لیا تھا اور شہری زندگی کے مسائل بھی بڑھنے لگے تھے۔ لہذا ۱۹۴۴ء میں شعبہ امورِ عامّہ کا قیام عمل میں آیا گویا جامعہ کا اپنی چھوٹی سی میونسپلٹی قائم ہو گئی۔ آخر کار یہ جامعہ نگر کی بستی، بستے بستے بس ہی گئی اور نومبر ۱۹۴۶ء میں وہ سارے دیس کی توجہ کا مرکز بن گئی جبکہ اس کے دامن میں جامعہ کے جشن سیمیں کی تقریبات کا انعقاد ہوا۔ اس موقع پر ذاکر صاحب نے "جامعہ کیا ہے" کتابچہ تحریر کر کے اہلِ وطن کو جامعہ کے موقف اور تعلیمی خدمت سے آگاہ کرایا اور خود جامعہ والوں کو اپنی راہ پر گامزن رہنے کا حوصلہ دیا۔ یہاں اس کتابچے سے چند جملے پیش ہیں جن سے ہمیں اپنے فکر و عمل کو پرکھنے کے لیے اشارہ ملتا ہے:

"جامعہ ملیہ کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی آئندہ زندگی کا ایک ایسا نقشہ تیار کرے جس کا مرکز مذہب اسلام ہو اور اس میں ہندوستان کی قومی تہذیب کا وہ رنگ بھرے جو عام انسانی تہذیب کے رنگ میں کھپ جائے..... علم محض روزی کے خاطر جو ہمارے ملک کی جاریہ تعلیم کا اصول ہے اور علم محض علم کی خاطر جو قدیم تعلیم کا اصول تھا، دونوں کو بہت تنگ اور محدود سمجھتی ہے۔ وہ علم زندگی کی خاطر سکھانا چاہتی ہے جس کے وسیع دائرے میں مذہب، حکمت اور صنعت، سیاست اور معاشت سبھی کچھ آجاتا ہے۔"

ذاکر صاحب نے اس کتابچے میں اپنے انداز میں جامعہ کے مقاصد کی وضاحت فرمائی ہے لیکن مقاصد وہی ہیں جن کا اشارہ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کے افتتاحی خطبے میں ملتا ہے اور جن کی واضح طور پر نشاندہی پہلے امیر جامعہ حکیم اجمل خاں صاحب کے پہلے جلسہ تقسیم اسناد ۱۹۲۱ء کے خطبۂ صدارت میں کی گئی ہے۔ مسیح الملک نے پانچ بنیادی اصول گنائے ہیں:

ا۔ از کلید دین درِ دنیا کشاد..... اگرچہ ہم نے تمام دیگر علوم جدیدہ کو اپنے

نظام میں جگہ دی لیکن قرآن اور اسلام کو مخدوم بنایا اور انھیں خادم۔

۲۔ تاریخ اسلامی ...... ہم نے تاریخ اسلامی کو اپنی تعلیم کا جزوِ لازمی قرار دیا کہ یہ نفسِ ملّیہ کے تواتر کو قائم رکھنے کے لیے بمنزلۂ حافظہ کے ہے۔

۳۔ مادری زبان میں تعلیم ...... ہم طالب علم میں علم کا ذوق پیدا کرنا اور اُس کے اعمال پر اُس کا اثر دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس لیے ہم نے ایک غیر زبان کے ذریعے تعلیم دینے کے غیر فطری طریقہ کا بھی یک قلم سدّباب کر دیا۔

۴۔ کسب معاش اور تعلیم حرفہ ...... میں یقیناً چاہتا ہوں کہ ہم اپنے متعلّمین کے لیے کسب معاش کی ہر ممکن سہولت فراہم کریں اور مجھے بڑی خوشی ہے کہ جامعہ ملّیہ کے جاریہ نظام میں تعلیمِ صنعت و حرفت ہر شخص کے لیے لازمی قرار دی گئی ہے۔

۵۔ متحدہ ہندوستانی قومیت ...... اسلامیت کے ساتھ وطن کی خدمت کا جذبہ پیدا کرنا بھی ہمارے پیش نظر ہے۔

اسی طرح ہمارے پہلے شیخ الجامعہ مولانا محمد علی نے بھی 'خدا پرستی' 'ملت پروری' اور وطن دوستی، کو جامعہ کے مقاصد قرار دیا ہے (ہمدرد، دہلی۔ ۱۸ جنوری ۱۹۲۰ء)۔

اِس کتابچے کے علاوہ جشن سیمیں کے خاص جلسے میں ذاکر صاحب نے جامعہ کے پچیس سال کی مختصر روداد بھی پیش کی تھی۔ اس میں جامعہ کے جملہ رفقاء کی خدمات کا اعتراف، مشکلات کا ذکر، امکانات کا اشارہ، ملک کو درپیش خطرات کا انتباہ اور بہت کچھ موجود ہے۔ وہ ایک دردمند دل کی صدائے دردناک بھی اور عزم و استقلال کا اعلان نامہ بھی۔ وہ خطابت بھی ہے اور ایک ادبی شہ پارہ بھی۔ اسے سن کر کوئی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ لیکن " ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال "، کے مصداق عین اس وقت جبکہ ذاکر صاحب متحدہ ہندوستانی قومیت، دوستی، ایثار اور خدمت کا درس دے رہے تھے اور اس کے ساتھ قوم کے سامنے جامعہ کی زندگی پیش کر رہے تھے، ملک میں تنگ نظری اور منافرت کی آگ بھڑکنا شروع ہو گئی اور فرقہ وارانہ کشیدگی نے اپنوں کو بیگانہ بنا دیا۔ ذاکر صاحب کی ذ...

اور جامعہ کی خدمات کا اتنا اثر تو ضرور ہوا کہ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کی ممتاز ہستیاں جامعہ کے جشن سیمیں کے موقع پر یک جا ہو گئیں اور بہ یک آواز ذاکر صاحب اور اُن کے رفیقوں کے کام کو بڑی کشادہ دلی سے سراہا لیکن فرقہ وارانہ جنون کو "مردِ درویش" کی فریاد بھی نہ روک سکی جشن ختم ہوتے ہوتے فسادات کا بازار گرم ہو گیا۔ دہلی میں یہ آگ جتنی دیر سے سُلگی تھی، اب اتنی ہی زور سے بھڑکی۔ اہل جامعہ کو سکون و اطمینان کے بجائے انتشار و خدشات نے آگھیرا۔ قرول باغ میں اس کی املاک کو نقصان پہنچا اور وہاں سے قطعی طور پر بے دخلی ہو گئی۔ تبادلۂ آبادی کے سلسلے میں اس کو بھی متعدد رفیقوں سے ہاتھ دھونا پڑا اور ان داغ مفارقت دینے والوں میں بیشتر وہی تھے جو ان علاقوں سے تعلق رکھتے تھے جو اب ایک نیا ملک قرار پا چکے تھے۔ اللہ اللہ کر کے چند ماہ کے بعد دہلی اپنے حواس میں آئی۔ ملک آزاد ہو چکا تھا! ذاکر صاحب نے پھر سے احباب کے دلوں میں عزم و استقلال کی شمع روشن کی لیکن خود انھیں ملکی مصالح کے تحت اپنی مادرِ علمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی آبرو بڑھانے کے لیے جامعہ کو خیرآباد کہنا پڑا۔ اس المیے پر ذاکر صاحب کا دور یا جامعہ نگر کی جامعہ کا پہلا دور اختتام پذیر ہوا۔

اس دوسرے دور کا آغاز مجیب صاحب کے ۱۹۴۸ء میں جامعہ کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے ساتھ ہوا اور ۱۹۷۳ء میں علالت کے باعث اُن کی سبک دوشی پر ختم۔ انھوں نے نہایت نامساعد اور صبر آزما حالات میں جامعہ کی تشکیلِ نو کا بار سنبھالا۔ اُس وقت تہذیبی، سماجی، لسانی، جذباتی ہر طرح کے مسائل درپیش تھے مگر مجیب صاحب نے بڑی دانش مندی کے ساتھ حالات سے سازگاری حاصل کی اور جامعہ کی صورت کو مسخ ہونے سے بچالیا۔ آہستہ آہستہ تعلیمی اور تعمیری ترقی کے آثار دکھائی دینے لگے۔ ۱۹۵۲ء میں آرٹ کے اساتذہ کی تربیت کا آغاز ہوا جو کہ ملک کی تعلیم میں ایک اجتہادی قدم تھا۔ ۱۹۵۵ء میں نرسری اسکول قائم کیا گیا۔ یہ دونوں ادارے انفرادی کوششوں کا نتیجہ تھے جن کا وجود نہ جامعہ میں

اساتذہ کے اندر آزادی فکر و عمل کی غمازی کرتا ہے۔ یکے بعد دیگرے ٹیچرس کا ہوسٹل، ادارۂ تعلیم و ترقی، انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس ایجوکیشن، گرلس ہوسٹل، جامعہ کالج، جامعہ رورل انسٹی ٹیوٹ کی عمارتیں اور چند رہائشی کوارٹر تقریباً دس سال کے عرصے میں تعمیر پا گئے اندر آزادی کے بعد پہلا اطمینان کا سانس جامعہ نے ۱۹۶۰ء میں 'جشنِ چہل سالہ' کی صورت میں لیا۔ ۱۹۶۲ء میں حکومت نے جامعہ کو اعلیٰ تعلیم کے ادارے کی حیثیت سے تسلیم بھی کر لیا۔ اب اعلیٰ تعلیم کے فروغ کی راہیں کھل گئی تھیں۔ اگلے برسوں میں اعلیٰ تعلیم کی سہولتیں برابر بڑھتی رہی ہیں اور تعمیر کا سلسلہ بھی ہنوز جاری ہے۔ دورِ مجیب، کے بعد جامعہ نگر کی زندگی کے تیسرے دور کا آغاز ہوا ہے جس نے اب تک تین سربراہ دیکھے ہیں۔ دورِ مجیب، کے پروردہ مجھ جیسے بہت سے افراد بھی موجود ہیں اور بعد کو آنے والے غالباً اُن سے بھی زیادہ۔ نیز دو سال قبل اسی زمانے میں مجیب صاحب کی خدمت میں پیش کی کتاب اور ماہنامہ جامعہ کے تازہ 'مجیب نمبر' میں بھی مجیب صاحب کے عہد سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے وافر مواد دستیاب ہو جاتا ہے اور اپنے اِس 'حال' پر ہم سب خود ہی نظر ڈال سکتے ہیں۔ لہٰذا کسی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے البتہ جائزہ ضرور درکار ہے۔ اب میں کسی قدر بلند آہنگی کے ساتھ خود کلامی کی جسارت کر رہا ہوں۔

سب سے پہلے تو یہی خیال آتا ہے کہ جامعہ کی اقدار اور روایات کو برقرار رکھنے اور اُن کے مطابق اعلیٰ تعلیم کو فروغ دینے کے لیے نہایت ضروری ہے مدارس کا دامن کشادہ کیا جائے، اتنا کشادہ کہ وہ خاطر خواہ تعداد میں سچے اچھے 'جامعی' اعلیٰ تعلیم کے میدان میں پہنچا سکیں۔

ابتدائی اور ثانوی منزل کی تعلیم کی طرف بالخصوص توجہ کرنے کے علاوہ ہمارے سامنے کئی بنیادی سوال بھی اٹھتے ہیں۔ ہمیں آئندہ ایام میں اپنی حیثیت اور حالت کا ادراک درکار ہے۔ ہم کس مقام پر ہیں اور ہمارا رخ کدھر ہے

ہمارے مقاصد کیا ہیں اور عصری تقاضے کیا؟ ہم مصلحتِ وقت کے منکر نہ بنیں لیکن یہ بھی نہ بھول جائیں کہ وفا بھی ہے کوئی چیز، وفا اپنے نصب العین سے، وفا اپنے مقاصد سے، وفا اپنی ملت سے، وفا اپنی تہذیب اور زبان سے۔ میں نے بزرگانِ جامعہ کے اقوال اسی لیے دہرائے ہیں کہ اُن سے ہماری وفاداریوں کا پتہ چلتا ہے اور اُن سے ہی ہمارا نظام اقدار قائم ہوتا ہے۔ آج ہماری نئی تعلیمی پالیسی، میں اقدار کی تعلیم یا اقدار رُخ تعلیم پر زور دیا جا رہا ہے۔ کیا یہ اقدار کی تعلیم موجودہ اخلاقی تعلیم اور اس کی پیش رَو مذہبی تعلیم، سے کوئی مختلف مفہوم رکھتی ہے۔

اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ 'مساوات' اور 'انصاف' دونوں ایک ہی بات نہیں ہیں۔ ہمارے ملک میں حصولِ آزادی کے بعد تعلیمی سہولتوں میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے لیکن سب کو تعلیم کے یکساں مواقع فراہم ہونے کی طرف کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ کیونکہ سماج میں بالادستی رکھنے والوں کے حصے میں ہی یہ سہولتیں کم و بیش آئی ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مختلف گروپوں کے درمیان اور ایک ہی گروپ کے اندر بھی فرق بڑھے ہیں۔ اس لیے اُونچ نیچ کی صورت میں یکساں سلوک 'برابری' نہیں لاتا بلکہ 'ناہمواری' بڑھاتا ہے۔ ہمیں یہ غور کرنا چاہیے کہ ہم کیوں کر اپنے پس ماندہ طبقے کو اُٹھا سکتے ہیں اور کس قدر جلد اُسے اپنے سے زیادہ ترقی یافتہ اکثریت کے ہم پلّہ بنا سکتے ہیں۔ یہی انصاف کا تقاضہ ہے اور اسی طرح پورے دیس کو خوش حال بنایا جا سکتا ہے۔ سماج میں کسی ایک عضو کو کمزور چھوڑ کر ہم اس کے پورے جسم کو توانا نہیں گردان سکتے۔ تعلیم ہی سماجی تبدیلی کا ایک موثر وسیلہ ہے اور اُسی کے ذریعے ایسا سماج قائم کیا جا سکتا ہے جو کہ 'آزادی'، 'برابری' اور 'انصاف' پر مبنی ہو۔

صالحہ عابد حسین

خواتین جامعہ

آج اس موقع پر میں خواتین جامعہ کا ذکر کرنا چاہتی ہوں جو شاہجہاں اور بڑے بڑے ارکی ٹکٹ کی پشت پر کام کرنے والے ان مزدوروں کی طرح تھیں جنھوں نے تاج محل تو بنایا مگر اپنا نام نمایاں کرنے کا ذہن میں خیال بھی نہ آیا۔ ان میں سے کچھ وطن چھوڑ کر جا چکیں، کچھ خدا کو پیاری ہوگئیں کچھ بوڑھی اور بیمار و معذور ان اچھے دنوں کی یاد میں گم ہیں۔ جب زندگی ان کی تھی اور زندگی کی اور داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی ایک شمع آپ کے سامنے جل رہی ہے۔ یاد کر رہی ہے اپنی ان بہنوں کو جن کو اس نے عزم و حوصلہ کا پہاڑ پایا، جنھوں نے صحرا میں گل کھلائے، جو جنگل کو منگل بنانے کے گر جانتی تھیں۔ جو گزی گاڑھا پہن کر، روکھا سوکھا کھا کر، پانی جیسی بنیادی ضرورت تک کی آسانیوں سے محروم رہ کر بھی، زندگی خوش و خرم بسر کر سکتی تھیں۔ وہ لطف اٹھاتی تھیں محنت اور مشقت میں وہ خوش رہتی تھیں مفلسی اور کٹھنائیوں میں، وہ فخر و شان سے ملتی تھیں بڑی سے بڑی ہستی سے۔ ان میں احساس کمتری نہ تھا تو غرور بھی نہ تھا کہ وہ

بیگم صالحہ عابد حسین صاحبہ۔ عابد ولا۔ جامعہ نگر نئی دہلی۔

کتنا اہم کام انجام دے رہی ہیں بلکہ شاید اس کا احساس ابھی نہ تھا۔

میں نے اکثر جلسوں میں تقریروں اور مضامین وغیرہ میں جامعہ کے پرانے لوگوں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے دیکھا لیکن ساتھ یہ بھی محسوس کیا ہے کہ ان کا ذکر ایک عزت مگر رحم کے جذبے کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ بجائے ایسی سختی جھیلتے تھے پاسو یا پچھتر روپے میں گزارہ کرتے تھے۔ وغیرہ وغیرہ، یہ اس لیے کہ ———— وہ نہیں جانتے کہ اس دور عسرت اور کٹھنائی میں کیسی کیسی نعمتیں ان مجاہدوں اور ان کے خاندانوں کو ڈھکی چھپی حاصل تھیں۔ نہ آپ اس درد کو سمجھ سکتے ہیں نہ میں بیان کر سکتی ہوں۔

جب میں ۱۹۳۳ء میں جامعہ آئی تو جامعہ قرول باغ میں تھی اور بکھری بکھری عمارتوں میں جامعہ کا کام چلتا تھا۔ کہیں مکتبہ کہیں تعلیمی مرکز، کہیں بورڈنگ اور یہاں وہاں جامعہ کے کارکنوں کے کرائے کے مکان۔ بیویاں کم ہی یہاں رہتی تھیں اور جو رہتیں وہ آپس میں کم ملتی تھیں۔ ایک خاندان ایک یونٹ یہاں ابھی تک نہ بنا تھا۔ میں شادی کے بعد ایک عرصے تک بیمار رہی پھر بھی سب جامعہ کی خواتین سے ملاقات رہتی۔ آپا جان مس گرڈا فلپس بورن جو جامعہ کی خاتون اوّل تھیں انھوں نے خدا جانے کیسے پہچان لیا کہ میں جامعہ میں عورتوں کا کچھ کام کر سکوں گی، اور انھوں نے اکسانا شروع کیا۔ میں نے کہا پہلے جامعہ کے جلسوں میں ہمیں جانے کی اجازت اور بیٹھنے کی جگہ تو دلوائیے۔ چنانچہ انھوں نے تعلیمی مرکز کے اوپر کی چوڑی بالکونی میں چقیں ڈلوا کر عورتوں کے بیٹھنے کا انتظام کرا دیا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ سب سے پہلے جو جلسے ہم نے اٹینڈ کیے وہ خالدہ ادیب خانم کے وہ آٹھ لکچر تھے جس کو سننے کے لیے دور دور سے لوگ آئے تھے اور ہندوستان کی قابل ترین و مشہور ہستیوں نے اس کی صدارت کی تھی۔ گاندھی جی مولانا آزاد، ڈاکٹر اقبال، سروجنی نائیڈو وغیرہ مجھے آج بھی یاد ہے جب "بلبل ہند" چہک رہی تھیں اور ہندوستانی عورت کی خدمات اور صفات گنا رہی تھیں تو میرا

دل خوشی سے پھولا جا رہا تھا۔

خواتین کا پہلا فنکشن بیگم مجیب کے گھر پر ہوا جس میں خالدہ ادیب خانم خواتین جامعہ سے ملنے تشریف لائیں۔ چائے کی دعوت ہوئی، آنکھوں آنکھوں میں محبت کی زبان سے باتیں ہوئیں۔ کچھ نے ترجمان کی معرفت گفتگو کی۔ اور خالدہ ادیب خانم یہ تاثر لے کر اٹھیں کہ ہندوستانی عورتیں ایسی جاہل اور احمق بھی نہیں جیسی کہی جاتی تھیں۔ پہلی بار خواتین جامعہ نے ان کے ساتھ تصویر کھنچوائی اور کسی فوٹو گرافر کو درشن دیئے۔ یہ حسین تصویر آج بھی شاید مجیب صاحب کے گھر میں موجود ہو ہم نے تو کھودی۔

اور اس طرح جامعہ کی خواتین نے زندگی میں حصہ لینا شروع کیا۔

اوکھلے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی عمارت کا سنگ بنیاد خالدہ ادیب خانم کی موجودگی میں رکھا گیا تھا۔ ہزاروں دلی والوں، سینکڑوں جامعہ والوں اور اس کے پرستاروں کے بیچ میں اوکھلا کی بنجر زمین پر جس کے چاروں طرف اوبڑکھابڑ زمین، چھوٹی چھوٹی بجری کی پہاڑیاں، اور گڈھے تھے، ریتیلی زمین خشک جھڑبیری کے پیڑوں کی جھاڑیوں سے ڈھکی، اس بنجر زمین پر جامعہ والے علم و دانش کے گل کھلانے کے عزم کے ساتھ آئے تھے۔ اس مجمع میں خالدہ ادیب خانم کے علاوہ بیگم محمد علی اور ان کے گھرانے کی عورتیں، بیگم مجیب کے ساتھ یہ خاکسار بھی مع نقاب اور برقعہ کے موجود تھی اور جامعہ کے مستقبل کے خواب دیکھ رہی تھی۔

قصہ مختصر جامعہ نگر بننا اور آباد ہونا شروع ہوا۔ مدرسہ ابتدائی کی عمارت تو پہلے ہی بن گئی کچھ اور عمارتیں بنیں۔ پروفیسر مجیب کی وسیع کوٹھی ہی نہیں بنی باغ تک میں گل کھل گئے۔ حافظ فیاض نے نئے اور پرانے طرز کا مکان بنوایا۔ ذاکر صاحب کا خوبصورت اور مختصر گھر بنا۔ مولانا اسلم کا مختصر سا مکان، رزاقی صاحب کا غریب خانہ، صغیر صاحب مرحوم نے پہاڑی کے ادھر اور ادھر کے

گروں کے بیچ میں ایک لینڈ مارک کی طرح چھوٹا سا گھر بنا لیا اور غفار صاحب نے وہ محلہ آباد کیا جو اب غفار منزل کہلاتا ہے ان کے چھوٹے سے گھر کے سرنامہ پر لکھا تھا:

مکاں منعم کا سونے سے یہ خونِ دل سے بنتا ہے
خس و خاشاک کا گھر بھی بڑی مشکل سے بنتا ہے

بقی صاحب نے تو سب سے پہلے اپنا گھر بنایا تھا۔ بڑے گڈھے کے کنارے کچھ زمین لیز پر لے کر ہم نے بھی اپنا مکان بنا ڈالا۔ اور ۱۹۴۰ء تک تقریباً ساری جامعہ آباد ہو گئی۔ یہ سب بڑے چھوٹے کچے پکے مکان جامعہ کی اُن خواتین نے یا زیور بیچ کر، یا وطن کی جائیداد فروخت کر کے بچوں کے مستقبل کو سوچ کر بنوائے تھے۔ انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ اب یہی ان کا گھر اور وطن ہے اور رہے گا اور چنانچہ اب وہ سب خواتین بھی جو میکے یا سسرال میں رہتی تھیں اور کبھی کبھار آتی تھیں۔ جامعہ نگر کی بستی میں آن بسیں۔ جب ان کے اپنے گھر ہیں تو وہ کیوں کسی کا احسان لیں۔ اپنی روکھی سوکھی دوسرے کے پلاؤ قورمہ سے کہیں بہتر ہے۔ عورت کو اپنا گھر جتنا پیارا ہوتا ہے صرف وہی جانتی ہے۔ ذاکر صاحب لاکھ کہتے رہے کہ مجھے جامعہ کے لیے ان گھروں کی ضرورت ہے مگر وہ بھی جانتے تھے اور ہم بھی کہ یہ مذاق ہے۔ کون اپنا گھر چھوڑے گا۔ چنانچہ جامعہ نگر ایک بستی نہ تھی، جامعہ محض ادارہ نہ تھا۔ ایک خاندان تھا۔ وسیع خاندان جس کے دکھ ایک تھے سکھ ایک تھے کٹھنائیاں ایک تھیں مجبوریاں ایک تھیں مشکلیں ایک تھیں اور خوشیاں ایک تھیں۔ جب یہ خاندان آباد ہو گیا تو اب خواتین کو فکر ہوئی کہ ان کی اپنی ایک انجمن ہونی چاہیئے۔ آپا جان مشیر اور رہبر رہتی تھیں۔ چنانچہ انجمن خواتین جامعہ کی بنیاد پڑ گئی۔ بیگم مجیب مستقل صدر تھیں، اکثر بیگم ذاکر کو بھی گھیر گھار کر صدر بنا لیا جاتا تھا۔ میں مستقل سکریٹری تھی اور اختر جمال، نور فاطمہ، اور جامعہ کے لوگوں کی بیٹیاں بھانجیاں، بہنیں میری دست راست ۴ آنے چندہ رکھا گیا جو بڑی مشکل سے

وصول ہوتا) باری باری لوگوں کے گھروں میں جلسے ہوتے۔ مہینہ میں کم سے کم ایک خاص موقعوں پر مثلاً عید، بقرعید، محرم اور یوم ولادت رسول اکرم پر بڑے بڑے جلسے اور دعوت بھی ہوتی تھی۔ جلسوں میں بولنے اور پڑھنے کے لیے ایک سے ایک پیاری ہستیاں موجود تھیں جن میں نوجوان لڑکیاں اور عورتیں پیش پیش تھیں۔ کوئی لحن داؤدی میں کلام پاک کی قرأت کرتی، کوئی سریلی آواز میں نعتیں نظمیں وغیرہ سناتی کوئی شعر و نظم میں اپنے خیالات بیان کرتی، کوئی تقریر کرتی، کوئی مضمون پڑھتی، کوئی لطیفے سناتی، ان میں سعیدہ ذاکر بھی تھیں ذکیہ سعید انصاری بھی سعادت فاطمہ بھی سیدہ فرحت بھی اور ہماری ممی اور آپ کی ممی باجی بھی ذکیہ نیر بھی تھیں اور ان کی والدہ بھی۔ صرف جلسے ہی نہیں پک نک بھی ہوتی جامعہ میں سواری آچکی تھی اور بہت کم کرائے پر مل جاتی تھی کبھی قطب کبھی نظام الدین کبھی بختیار کاکی کے مزار، کبھی شہر میں پردہ باغ وغیرہ جایا جاتا۔ یہ جگہیں اس وقت جامعہ سے بہت دور تھیں۔ نہر کی سیر تو روز کا شوق تھا۔ جیسے گھر سے آنگن میں نکل آئے نہر کے کنارے دوڑنا، بندروں سے آنکھیں ملانا، لہروں سے کھیلنا، سرکنڈے کے پھولدار ڈنٹھل کاٹ کر گھر کے مٹی کے گلدانوں میں سجانا۔ کبھی کبھی کھانا پکا کر سب وہاں لے جاتے اور مل کر کھاتے۔ پک نک کا نام نہ تھا مگر اسپرٹ وہی تھی ہمارے جلسوں کی اور فنکشن کی جامعہ میں اور اوکھلے میں شہرت بڑھتی رہی اوکھلے میں ہم نے گاؤں کی زیادہ تر گنوار عورتوں سے میل جول بڑھایا۔ اگرچہ اسے سوشل سروس کا نام نہیں دیا جاتا تھا مگر کچھ عورتوں اور بچوں کو پڑھانا، ان کے غم اور خوشی میں شریک ہونا، بیماری اور جاپے میں مدد کرنا، اور بہنا پا جوڑنا کئی سال تک ان سے ہم سے بہت تعلقات رہے اور ہم مل جل کر ایک ہو گئے۔ اور بیگم بنی احمد نے تو شروع ہی سے اوکھلے کی عورتوں بچوں اور لڑکیوں کو کلام پاک کا جو درس دینا شروع کیا تو آخر دم تک یہ نیک کام انجام دیتی رہیں اور ہزاروں ہی لوگوں کو قرآن پاک خاص پانی پت کی اعلیٰ قرأت میں پڑھا ڈالا۔ خدا ان کی سعی مشکور کرے۔ یہ ان کا بہت

کارنامہ تھا۔

۴۷ء کے بعد جامعہ میں مصیبت زدہ بچے اور ریفیوجی عورتیں ٹریننگ کالج میں آئیں اور ان کے ساتھ محبت اور خلوص کا سلوک اور اپنائیت کا برتاؤ کیا مگر وہ تو بہت بعد کی بات ہے۔ اب جامعہ میں جو جلسے، فنکشن، ڈرامے، مشاعرے وغیرہ ہوتے اس میں خواتین جامعہ برابر شریک ہوتیں۔ ایک طرف خواتین اور لڑکے، دوسری طرف مرد حضرات اور سامنے بچوں کا فنکشن، ڈراما یا جلسہ۔ سیرت کے جلسوں میں محمد علی ہال میں بھی خواتین شرکت کرنے لگیں۔ یہاں ہم نے جناب مولانا عبیداللہؒ سندھی کے بصیرت افروز وعظ بھی سنے۔ پھر جب میلہ شروع ہوا تو واہ ۔۔۔ سارے شہر میں اس کی دھوم دھام تھی تو جامعہ کی زندگی میں اور جامعہ کی خواتین کی زندگی میں ایک بہار آ جاتی تھی۔ یہ ہفتہ بچوں، مردوں، عورتوں اور ان کے مہمانوں کے لیے خاص تہوار تھا۔ عید کا سا جشن اور خوشی ہوتی ہر گھر میں۔ ہماری انجمن بھی اب بڑھ رہی تھی۔ کبھی کبھی ٹوٹ جاتی تو دوسری بن جاتی سہیلی سبھا سکھی سبھا کے نام سے۔ اب نئی آنے والیاں بھی اس میں شریک تھیں، بیگم آغا اشرف فیروزہ خاتون مشیر فاطمہ وغیرہ مشیر فاطمہ تو جامعہ کی کارکن بھی تھیں اور جب تک جامعہ میں رہیں خاموشی خلوص اور محبت سے سارے جامعہ والوں اور ان کے گھر والوں کی ایسی خدمت کی جس کی مثال نہیں ملے گی۔ ہماری اختر جمال تو جلد ہی خدا کو پیاری ہو گئیں مگر ان کی بیٹی جمال فاطمہ ان کا بدل تھی اور اختر صاحب تو ہمارے سب سے بڑے مشیر اور مداح تھے ان جلسوں کے علاوہ گھروں میں محفل میلاد، مجالس اور چھوٹی موٹی تقریبیں بھی ہوتیں اور "خاندان" کے سب افراد شامل ہوتے۔ شادیاں تو بہت کم ہوتیں کہ جوان جامعہ والوں کی بیٹیاں اتنی بڑی نہ تھیں اور جو ہوتیں وہ اپنے اپنے وطن میں مگر سادگی اور شرافت کے ساتھ۔ ظاہر ہے نمود و نمائش اور اسراف کا سوال ہی نہ تھا اور نہ ان رہنمایان قوم کا یہ اصول کہ گھر پھونک تماشا دیکھیں۔ شام کو ہم لوگ ٹولیاں بنا کر ٹہلنے جاتے کبھی ٹینک کی طرف کبھی کسی اور طرف۔

اس گرم ریتیلی اور بڑھابڑ سڑک کا نام ٹھنڈی سڑک رکھا گیا تھا۔

میں نے جان بوجھ کر پہلے اس حسرت اور اُمنگ کا کاکے ولے اور شوق کا ذکر کیا جو اس کٹھن ترین دور میں جامعہ کی خواتین کی زندگی میں نظر آتا تھا۔ اور اب ذرا ہلکی سی بہت ہلکی سی جھلک اس کٹھن زندگی کی جس میں انھوں نے زندگی کے بہترین سال بسر کیے۔

قرول باغ تک جو تھا سو تھا۔ اوکھلے میں زندگی کی وہ معمولی آسانیاں بھی نہ تھیں جو ضروریات میں شمار ہوتی ہیں۔ نل کا تو ذکر ہی نہیں میٹھا پانی بھی کنوئیں یا ہنڈ پمپ میں نہ نکلتا تھا اتفاق سے میرے گھر کے پچھواڑے کے کچے کنوئیں میں تھوڑا میٹھا پانی نکل آیا تو برسوں سارے اوکھلے کی غریب عورتیں اور بہت سے بہشتیوں نے اس میں سے پانی بھرا ورنہ ایک مشک پینے کے پانی کی دور نہر سے بہت پیسے دے کر منگوانا پڑتی تھی بارہ سال تک اوکھلے میں بجلی نہیں تھی۔ اس زمانے میں جب چاروں طرف صرف گرم ریت اور تپتی پہاڑیاں تھیں۔ بارہ سال! رات کو روشنی کے لیے موم بتی، تیل کی ڈبیا، چھوٹے چھوٹے لیمپ اور رحمٰن لال ٹین جو جس کو مل جاتا فراہم کر لیتے۔ مگر جنگ چھڑی تو مٹی کا تیل عنقا — یا بقدر اشک بلبل — اس زمانے میں اکثر زیدی صاحب یا سیدین صاحب رام پور سے آتے تو موٹر کی ڈگی میں تیل کا کنستر رکھ لاتے جو ہم پڑوسیں بانٹ لیتیں اور ان گھروں میں روشنی ہو جاتی جس سے پورے ہندوستان میں علم وایمان کی روشنی بکھیری جارہی تھی۔ اور ہم جیسے رات کو لکھنے پڑھنے والوں کو ذرا سی آسانی مل جاتی۔ مگر رات — اف خدایا — رات کیا آتی تھی ایک سر پر بلا آئی تھی — مچھروں کے یورش کے ساتھ گرمی کی شدت اور ساتھ ہی ٹینک کی وہ جان لیوا بدبو جو برسوں مشام جان کو معطر کرتی رہی۔ کوئی خوشبو اور عطر اس کا توڑ نہ تھا۔ خدا جانے ٹینک والوں کو کیا کد تھی کہ ادھر بستر پر لیٹے اور ادھر انھوں نے یہ عطر کے کنستر کھولے۔ شکر کیجیے کہ آپ کے زمانے میں یہ عذاب ختم ہو گیا۔ میں سمجھتی ہوں یہ سب سے بڑی تکلیف تھی جو ہم نے

مدتوں اٹھائی۔ گیس اور مٹی کے تیل کے چولہے کا کیا ذکر، یہی شکر تھا کہ لکڑی سستی تھی اور کوئلہ مل جاتا تھا، اور کھانا پک سکتا تھا۔ میاں بچوں کو کھانا کپڑا فراہم کرنا ہندوستانی عورت کا فرض ٹھہرا۔ اور ان خاصے خوش حال گھرانے کی خواتین نے کس کس طرح اس ہفت خواں کو سر کیا یہ بیان کرنے کی نہیں دیکھنے کی چیز تھی۔ جب تک ماسٹر عبدالحیٔ رہے جانے کیسے کہاں کہاں سے گیہوں اور شکر فراہم کرتے جو حصہ دار گھروں میں بھی بٹ جاتی۔ ایک دفعہ کی بات ہے ہمارے محترم استاد کیلاٹ صاحب جو جامعہ کے مخلص اور نہایت قابل استاد تھے، اکیلے تھے اور ان کو ہمیشہ یہ غلط فہمی ہو جاتی تھی کہ ماسٹر صاحب نے ذاکر صاحب یا عابد صاحب یا مجیب صاحب یا کسی اور کو ان سے زیادہ شکر دیدی۔ بچارے کافی پلنے والے اور کڑوی کافی ۔۔۔ ان کو بہکا دیتی تھی۔ جب گھر میں کھانا پکانا محال ہو جاتا تو مطبخ سلامت تھا۔ کوڑیوں کے مول اور قرض کھانا ملتا تھا۔ ارہر یا ماش کی پتلی دال اور نسوت شوربے والا سالن نہایت نفیس چپاتیوں اور خمیری کے ساتھ نوش جاں کیا جاتا اور ریفلین مانئے بہت مزا دیتا۔ سال میں ایک مرتبہ بچے مطبخ کو سنبھالتے کھانا پکاتے اور بہت سی آپا جانوں کو بھی مدعو کر لیتے۔ ان دعوتوں کا مزا آج بھی یاد ہے۔ کبھی دو چار دوست اپنے گھر سے پکا لاتے اور مل کر کھاتے۔ ایک کی جگہ چار کھانے ہو جاتے۔ بیگم ذاکر کی ماش کی دال، سعیدہ کا مرغ کا زردہ، الا مسز مجیب کی مسلم ران (جس کو عابد صاحب چھیڑنے کو ران مسلم کہتے) اور میرا پانی پت کا سیدھا سادا حلوا اور شامی کباب ۔۔۔ آہ! کیا مزا آتا تھا ان دعوتوں میں! پیٹ کا کتا کوئی نہ تھا اور چند ٹکوں میں مزے کی ہنڈیا پکانے کا گر تو ان حالات ہی میں آتا ہے نا! بچے تو خیر اکثر میکے یا سسرال میں ہوتے۔ سال دو سال میں جوڑا دل یا گرمی کا لباس بھی وہیں کسی طرح بنا لیا جاتا، یا جہیز وغیرہ کے کپڑے اب تک سلامت تھے ان کو رنگ کر یا بدل کر نیا کر لیا جاتا تھا۔ دل تو بچوں کے لیے دکھتا تھا مگر ماں کا دل دکھے بچے سفید کھدر کی اچکن اور

ٹوپی میں اتنے پیارے لگتے کہ ماں بہنیں قربان ہو ہو جاتیں۔ شاید کپڑوں کے معاملے میں عورتوں کو حسرت ہوتی ہو کہ جو کپڑا آج دو سو روپے گز ملتا ہے وہ دو روپے گز ملتا تھا مگر خریدا نہ جاسکتا تھا۔ اور پھر ایک زمانہ وہ آیا کہ راشن کا کپڑا جامعہ کی عورتوں کی وردی بن گیا۔ بھاری دھاری دار پاپلین اور موٹے ڈورئیے اور باریک سفید ململ کے دوپٹے بیگم مجیب اور بیگم ذاکر تو خیر کپڑوں کے معاملے میں بہت نفاست پسند اور نازک مزاج تھیں مگر باقی تقریباً سبھی خواتین وہی کپڑا پہننے لگیں۔ صرف مجبوری کو نہیں شوق میں بھی۔ حبیب احمد کی بیوی ہو یا محمد سلیم کی، صالحہ عابد حسین اور ان کی لڑکیاں ہوں یا نور فاطمہ یا اختر صاحب کی بیٹی سعید انصاری کی بیگم ہو یا سعد انصاری کی بیوی بیٹی، فیروزہ ہوں یا کوئی اور سبھی بڑی شان اور ادا سے اس تین چار آنے گز کے کپڑے کو پہنتی تھیں اور ذرا احساس کمتری نہ ہوتا تھا۔ اور جب صدیقہ قدوائی اس کپڑے میں نظر آئیں تو انقلاب زندہ باد کے نعرے لگانے کو جی چاہا۔ ان کا خوبصورت وجود اس میں اور نکھر آتا تھا۔

گھروں میں فرنیچر اور قالین نہ تھے تو کیا ہوا بانوں کی مونڈھیاں، لکڑی کی چوکیاں اور سرکنڈوں کے مونڈھے تو تھے جن پر حسین دست کاری کئے کشن اور میز پوش اور تخت پوش بچھے بہار دکھاتے تھے۔ ذاکر صاحب اور مجیب صاحب کے ہاں بڑے بڑے باغ تھے تو ہم جیسے غریبوں نے بھی گملوں اور صحن میں پودے پھول اور گلاب لگا کر دل خوش کر لیے تھے۔ گلاب اس ریتیلی زمین میں کٹوروں کی طرح نکلتے اور بہار دکھاتے تھے اور ہاں باہر کی زمین پر کیکر لیمو اور نیم کے سائے نظر آتے تھے گل مہر کے درخت تو خیر ذاکر صاحب نے پوری سڑک پر لگوا دیئے تھے۔ بیگم ذاکر بیگم نبی احمد وغیرہ جو جانور پالتی تھیں کون جانتا ہے کہ اس میں کتنا شوق تھا اور کتنی ضرورتیں پوری ہوتی تھیں، بیگم عابد ریڈیو پر بولتی تھیں تو کیا صرف تقریر و تحریر کا شوق تھا یا اس کے پیچھے وہ پندرہ روپے کا خطیر معاوضہ بھی ہوتا تھا جس سے پندرہ ضرورتیں پوری ہو سکتی تھیں۔ خواتین

جو کپڑے اپنے یا دوسروں کے سیلتی تھیں نہ کیوں؟ — جتنی سلائی آج کل ایک جوڑے کی دی جاتی ہے اتنے میں تو کئی جوڑے تیار ہو جاتے تھے۔ بعض گھروں میں مرغیاں انڈوں کی ضرورت بھی پوری کرتی تھیں اور گھر کے خرچ میں بھی مدد دیتی تھیں اور بکری کا دودھ بھی اکثر گائے بھینس کے دودھ کا بدل بن جاتا تھا۔ کس کس چیز کا ذکر کروں۔ اب یاد بھی کیا رہ گیا ہے مگر یہ یاد ہے کہ بارہ سولہ گھنٹے کی مشقت وہ خوش دلی سے کرتی تھیں۔ میں یہ دعویٰ نہیں کر رہی کہ خواتین جامعہ بے مثال تھیں ان میں کمزوریاں نہ تھیں کیا جھگڑے قصے نہ ہوتے تھے یا تنگی اور تکلیف نہ ہوتی تھیں مگر یہ گھر یلو باتیں تھیں ان کا رونا رویا نہ جاتا تھا نہ ہر ایک سے اس کی شکایت ہوتی تھی۔

کس کس کا ذکر کروں۔ پٹھانی بھابی جو سخت پردے اور قدامت پسند گھوٹے سے قصبے باسی ہوتے ہوئے اپنی خوش کلامی لطافت بیان اور حسن وذہانت کی وجہ سے ذاکر صاحب کی شریک حیات ہونے کے شایان شان لگتی تھیں۔ بھابی آصفہ جن پر اودھ کی تہذیب کی دل کش چھاپ تھی۔ شوہر سے بے پناہ عشق تھا خدا پرستی اور عبادت کی مورتی تھیں، ان کا دھیما دھیما نرم لہجہ معصوم باتیں اور مخلص دوستی کی یاد تو ابھی تازہ ہے۔ مس فلپس بورن "سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے" جو جامعہ کے لیے زندہ رہیں اور جامعہ کے لیے مریں۔ اور مرتے وقت اسلام قبول کر لیا تو بعض مردوں نے ان کی نماز جنازہ پڑھنے پر اعتراض کیا لیکن جامعہ کی خواتین نے ان کو اپنے ہاتھ سے نہلا دھلا کر آخری سفر کے لیے تیار کیا اور ان کے لیے یوں روئیں جیسے سگی بہن کے لیے۔ بیگم شفیق تو شاید کچھ لوگوں کو اب بھی یاد ہوں گی۔ زمیندار گھرانے کی رئیس زادی جو جامعہ میں آکر مزدور شفیق کی دست راست بن گئیں اور جامعہ کی عورتوں میں یوں گھل مل گئیں جیسے ہمیشہ سے ان میں رہتی سہتی آئی ہوں اور پھر سنٹر چلائے تعلیم بالغاں کے کام سنبھالے راجیہ سبھا کی ممبر بنیں اور جلد ہی اپنے شوہر سے جا ملیں۔

عبدالواحد سندھی کی بیوی نور فاطمہ پندرہ سال کی علی گڑھ سے بیاہ کر آئیں جامعہ طبیہ سے طبیبہ کی ڈگری لی مگر ۱۹۴۷ء تک جامعہ کے بچوں کی خدمت کی اور پڑھایا بھی اور اب بھی کراچی کے ایک اسکول میں بچوں کو پڑھا رہی ہیں اور بیمار شوہر کی خدمت الگ کرتی ہیں بچوں کے بورڈنگ ہاؤس کی پہلی وارڈن مسز محمد اشرف جنھوں نے کئی برس اس خدمت کو بے غرضی سے انجام دیا، مجھے محمد سلیم، حبیب احمد کی بیویاں بھی یاد آتی ہیں جن میں ہم کبھی طبقاتی فرق نہیں رہا اور جو ہم میں سے ایک رہیں۔ بیگم نبی احمد جن کے نہ ہونے سے سچی اسلامی سوشل سروس کا نقصان ہو گیا۔ اور اب قدسیہ زیدی کی یاد آرہی ہے کہ جو رام پور کی چیف منسٹر کی بیوی تھیں، جامعہ کی کچھ نہ تھیں مگر جامعہ کی محسن تھیں اپنے شوہر کے ساتھ بلکہ ان سے بڑھ کر ذاکر صاحب کا ہاتھ بٹاتیں اور مدد کرتیں۔ جامعہ میں بجلی انہی کی دونوں کی کوششوں سے آئی۔ جامعہ جوبلی میں عورتوں کا جو بڑا جلسہ ہوا جس میں دلی کی سات سو کے قریب خواتین شریک ہوئی تھیں اور جس میں کوئی مدد دینے سے ذاکر صاحب نے انکار کر دیا تھا کہ آپ لوگ خود کریں، جس کی صدارت بیگم محمد علی نے کی تھی۔ اس کی فرشیں بچھانے اور جھاڑو دینے تک کے کام میں قدسیہ نے ہاتھ بٹایا تھا۔ اس جلسے کی کامیابی کی دور دور تک شہرت ہوئی اور شیخ الجامعہ جیسا محتسب بھی تعریف کرنے پر مجبور رہا۔

جامعہ کی خواتین ہی نے لڑکیوں کی تعلیم کی ابتدا کی۔ شوہروں کو تو فکر ہی نہ تھی ساری دنیا کو علم پڑھانے لکھانے والے گھر سے بے خبر تھے۔ کسی ماں نے پرائیوٹ ماسٹر رکھے، پرائیویٹ امتحان دلائے، کچھ نے چپکے چپکے ابتدائی سے ثانوی میں لڑکیوں کو داخل کر دیا اور لوگوں کو تب پتہ چلا جب ان جیالی لڑکیوں نے میٹرک پاس کر لیا یا می جیسی لڑکیوں نے بی۔ اے کر لیا۔ مجیب صاحب تو لڑکیوں کی الگ تعلیم کے سخت مخالف تھے چنانچہ اسکول نہ کھلنے دیا۔

۱۹۴۷ء میں جامعہ کی عورتوں نے مردوں کے ساتھ جس بہادری اور

(باقی صفحہ ۴۴ پر)